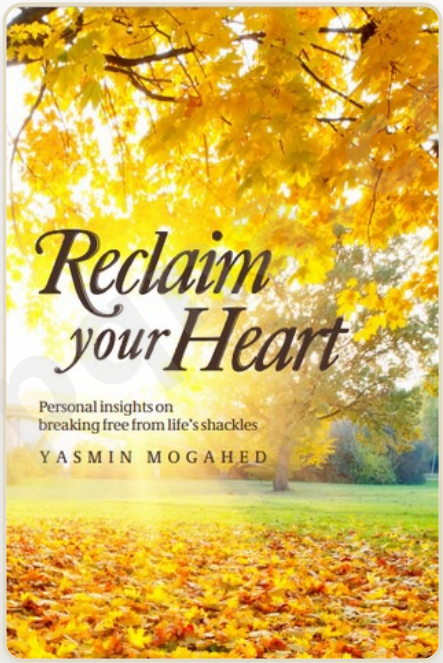
اپنے دل کو واپس حاصل کرو

Reclaim Your Heart

زندگی کی زنجیروں اور فریب کے بندھنوں سے دل کی آزادی کے ذاتی احوال و روحانی بصیرتیں



مصنفہ: یاسمین مجاہد

By: Yasmin Mogahed

اردو ترجمہ: حذیفہ

Urdu Translation by: Huzaifa

Official Urdu Edition • topqna.com

اپنے دل کو واپس حاصل کرو

Reclaim Your Heart

زندگی کی زنجیروں سے رہائی اور دل کو رب کی طرف لوٹانے کا رہنما سفر

مصنفہ: یاسمین مجاہد (Yasmin Mogahed)

مترجم: حذیفہ (Huzaifa)

FB PUBLISHING • SAN CLEMENTE

Digital Urdu Edition • topqna.com

topqna.com

جملہ حقوق بحقِ مصنفہ وپبلشر محفوظ ہیں

Copyright © 2012 by Yasmin Mogahed

جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ہیں۔ اس کتاب کا کوئی بھی حصہ پبلشر یا مصنفہ کی پیشگی تحریری اجازت کے بغیر کسی بھی شکل میں الیکٹرانک، مکینیکل، فوٹو کاپی یا ریکارڈنگ کے ذریعے دوبارہ شائع یا محفوظ نہیں کیا جا سکتا، ماسوائے تنقیدی مضامین یا تبصروں میں مختصر اقتباسات کے۔

اصل اشاعت: امریکہ (United States of America)

پبلشر: FB Publishing, 645 Camino De Los Mares, Suite 108-276, San Clemente, CA 92673

ویب سائٹ: www.fbpublishinghouse.com

بین الاقوامی معیاری کتابی نمبر (ISBN): 978-0-9857512-0-3

اردو ترجمہ: حذیفہ (Huzaifa)

واٹر مارک و ڈیجیٹل سرپرستی: topqna.com

topqna.com

انتساب

یہ کتاب مکمل طور پر اس پاک ذات کے نام وقف ہے جس نے میری پرورش اس وقت سے فرمائی جب میں اپنی ماں کے پیٹ میں بھی نہ تھی۔ یہ کتاب اس ربِ کریم کے نام معنون ہے جس نے مجھے علم سے نوازا، میرے دل میں الہام بکھیرا، اور زندگی بھر میری رہنمائی فرمائی۔ میں اپنی اس حقیر کاوش کو بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتی ہوں، اور دست بدعا ہوں کہ میری تمام تر کمزوریوں کے باوجود وہ اسے شرفِ قبولیت بخشے؛ نیز اپنے اہل و عیال کے نام جنہوں نے اس پورے سفر میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔

topqna.com

مقدمہ / تعارف

INTRODUCTION

'اپنے دل کی بازیابی' محض خود اصلاحی (سیلف ہیلپ) کی کوئی عام کتاب نہیں ہے۔ یہ اس دنیوی زندگی کے بحرِ بے کراں میں اور اس سے نکلتے ہوئے دل کے روحانی سفر کی ایک رہنما کتاب (دستور العمل) ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو یہ سکھاتی ہے کہ اپنے دل کو اس بحر کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے سے کیسے بچایا جائے، اور اگر وہ ڈوب جائے تو پھر کیا کرنا چاہیے۔ یہ کتاب مغفرت و نجات کی ہے، امید کی ہے، اور تجدیدِ حیات کی ہے۔ ہر دل شفا پا سکتا ہے، اور ہر گھڑی اس لیے تخلیق کی گئی ہے کہ وہ ہمیں اس انقلابی اور زندگی بدل دینے والی بازگشت کے قریب لا سکے۔ 'اپنے دل کی بازیابی' اس لمحے کو پانے کا نام ہے جب سب کچھ تھم جاتا ہے اور اچانک منظر بدل جاتا ہے۔ یہ اپنی ذات کی بیداری کو دریافت کرنے اور پھر اپنے اس وجود کی طرف لوٹ آنے کی داستان ہے جو پہلے سے کہیں زیادہ بہتر، سچا اور آزاد ہو۔

topqna.com

حالیہ تحریریں اور قارئین کے تاثرات و ستائش

RECENT POSTS AND PRAISE

ایک سال قبل میرے منگیتر/شوہر نے مجھ سے تعلق ختم کرنے کا فیصلہ کیا، جس نے مجھے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں شدید الجھن، رنج، اور صدمے کا شکار تھی—ہر وہ دکھ جس کا آپ تصور کر سکتے ہیں مجھ پر بیت گیا۔ لیکن الحمد للہ، اسی صدمے نے مجھے آپ کی تحریروں تک پہنچا دیا۔ گزرا ہوا یہ سال انتہائی جذباتی اور کٹھن رہا، مگر اس نے مجھے اپنے ٹوٹے دل کو سنبھالنے اور جوڑنے کا ایک بہترین سبق دیا۔ میں نے جانا کہ دل میں بسنے کا حق صرف اور صرف اللہ کا ہے، اور باقی سب کچھ ایک تحفہ اور نعمت ہے جس کی جگہ ہاتھ میں ہے (دل میں نہیں)؛ خواہ وہ حلال چیزیں ہی کیوں نہ ہوں۔ آپ کی تحریروں نے میری اتنی رہنمائی کی ہے کہ بیان کے لیے الفاظ ناکافی ہیں۔ ابھی تین ہفتے پہلے میرے والد صاحب، اللہ یرحمہ (اللہ ان پر رحم فرمائے)، اچانک انتقال فرما گئے، جس سے میرا پورا خاندان اور برادری گہرے صدمے میں ڈوب گئی۔ مگر اس صدمے میں میرا پہلا خیال یہی تھا: 'اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ'—ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے؛ میرے والد صاحب ان شاء اللہ اپنے اصل گھر لوٹ گئے۔ غم میں آپے سے باہر ہونے کے بجائے، میں نے اپنے دل کو اللہ کا شکر گزار پایا کہ اس نے انہیں میرا والد بنایا اور مجھے اتنے عرصے تک ان کا سایہ نصیب فرمایا۔ حالات جیسے بھی ہوں، اللہ ہمیشہ ہمارے حق میں بہترین فیصلہ ہی فرماتا ہے، اس لیے مجھے یقین ہے کہ ان کے جانے کا یہی بہترین وقت تھا۔ میں تہہِ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں، کیونکہ اگر میں نے آپ کی تحریروں سے سیکھا نہ ہوتا اور ان پر غور نہ کیا ہوتا، تو مجھے نہیں لگتا کہ میں آج وہ انسان ہوتی جو دنیا میں اپنے سب سے محبوب شخص کی جدائی کو اس طرح سہہ سکتی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ کسی ایک خاص تحریر نے مجھ پر یہ اثر چھوڑا، بلکہ یہ آپ کے تمام مضامین کا مجموعی فیضان تھا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بے پایاں اجر سے نوازے، آپ کے قلب کو مسلسل الہام بخشے، اور آپ کو اس بابرکت کام کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ آپ کے پیاروں کو برکت اور حفاظت میں رکھے۔ برائے مہربانی میرے والد صاحب کے لیے دعائے مغفرت فرمائیے گا۔

— آلا

میری زندگی کو یکسر بدل دینے پر میں تہہِ دل سے آپ کی شکر گزار ہوں۔ اللہ آپ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے،پیاری بہن ! میں اپنی زندگی کے ایک انتہائی تاریک اور تکلیف دہ دور سے گزر رہی تھی، اندھیرا، شدید یاسیت (ڈپریشن)، اندرونی کھوکھلا پن اور منفی سوچیں مجھ پر چھائی ہوئی تھیں۔ پھر اچانک میری نظر آپ کے مضامین پر پڑی۔ اور الحمد للہ، اب میری روح روشن ہو چکی ہے ! آپ کا بہت بہت شکریہ، اور لکھنا جاری رکھیے کیونکہ اللہ عظیم نے آپ کو اس خاص خوبی و کمال سے نوازا ہے۔ اللہ وہ تمام دعائیں قبول فرمائے جو میں آپ کے حق میں کر رہی ہوں... درحقیقت میں بس یہی کہہ سکتی ہوں، کیونکہ شکریے کے لیے کوئی بھی لفظ کافی نہیں ہے !

— مریم آئی۔

آپ کے الفاظ نے میرے دل پر اتنی گہری ضرب لگائی کہ پڑھتے ہوئے مجھے رکنا پڑا اور گہرا سانس لینا پڑا۔ مجھے ہمیشہ اس بات پر فخر رہا تھا کہ میں سطحی یا مادہ پرست انسان نہیں ہوں، لیکن اس سب کے باوجود اپنی خوشی کے لیے میں ہمیشہ انہی لوگوں کے سہارے جیتی رہی جن سے میں محبت کرتی تھی۔ اور جب انہوں نے میرا دل توڑا یا مجھے چھوڑ دیا، تو میری پوری دنیا اور میرے قدموں تلے کی زمین لرز اٹھی۔ دل میں محبت پانے کی ایک مستقل پیاس رہتی ہے، اور میں محبت ہی سے خوشی اخذ کرتی ہوں۔ مگر یہ تسلیم کرنا ایک مسلسل کشمکش ہے کہ یہ حقیقی محبت بندوں سے نہیں بلکہ اللہ کے ساتھ تعلق سے حاصل ہونی چاہیے۔ میں ایک مثالیہ پسند اور ایثارپیشہ انسان ہوں، دوسروں کو خوشیاں بانٹنا مجھے مسرت بخشتا ہے؛ لیکن یہ سمجھنا اور یاد رکھنا بے حد دشوار ہوتا ہے کہ نہیں، انسانوں اور اس فانی زندگی سے وابستہ امیدیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ الحمد للہ، آپ کی تحریر پڑھنا خود کو آئینے میں بے کم و کاست دیکھنے کے مترادف تھا، ایک ایسا سچ جس کا سامنا کرنے کے لیے میں پہلے تیار نہ تھی... اس تحریر نے میری بے پناہ رہنمائی کی ہے۔ سچائی اور خلوص کا دامن تھامے رکھنے پر اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

— مہر

میں اس موقع پر آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ مجھے آپ کے مضامین سے بے پناہ عقیدت و محبت ہے۔ میں آٹھ سال کی عمر سے ہی کتابوں کی دلدادہ ہوں۔ میں نے کتب فروشوں کے ہاں خود اصلاحی (سیلف ہیلپ) کے سارے گوشے چھان مارے ہیں؛ میں رومی، غزالی، اقبال اور روح سے کلام کرنے والے بے شمار عظیم مصنفین کے کلام و تحریروں کی دلدادہ ہوں۔ میں یہ بات آپ کو کیوں بتا رہی ہوں؟ اس لیے کہ اتنے باکمال مفکرین کی تحریریں پڑھنے کے بعد، مجھے اپنے دل اور روح کا قرار آپ کے کام میں ملا ہے۔ آپ بلاشبہ میری پسندیدہ ترین مصنفہ ہیں۔ جب بھی مجھے دلی تحریک اور روشنی کی ضرورت ہوتی ہے، میں آپ کے مضامین کی طرف لوٹتی ہوں۔ مزید یہ کہ مجھے ایک ایسے شخص سے شدید محبت ہو گئی تھی جسے میں اپنا ہم سفر اور روحانی ساتھی سمجھتی تھی، اور اس محبت نے مجھے اس سے بے انتہا وابستہ کر دیا تھا۔ یہ صرف آپ کی تحریروں کی برکت ہے کہ اب میں اس ذاتِ برحق (اللہ) سے لو لگانا سیکھ رہی ہوں جو کبھی بچھڑتا نہیں، اور اس اٹوٹ رشتے کو تھام رہی ہوں جو کبھی ٹوٹتا نہیں! آپ نے مجھے سکھایا کہ حقیقی محبت کا اصل راز کیا ہے۔ مجھے آپ کی تحریروں سے گہرا لگاؤ ہے، آپ نے میری سوچوں کو نئی روح بخشی ہے۔ اور ہاں، میرا بھائی اور میری سہیلیاں بھی آپ کے کام کے دلدادہ ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر نعمت سے مالا مال فرمائے اور آپ کو ہمیشہ ایک ایسا وسیلہ بنائے رکھے جو ہم سب کے دلوں کو اللہ کی محبت کی طرف موڑ دے۔ ڈھیروں محبت، خلوص اور دعاؤں کے ساتھ!

— محسنہ، جنوبی افریقہ

کچھ ہی عرصہ پہلے مجھے اتفاقاً آپ کی ویب سائٹ اور ویڈیوز دیکھنے کا موقع ملا۔ اس سے ٹھیک پہلے میں اپنے دل اور روح کے لیے 'روحانی غذا' کی متلاشی تھی؛ ایسے الفاظ جو میرے زنگ آلود دل کو شفا بخش سکیں۔ تب میری نظر آپ کے بلاگ اور ویڈیوز پر پڑی۔ ماشاء اللہ، پیاری بہن! میرے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے بیان کر سکوں کہ آپ کی تحریروں نے میرے دل اور روح پر کیا سحر انگیز اثر چھوڑا ہے۔ آپ کا لکھا ہر لفظ میرے دل کو چھو جاتا ہے، میری خود پسندی اور نفسانی سرکشی کو پاش پاش کر دیتا ہے اور میری آنکھوں میں آنسو لے

آتا ہے۔ آپ کے اس بصیرت افروز کام اور اس کے ذریعے ملنے والی مسلسل یاد دہانیوں پر میں کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ آپ کو بلند ترین جنت الفردوس عطا فرمائے اور دنیا و آخرت میں بہترین اجر سے نوازے۔ تہہِ دل سے شکریہ، بے انتہا شکریہ !

— منیرہ، سنگاپور

توکل کرمان مجھے یاسمین مجاہد کی یاد دلاتی ہیں۔ اول الذکر بیرونی انقلاب کی شمع روشن کرتی ہیں اور ثانی الذکر باطنی و قلبی انقلاب برپا کرتی ہیں۔

— ایم اے

یاسمین ! میں آپ کو ذاتی طور پر نہیں جانتی اور نہ آپ مجھے جانتی ہیں، مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ میرے دل کے بے حد قریب ہیں ! آپ کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ میرے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے !

— نور

مجھے لگتا ہے کہ میں ایک منافقانہ زندگی بسر کر رہا تھا، جہاں زبان سے تو میں اللہ سے محبت کا دعویٰ کرتا تھا مگر میرے اعمال اس کی نفی کرتے تھے۔ میری زندگی میں اصل انقلاب اس وقت رونما ہوا جب میں نے آپ کے مضامین اور خطابات کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے محبت کی اصل روح اور حقیقی مفہوم کو پہچانا۔ الحمد للہ، اور اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے میری زندگی کا ہر بگاڑ درستگی میں بدل گیا اور سب کچھ سیدھی راہ پر آگیا.. !

— نذیر

ماشاء اللہ ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو دل کی گہرائیوں میں اتر جانے، اسے جھنجھوڑنے اور اسے دوبارہ اسی رخ پر دھڑکنے پر آمادہ کرنے کی بصیرت بخشی ہے جس پر اسے ہونا چاہیے تھا ! یاسمین مجاہد جیسی ہستیوں کو پیدا فرمانے پر اے اللہ، تیرا شکر ہے ! :)

– غازی اے

اللہ آپ پر سدا اپنی برکتیں اور رحمتیں نازل فرمائے اور آپ کی حفاظت فرمائے۔ اللہ آپ کو جنت کا مکین بنائے جہاں آپ ہمیشہ شاد و آباد رہیں۔ کبھی بھی اس اثر کو کم مت سمجھیے گا جو آپ کے الفاظ انسانی زندگیوں پر چھوڑتے ہیں۔ ان شاء اللہ، ہمارا رب آج رات آپ کو 'عین الرضا' (خوشنودی و رضا کی نگاہ) سے دیکھے! اگر دل کی گہرائی سے بھی گہرا کوئی مقام ہوتا تو میرے یہ جذبات وہیں سے برآمد ہوتے۔ میں سچے دل سے آپ کو بتانا چاہتا تھا کہ آپ مسلم معاشرے—بالخصوص نوجوان نسل—کے لیے کس قدر بیش بہا تحفہ اور سرچشمۂ ترغیب ہیں۔ شاید آپ کو اس بات کا مکمل احساس نہ ہو، مگر آپ کے بیان کردہ نکات ہمارے ان مسائل کے عین مطابق ہیں جن سے ہم اس دور میں نبرد آزما ہیں۔ آج کی اس دنیا میں جہاں ہر چیز پستی کی طرف جاتی دکھائی دیتی ہے، آپ محض ایک 'اچھی مصنفہ' یا 'بہترین خطیبہ' سے کہیں بڑھ کر ہیں؛ آپ امید کی نوید ہیں! یہ امید کہ دنیا میں اب بھی مخلص اور باکردار نفوس موجود ہیں۔ اس کے علاوہ شاید آپ کو خبر نہ ہو، مگر لوگ اکثر آپ کے بارے میں کہتے ہیں کہ آپ کے انداز اور گفتگو میں ایک ایسا دلی سکون ہے جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ میں ذاتی طور پر اسے سچائی کی طاقت گردانتا ہوں۔ جب کوئی اتنے سچے اور کھرے الفاظ ادا کرتا ہے تو دل بے اختیار اس پر لبیک کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آپ نے تاریک ترین لمحوں میں لاتعداد انسانوں کو سنبھلنے میں مدد دی ہے، اللہ آپ کو اس کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آپ نے بہت سے لوگوں کو ایسی نیکیوں پر آمادہ کیا جو وہ پہلے کبھی نہ کرتے تھے، اللہ آپ کو اس کا بھی بہترین صلہ بخشے۔ ان شاء اللہ آپ کی نیکیوں کا پلڑا یوں مسلسل وزنی ہوتا رہے گا جیسے دنیا کے امیروں کی دولت بڑھتی رہتی ہے۔ مگر فرق روزِ قیامت ظاہر ہوگا۔ ان شاء اللہ آپ اس روز ان دولت مندوں سے اربوں گنا زیادہ صاحبِ ثروت و بامراد ہوں گی، اور میری دعا ہے کہ میں اس کا گواہ بنوں۔ میری تمنا ہے کہ حوضِ کوثر پر سرورِ کونین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ مسکراہٹ اور محبت کے ساتھ آپ کا استقبال فرمائیں، کیونکہ آپ ان کی ایک ایسی امتی ہیں جس نے اس دنیا میں سچے دل سے ایک مثبت تبدیلی لانے کی جدوجہد کی، اور آپ نے فی الواقع ایک عظیم تبدیلی برپا کی ہے! مجھے معاف کیجیے گا اگر یہ الفاظ کچھ مبالغہ آمیز معلوم ہوں، مگر مجھے اپنی کمزوری کے بدترین لمحات میں آپ کی تحریروں ہی سے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا حوصلہ ملا۔ کاش میں آپ کے سائے میں پروان چڑھا ہوتا، کیونکہ مجھے

ایک ایسے ہی دوست کی ضرورت تھی جو پختہ ایمان رکھتا ہو۔ یہ خراجِ تحسین یہاں لندن میں موجود ان ہزاروں افراد کی طرف سے ہے جو آپ سے فیض یاب ہوئے ہیں۔ ان شاء اللہ، جزاکِ اللہ الف الف خیر۔ میرا خیال ہے مجھے اب اپنی بات ختم کرنی چاہیے ورنہ میں کہتا ہی چلا جاؤں گا۔ السلام علیکم!

— محمد اے

میں ایک سال بعد یہ مضمون دوبارہ پڑھ رہی ہوں اور سوچ رہی ہوں کہ درحقیقت یہی وہ تحریر تھی جس نے مجھے بدل کر رکھ دیا۔ میرا رجحان نہ تو اسلام کی طرف تھا اور نہ ہی میں دین پر باقاعدہ عمل پیرا تھی۔ میری زندگی اندھیروں میں غرق تھی، اور میں ایسے لوگوں میں گھری ہوئی تھی جنہوں نے مجھے گرا کر ایک ایسا انسان بنا دیا تھا جو مجھے کبھی نہیں بننا چاہیے تھا۔ یوں میں دنیا کی دلدل میں دھنستی چلی گئی۔ میں نے ایسے کام کیے جن پر مجھے ذرا بھی فخر نہیں ہے۔ میں مسلسل ناکام ہوتی گئی، ٹھوکریں کھاتی رہی اور پستی میں گرتی چلی گئی۔ میرا وجود بکھر رہا تھا اور میں خود اپنی نگاہوں میں اجنبی ہو چکی تھی؛ یہاں تک کہ ایک رات ایک ہولناک واقعہ پیش آیا اور اسی لمحے مجھے یہ احساس ہوا کہ اللہ تو ہمیشہ سے میرے قریب تھا، یہ تو میں تھی جو اس سے غافل تھی۔ اپنے خالق سے منہ موڑے ہوئے تھی۔ اس رات میں نے خود سے کہا کہ بس اب بہت ہو چکا، اور میں واپس اسلام کی آغوش میں لوٹ آئی۔ میں اپنے رب کی طرف پلٹ آئی۔ اس رات کے بعد میں نے اپنی زندگی کو بدلنے کا ایک نیا سفر شروع کیا۔ اس سفر میں اللہ کو اپنا راہنما اور ناخدا پا کر میں نے اپنی زندگی کا رخ مکمل طور پر موڑ دیا۔ آج مجھے حجاب کے بغیر اپنی گزری زندگی یاد تک نہیں آتی۔ آج مجھے وہ وقت یاد بھی نہیں جب میں نماز نہ پڑھتی تھی، روزانہ مسجد نہ جاتی تھی، یا روزانہ علمی و تربیتی حلقوں میں شریک نہ ہوتی تھی۔ یاسمین! یہ مضمون شائع کرنے اور ہر دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جانے پر میں آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ میں نے آپ کی بات پر کان دھرے؛ میں نے دنیا سے دل کی چابیاں چھین کر اپنے خالق کے حوالے کر دیں۔ آپ واقعی ایک بے حد متاثر کن خاتون ہیں اور میں آپ کو ایک رول ماڈل سمجھتی ہوں :) آپ کا بے حد، بے انتہا شکریہ!

— حمیرا

اللہ سبحانہ و تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس عطا فرمائے، آمین ! پیاری بہن یاسمین، میں بیان نہیں کر سکتی کہ آپ ہمارے لیے کتنی بڑی نعمت ہیں۔ آپ کی تحریروں کا میری زندگی میں شامل ہونا روز بروز میرے ایمان کو جلا بخشتا ہے، الحمد للہ، اور میری ان بے شمار سہیلیوں اور پیاروں کے لیے بھی ترغیب کا باعث بنتا ہے جن کے ساتھ میں اکثر آپ کی تحریریں بانٹتی ہوں ! اگر آپ نے کبھی یہ دعا مانگی تھی کہ اللہ آپ کو امت کی رہنمائی کا ایک ذریعہ بنائے، تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے واقعی آپ کی وہ دعا قبول فرما لی ہے ! :)

— حاجرہ ایم

topqna.com

فہرستِ مضامین

• لوگ ایک دوسرے کو چھوڑ کر کیوں چلے جاتے ہیں؟	Why Do People Have to Leave Each Other?
• لوگ بچھڑ جاتے ہیں، مگر کیا وہ لوٹتے بھی ہیں؟	People Leave, But Do They Return?
• اندرونی خلا کو پُر کرنا اور اصل گھر کی طرف واپسی	On Filling the Inner Hole and Coming Home
• برتن کو خالی کرنا	Emptying the Vessel
• تحفے کی محبت کی خاطر	For the Love of the Gift
• چھت پر میسر سکون	Peace on a Rooftop
• دنیا کا سمندر	The Ocean of Dunya
• اپنے دل کو واپس لے لو	Take Back Your Heart
• بدترین قید خانے سے فرار	Escaping the Worst Prison
• کیا یہ واقعی محبت ہے جو میں محسوس کر رہا ہوں؟	Is this Love that I'm Feeling?
• فضا میں محبت رچی بسی ہے	Love is in the Air
• محبت دراصل یہ ہے	This is Love
• حقیقی شے کی محبت میں گرفتار ہونا	Fall in Love with the Real Thing
• کامیاب ازدواجی زندگی: گمشدہ کڑی	A Successful Marriage: The Missing Link

toppqna.com

• طوفان میں واحد پناہ گاہ — The Only Shelter in the Storm

• جنت میں اپنا گھر دیکھنا: نصرتِ الٰہی کی طلب کے بیان میں — Seeing Your Home in Jennah: On Seeking Divine Help

• لوگوں کے دیے ہوئے زخم: مقابلہ کیسے کریں اور شفا کیسے پائیں — Hurt by Others: How to Cope and Heal

• زندگی کا خواب — The Dream of Life

• بند دروازے اور وہ سراب جو ہمیں اندھا کر دیتے ہیں — Closed Doors and the Illusions that Blind Us

• درد، نقصان اور اللہ کی طرف راستہ — Pain, Loss and the Path to God

• آزمائش پر مومن کا ردِ عمل — A Believer's Response to Hardship

• یہ دنیا: قید خانہ یا جنت؟ — This Life: A Prison or Paradise?

0

• نماز: زندگی کا فراموش کردہ مقصد — Salah: Life's Forgotten Purpose

• نماز اور بدترین قسم کی چوری — Salah and the Worst Kind of Theft

• ایک مقدس سرگوشی و مکالمہ — A Sacred Conversation

• تاریک ترین گھڑی اور طلوعِ فجر — The Darkest Hour and the Coming of the Dawn

• آج ہم نے ایک شخص کو سپردِ خاک کیا: موت پر ایک بصیرت افروز نظر — We Buried a Man Today: A Reflection on Death

• میری دعائیں قبول کیوں نہیں ہو رہیں؟ — Why Aren't My Prayers Being Answered?

• فیس بک: پوشیدہ خطرہ — Facebook: The Hidden Danger

• یہی تو ہے بیداری — This is Awakening

0

• خواتین کا اصل وقار و تمکین — The Empowerment of Women

A Letter to the Culture that Raised Me	• اس معاشرت کے نام ایک خط جس میں مَیں نے پرورش پائی
A Woman's Reflection on Leading Prayer	• امامت کے مسئلے پر ایک خاتون کے تاثرات
Manhood and The Facade of Being Hard	• مردانگی اور سختی کا کھوکھلا مکھوٹا

0

Drop the Prefix	• سابقے اور لاحقے ہٹا دو
Be Muslim, But Only in Moderation	• مسلمان بنو، مگر صرف نام نہاد اعتدال پسندی کے دائرے میں !
Unspeakable Tragedy and The Condition of our Ummah	• ناقابلِ بیان سانحہ اور ہماری امت کا حال
Today's Opening of the Red Sea: Reflections on Egypt	• آج کا شقِ بحرِ احمر: مصر کے حالات پر بصیرتیں

0

A Letter to You	• تمہارے نام ایک خط
I Grieve	• میرا غم (نوحہ)
Just My Thoughts	• محض میرے خیالات
A Reflection on Love	• محبت پر ایک گہری نظر
I Prayed for Peace Today	• آج میں نے امن و سلامتی کی دعا کی
On The Struggle of Life	• زندگی کی کشمکش کے عنوان سے
Stillness	• سکوت و سکون
Die Before Your Death	• اپنی موت سے پہلے مر جاؤ
Save me	• مجھے بچا لے
My Heart is an Open Book	• میرا دل ایک کھلی کتاب ہے
The Stab	• خنجر کی ضرب

topqna.com

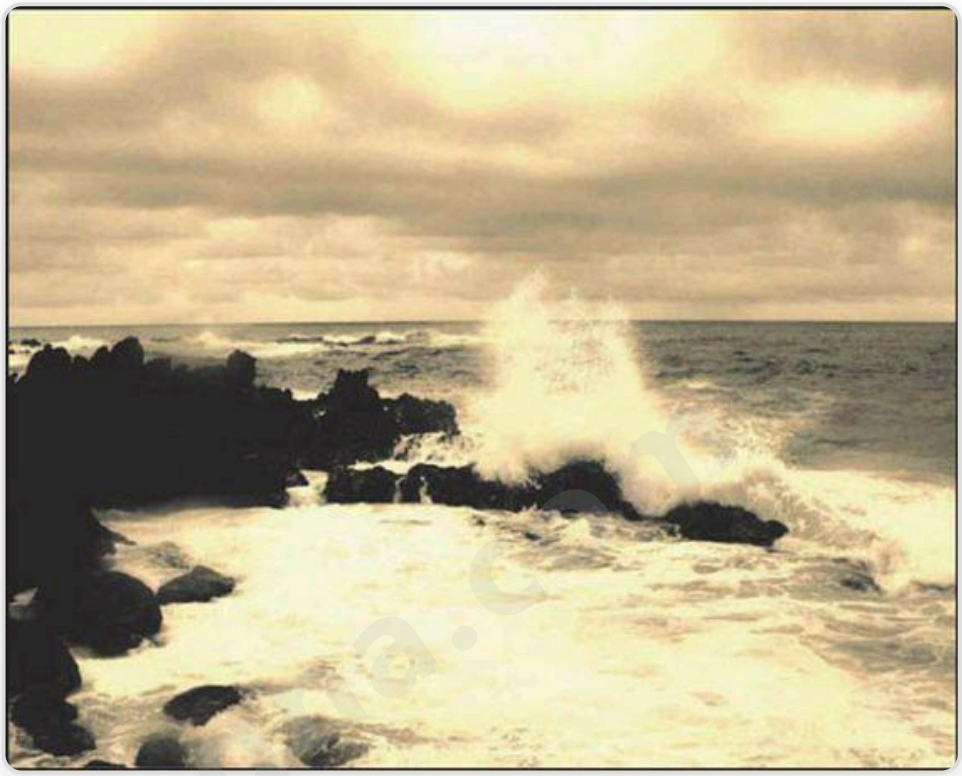
Niche	• طاقچہ (محراب)
Keep Walking	• قدم بڑھاتے رہو

topqna.com

SECTION 1 • حصہ اول

وابستگیاں اور قلبی تعلقات

ATTACHMENTS



topqia.com

لوگ ایک دوسرے کو کیوں چھوڑ جاتے ہیں؟

Why Do People Have to Leave Each Other?

سترہ برس کی عمر میں مَیں نے ایک خواب دیکھا۔ مَیں نے دیکھا کہ مَیں ایک مسجد میں بیٹھی ہوں اور ایک چھوٹی سی معصوم بچی میرے پاس ایک سوال پوچھنے آتی ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا: "لوگ ایک دوسرے کو کیوں چھوڑ جاتے ہیں؟" یوں تو یہ سوال نہایت ذاتی نوعیت کا تھا، لیکن میرے دل پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ آخر یہ سوال مجھ ہی سے کیوں پوچھا گیا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ مَیں حد سے زیادہ دل لگانے اور وابستہ ہو جانے والی انسان تھی۔

مَیں ایک ایسی وجود تھی جو لوگوں اور چیزوں سے بہت جلد قلبی وابستگی قائم کر لیتی تھی۔

بچپن ہی سے میری یہ فطرت اور مزاج بالکل واضح تھا۔ نرسری اسکول میں جب دوسرے بچے والدین کے جانے کے بعد جلد ہی سنبھل جاتے اور بہل جاتے تھے، مَیں خود پر قابو نہ پا سکتی تھی۔ میری آنکھوں سے بہنے والے آنسو ایک بار جاری ہو جاتے تو تھمنے کا نام نہ لیتے۔ جوں جوں مَیں بڑی ہوتی گئی، مَیں نے اپنے اردگرد موجود ہر شے سے دل لگانا اور وابستہ ہونا سیکھ لیا۔ پہلی جماعت ہی سے مجھے ایک گہرے اور جگری دوست کی شدید ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی، کسی بھی دوست سے ذرا سی ناچاقی یا دوری مجھے اندر سے توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیتی۔ مَیں کسی بھی چیز کو اپنے دل سے جدا نہیں کر پاتی تھی۔ لوگ، جگہیں، واقعات، پرانی تصویریں، گزرے ہوئے لمحات—حتیٰ کہ اپنے سوچے ہوئے نتائج تک میرے لیے شدید قلبی وابستگی کا مرکز بن جاتے تھے۔ اگر معاملات میری مرضی یا میرے تخیل کے مطابق طے نہ پاتے، تو مَیں اندر سے بالکل بکھر جاتی۔ میرے لیے مایوسی کوئی عام سا جذبہ نہ تھی، بلکہ ایک تباہ کن قیامت ہوا کرتی تھی۔ ایک بار دل ٹوٹ جاتا یا کسی سے مایوسی ہو جاتی، تو مَیں کبھی مکمل طور پر سنبھل نہ پاتی۔ مَیں کبھی بھول نہ پاتی تھی، اور وہ شکستہ دل کبھی جڑ نہ پاتا تھا۔ بالکل میز کے کونے پر رکھے ہوئے اس نازک شیشے کے گلدان کی مانند، جو جب ایک بار گر کر ٹوٹ جائے تو اس کے کرچیاں کبھی دوبارہ ویسی جڑ نہیں پاتیں۔

تاہم اصل خرابی اس گلدان میں نہ تھی، اور نہ ہی مسئلہ یہ تھا کہ گلدان بار بار کیوں ٹوٹ رہے تھے۔ اصل خرابی تو یہ تھی کہ مَیں خود ہی انہیں مسلسل میز کے کناروں پر لا کر رکھ رہی تھی۔ اپنی بے جا قلبی وابستگیوں کے سبب، مَیں اپنی تمام تر جذباتی ضروریات کی تسکین کے لیے اپنے رشتوں کی محتاج ہو چکی تھی۔ مَیں نے ان انسانی تعلقات کو یہ اختیار دے رکھا تھا کہ وہ میری خوشی یا غم کا فیصلہ کریں، میری تسکین یا میرے اندرونی خلا کا تعین کریں، اور میرے احساسِ تحفظ حتیٰ کہ میری اپنی خودی اور ذاتی قدر و قیمت کا معیار بن جائیں۔ چنانچہ، میز کے کنارے پر رکھے اس گلدان کی مانند جس کا گرنا طے تھا، مَیں نے اپنی اس محتاجی کے ذریعے خود کو مایوسی اور شکستگی کی نذر کر دیا۔ مَیں نے خود کو ٹوٹنے کے لیے پیش کر رکھا تھا۔ اور انجام کار میرے ہاتھ یہی آیا: ایک کے بعد ایک مایوسی، اور ایک کے بعد دوسرا صدمۂ شکستگی۔

مگر جن لوگوں نے مجھے توڑا، ان کا اس میں کوئی قصور نہ تھا، بالکل ویسے ہی جیسے گلدان ٹوٹنے کا الزام کششِ ثقل (gravity) کے سر نہیں تھوپا جا سکتا۔ جب ہم کسی نازک ٹہنی پر اپنا سارا بوجھ ڈال دیں اور وہ ٹوٹ جائے، تو ہم طبیعیات کے قوانین کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ وہ ٹہنی تو کبھی ہمارا بوجھ اٹھانے کے لیے بنائی ہی نہیں گئی تھی۔

ہمارا یہ قلبی بوجھ اٹھانا صرف اور صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہی کے شایانِ شان ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ رب العزت کا ارشادِ گرامی ہے: ﴿ فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴾ "پس جو کوئی طاغوت (باطل قوتوں) کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، تو یقیناً اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔" (سورۃ البقرۃ: 256) اس آیتِ مبارکہ میں ہمارے لیے ایک نہایت بنیادی اور فیصلہ کن سبق پوشیدہ ہے: کہ کائنات میں صرف ایک ہی سہارا ایسا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ صرف ایک ہی ذات ایسی ہے جس پر ہم اپنے تمام تر توکل، امیدوں اور انحصار کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ صرف ایک ہی تعلق ایسا ہے جو ہماری خودی اور قدر و قیمت کا حقیقی پیمانہ ہونا چاہیے، اور صرف ایک ہی سرچشمہ ایسا ہے جہاں سے ہمیں ابدی مسرت، دلی اطمینان اور حقیقی تحفظ حاصل ہو سکتا ہے۔ اور وہ واحد ذات صرف اور صرف اللہ جلّ جلالہ کی ہے۔

مگر المیہ یہ ہے کہ یہ دنیا انسان کو ان تمام چیزوں کی تلاش میں در در بھٹکاتی ہے۔ ہم میں سے بعض لوگ اپنے کیریئر اور ملازمت میں سکون ڈھونڈتے ہیں؛ بعض دولت کے انبار میں، اور بعض جاہ و منصب میں۔ اور کچھ لوگ، میری طرح، اسے اپنے انسانی رشتوں اور تعلقات میں تلاش کرتے ہیں۔ الزبتھ گلبرٹ نے اپنی معروف کتاب "ایٹ، پرے، لو" (Eat, Pray, Love) میں حقیقی خوشی کی اپنی اسی تگ و دو اور تلاش کا احوال بیان کیا ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ کس طرح وہ ایک تعلق سے دوسرے تعلق کی طرف بھٹکتی رہی، اور اس دلی سکون کی خاطر اس نے پوری دنیا کی خاک چھانی۔ اس نے وہ تشفی اور سکون اپنے رشتوں میں ڈھونڈا، مراقبے میں تلاش کیا، حتیٰ کہ لذیذ کھانوں میں کھوجا—مگر ہر جگہ ناکام و نامراد رہی۔

اور سچ تو یہ ہے کہ مَیں نے بھی اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اسی سراب میں گزار دیا: اپنے اندر کے اس گہرے خلا کو بھرنے کی کوشش میں۔ چنانچہ تعجب کی بات نہیں کہ میرے خواب میں اس ننھی بچی نے مجھ سے یہی سوال پوچھا تھا۔ وہ جدائی اور کھو جانے کا سوال تھا، وہ مایوسی اور فریب خوردگی کا سوال تھا۔ وہ کسی کے ہاتھوں دل کے ٹوٹ جانے اور امیدوں کے خاک میں مل جانے کا سوال تھا۔ وہ کسی شے کو بے تابی سے پانے کی کوشش میں خالی ہاتھ لوٹ آنے کا درد تھا۔ یہ بالکل ایسا تھا جیسے کوئی اپنے ننگے ہاتھوں سے کنکریٹ اور چٹان کو کھودنے کی کوشش کرے: نہ صرف یہ کہ اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا، بلکہ اس تگ و دو میں اس کی انگلیاں بھی لہولہان ہو کر ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہ حقیقت مَیں نے کسی کتاب کے مطالعے سے نہیں سیکھی تھی، نہ ہی کسی دانا حکیم کی زبانی سنی تھی، بلکہ مَیں نے اسے بار بار، مسلسل اور پیہم آزما کر اور زخم کھا کر جانا تھا۔

چنانچہ، حقیقت میں اس ننھی بچی کا سوال میرا ہی سوال تھا... جو مَیں دراصل اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی۔

بنیادی طور پر یہ سوال دنیا کی اصل حقیقت سے متعلق تھا—کہ یہ دنیا عارضی لمحوں اور ناپائیدار قلبی وابستگیوں کی آماجگاہ ہے۔ ایک ایسی جگہ جہاں لوگ آج آپ کے ساتھ ہیں اور کل بچھڑ جاتے ہیں یا موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ مگر یہ تلخ حقیقت ہمارے پورے وجود کو لہولہان کر دیتی ہے، کیونکہ یہ ہماری اصل فطرت کے بالکل برعکس ہے۔ ہم بحیثیتِ انسان اس طرح تخلیق کیے گئے ہیں کہ ہم اس چیز کی طلب رکھیں، اس سے محبت کریں اور اس کے لیے جدوجہد کریں جو کامل اور لافانی ہو۔ ہماری سرشت میں ابدیت

اور ہمیشگی کی جستجو رکھ دی گئی ہے۔ ہم یہ بقا اس لیے تلاش کرتے ہیں کہ ہم اس فانی دنیا کے لیے بنائے ہی نہیں گئے تھے۔ ہمارا پہلا اور حقیقی وطن تو جنت تھا: ایک ایسا خطہ جو ہر عیب سے پاک، مکمل اور لازوال ہے۔ چنانچہ اس دائمی اور پرسکون زندگی کی تڑپ ہمارے وجود اور جبلت کا لازمی حصہ ہے۔ سارا فتنہ اور خرابی تب جنم لیتی ہے جب ہم اس ابدی جنت کو اسی فانی دنیا میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم ڈھلتی عمر کو روکنے والی کریمیں اور کاسمیٹک سرجری کے سہارے تراشتے ہیں، تاکہ اس فانی حسن کو کسی طرح روک کر رکھ سکیں—اس دنیا کو ایک ایسی شے بنانے کی لاحاصل کوشش میں جو یہ نہ کبھی تھی اور نہ کبھی ہو سکتی ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ اگر ہم اس دنیا میں اپنا دل لگا کر جئیں گے، تو یہ دنیا ہمارے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی۔ اسی لیے اس دنیا کا ہر صدمہ روح کو تڑپا دیتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی تعریف ہی یہ ہے کہ یہ ناپائیدار اور ناقص ہے، جبکہ ہماری فطرت کی ہر پکار اس کے بالکل برعکس کامل اور ابدی شے کی متلاشی ہے۔ اللہ نے ہمارے باطن میں ایک ایسی تڑپ ودیعت فرمائی ہے جسے صرف وہی ذات سیراب کر سکتی ہے جو خود ابدی اور کامل ہے۔ فانی چیزوں میں دلی سکون تلاش کرنا گویا کسی ہولوگرام یا سراب کے پیچھے دوڑنا ہے۔ یہ ننگے ہاتھوں سے کنکریٹ کھودنے کے مترادف ہے۔ کسی ایسی شے کو جو اپنی اصل میں ناپائیدار ہے، دائمی اور ابدی بنانے کی کوشش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی آگ سے پانی کشید کرنے کی تمنا کرے۔ نتیجہ صرف یہی نکلے گا کہ آپ خود جل کر خاکستر ہو جائیں گے۔ صرف اسی وقت جب ہم اپنی امیدوں کا مرکز اس دنیا کو بنانا چھوڑ دیں گے، جب ہم دنیا کو وہ چیز بنانے سے باز آ جائیں گے جو یہ نہیں ہے—اور جسے کبھی جنت ہونا ہی نہیں تھا—تب ہی جا کر یہ فانی زندگی ہمارے دلوں کو توڑنا بند کرے گی۔

ہمیں یہ بھی دل کی گہرائی سے جان لینا چاہیے کہ اس کائنات میں کوئی بھی واقعہ بغیر کسی مقصد و حکمت کے رونما نہیں ہوتا۔ کچھ بھی نہیں۔ حتیٰ کہ شکستہ دل بھی نہیں، اور نہ ہی ہمارا یہ درد و کرب۔

یہ ٹوٹا ہوا دل اور یہ تکلیف درحقیقت ہمارے لیے درسِ عبرت اور غیبی نشانیاں ہیں۔ یہ خطرے کی گھنٹیاں ہیں جو متنبہ کرتی ہیں کہ کہیں کچھ غلط ہو رہا ہے۔ یہ ہمیں پکار کر کہتی ہیں کہ ہمیں خود میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے جلنے کا احساس اور درد ہمیں آگ سے اپنا ہاتھ فوراً پیچھے کھینچنے پر مجبور کرتا ہے، اسی

طرح یہ جذباتی اور قلبی درد ہمیں جھنجھوڑتا ہے کہ اب باطنی تبدیلی ناگزیر ہو چکی ہے۔ ہمیں اپنے دل کو ان فانی سہاروں سے الگ اور آزاد (detach) کرنا ہوگا۔ درد دراصل دنیا سے دل کو زبردستی جدا کرنے کا ایک قدرتی ذریعہ ہے۔ بالکل اس محبوب کی طرح جو آپ کو بار بار مسلسل دکھ پہنچائے، یہ دنیا جتنا زیادہ ہمیں رنجیدہ اور زخمی کرتی ہے، اتنا ہی لامحالہ ہمارا دل اس سے بیزار ہو کر کنارہ کش ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اتنا ہی ہم اس فانی دنیا کی محبت سے آزاد ہوتے جاتے ہیں۔

اور یہ درد ہماری غلط قلبی وابستگیوں کی نشاندہی کرنے والا قطب نما ہے۔ جس چیز پر ہماری آنکھیں روتی ہیں، جو شے ہمیں سب سے زیادہ دکھ اور کرب میں مبتلا کرتی ہے، دراصل وہیں ہماری جھوٹی اور باطل وابستگیاں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں جن سے ہم اس طرح دل لگا بیٹھتے ہیں جس طرح صرف اور صرف اللہ سے لگانا چاہیے تھا، چنانچہ وہی چیزیں اللہ کی راہ میں ہمارے لیے سب سے بڑی رکاوٹ اور حجاب بن جاتی ہیں۔ لیکن یہ درد خود ہی ان باطل وابستگیوں کے چہرے سے نقاب الٹ دیتا ہے۔ یہ کرب ہماری زندگی میں ایک ایسی بے چینی پیدا کرتا ہے جسے بدلنے کے لیے ہم تڑپ اٹھتے ہیں؛ اور اگر ہماری حالت میں کوئی ایسی بات ہے جو ہمیں ناپسند ہے، تو اسے بدلنے کا ایک الٰہی اور ربانی نسخہ موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمانِ عالیشان ہے: ﴿ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ﴾ "بے شک اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندرونی احوال کو تبدیل نہ کر لیں۔" (سورۃ الرعد: 11) برسوں تک مایوسیوں اور دل ٹوٹنے کے اسی چکر میں بار بار گرنے کے بعد، آخرکار مجھ پر ایک نہایت گہری اور چشم کشا حقیقت منکشف ہوئی۔ مَیں ہمیشہ یہ سمجھتی تھی کہ 'حبِ دنیا' (دنیا کی محبت) کا مطلب صرف مادی اشیاء اور مال و دولت سے دل لگانا ہے۔ اور چونکہ مجھے مادی مال و متاع سے کوئی خاص رغبت نہ تھی، مَیں تو انسانوں سے وابستہ تھی، مَیں گزری یادوں اور لمحوں سے جڑی تھی، مَیں لطیف جذبات و احساسات سے دل لگائے بیٹھی تھی، اس لیے مَیں گمان کرتی تھی کہ حبِ دنیا کی وعید کا مجھ پر تو اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ مگر جس حقیقت سے مَیں غافل تھی وہ یہ تھی کہ انسان، گزرے ہوئے لمحات، اور یہ فانی جذبات بھی تو اسی دنیا ہی کا حصہ ہیں! مَیں یہ نہ سمجھ سکی تھی کہ زندگی میں جس قدر درد اور کرب مَیں نے سہا تھا، اس کا سبب صرف اور صرف ایک ہی چیز تھی: یعنی دنیا اور اہلِ دنیا کی محبت!

جونہی مجھے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہوا، میری آنکھوں کے سامنے سے غفلت کا پردہ ہٹ گیا۔ مجھے صاف نظر آنے لگا کہ میری اصل بیماری کیا تھی۔ مَیں اس فانی دنیا سے ایک ایسی توقع باندھے بیٹھی تھی جو یہ دنیا سرے سے ہے ہی نہیں، اور نہ ہی اسے کبھی ایسا بنایا گیا تھا: یعنی سراپا کمال اور بے عیب و نقص! اور چونکہ مَیں طبعاً ایک آئیڈیل پرست (idealist) واقع ہوئی تھی، اس لیے مَیں اپنے پورے وجود کی تمام تر توانائیوں کے ساتھ اسے پرفیکٹ اور بے عیب بنانے کی جنگ لڑ رہی تھی۔ میری ضد تھی کہ اسے ہر لحاظ سے کامل ہونا چاہیے، اور جب تک یہ ویسی نہ بن جاتی مَیں رکنے والی نہ تھی۔ مَیں نے اس لاحاصل کوشش میں اپنا خون پسینہ اور آنسو بہا دیے: یعنی اس فانی دنیا کو جنت کا نمونہ بنانے کی دھن میں! اس کا مطلب یہ تھا کہ مَیں اپنے اردگرد کے انسانوں سے کامل ہونے کی توقع رکھتی تھی۔ اپنے رشتوں کے بے عیب ہونے کی آس لگائے بیٹھی تھی۔ اپنے قریبی لوگوں سے اور اس فانی زندگی سے حد سے زیادہ امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ توقعات... توقعات... اور بس بے جا توقعات! اور اگر دنیا میں بدبختی اور بے سکونی کا کوئی آزمودہ نسخہ ہے، تو وہ صرف اور صرف یہی ہے: مخلوق سے وابستہ کی گئی غیر حقیقی توقعات! مگر یہی میری سب سے مہلک غلطی تھی۔ میری غلطی امید رکھنے میں نہ تھی؛ کیونکہ بحیثیتِ انسان ہمیں کبھی ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ اصل خرابی اس جگہ میں تھی جہاں مَیں ان امیدوں اور توقعات کا بوجھ لاد رہی تھی۔ دن کے اختتام پر میری امیدیں اور توقعات ذاتِ باری تعالیٰ پر مرکوز نہ تھیں۔ میری امیدیں تو انسانوں، رشتوں اور ظاہری اسباب کے کھوکھلے سہاروں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ بالآخر، میری امید کا محور اللہ کے بجائے یہ فانی دنیا تھی۔

اور یوں مجھ پر ایک لرزہ خیز اور گہری سچائی آشکار ہوئی۔ قرآن کی ایک آیتِ مبارکہ میرے ذہن میں گونجنے لگی۔ یہ وہ آیت تھی جو مَیں نے پہلے بھی بارہا سن رکھی تھی، مگر زندگی میں پہلی بار مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ درحقیقت میرا ہی نقشہ کھینچ رہی ہے: ﴿ إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ ﴾ "بے شک جو لوگ ہم سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور دنیاوی زندگی پر راضی ہو گئے اور اسی پر مطمئن ہو بیٹھے، اور جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔" (سورۃ یونس: 7) یہ سوچ کر کہ مجھے سب کچھ اسی دنیا میں حاصل ہو جائے، درحقیقت میری امید اللہ سے ملاقات پر نہیں تھی۔ میری ساری آس تو اسی دنیا سے بندھی ہوئی تھی۔ مگر دنیا سے امید لگانے کا اصل مفہوم کیا ہے؟ اور اس وبال سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب آپ دوست بنائیں، تو اپنے دوستوں سے یہ امید نہ رکھیں کہ وہ آپ کے باطنی خلا کو

بھر دیں گے۔ جب آپ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوں، تو اپنے شریکِ حیات سے یہ توقع نہ رکھیں کہ وہ آپ کی ہر دلی ضرورت کو پورا کر دے گا۔ جب آپ کسی نیک مقصد یا تحریک کے لیے کام کریں، تو اپنی امیدوں کا دارومدار صرف وقتی نتائج پر نہ رکھیں۔ جب آپ کسی مصیبت اور تنگی میں گھر جائیں، تو اپنی ذات پر تکیہ نہ کریں۔ انسانوں کے آگے دستِ نگر نہ بنیں۔ صرف اور صرف اللہ پر بھروسا اور انحصار کریں۔

انسانوں سے ظاہری مدد اور تعاون ضرور طلب کریں—لیکن دل کی گہرائی سے یہ یقین رکھیں کہ نہ یہ لوگ (اور نہ ہی آپ کی اپنی ذات) آپ کو مصیبت سے نجات دلا سکتے ہیں۔ نجات اور کفالت کی قدرت صرف اور صرف اللہ ہی کے پاس ہے۔ انسان تو محض کارخانۂ قدرت کے اوزار اور اللہ کے پیدا کردہ ظاہری اسباب ہیں۔ وہ بذاتِ خود نہ حقیقی مددگار ہیں، نہ سہارا، اور نہ ہی کسی قسم کی نجات کے مالک۔ یہ سب اختیارات صرف خدائے واحد کے ہیں۔ انسان تو مل کر ایک مکھی کا پر بھی پیدا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے (جیسا کہ سورۃ الحج، آیت 73 میں فرمایا گیا: ﴿ لَن يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ ﴾)۔ چنانچہ، ظاہری طور پر انسانوں کے ساتھ معاملات کرتے ہوئے بھی، اپنے دل کا رخ ہمیشہ اللہ کی طرف موڑے رکھیں۔ اپنا چہرہ یکسو ہو کر صرف اسی کی طرف رکھیں، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیسی خوبصورتی سے فرمایا تھا: ﴿ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا ۖ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴾ "میں نے یکسو ہو کر اپنا رخ اس ذات کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔" (سورۃ الانعام: 79) مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام اس بلند ترین مقامِ توحید تک پہنچنے کے اپنے سفر کا تذکرہ کیسے فرماتے ہیں؟ وہ چاند، سورج اور چمکتے ستاروں پر غور کرتے ہیں اور جان لیتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی کامل نہیں ہے۔ یہ سب تو ڈوب جاتے ہیں، غروب ہو جاتے ہیں۔

وہ ہمیں تنہا چھوڑ کر مایوس کر دیتے ہیں۔

چنانچہ اسی مشاہدے نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی رہنمائی فرمائی کہ وہ سب سے رخ موڑ کر صرف اور صرف اللہ کے در پر یکسو ہو جائیں۔ ان کی پیروی کرتے ہوئے، ہمیں بھی اپنی تمام تر امیدیں، بھروسا، توکل اور انحصار صرف خدائے واحد کی ذات پر رکھنا ہوگا۔ اور اگر ہم نے ایسا کر لیا، تو ہم جان لیں گے کہ دل کا حقیقی امن اور دائمی سکون پانے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ تب ہی جا کر وہ بے چین اور لرزہ خیز جھولا (roller

coaster) ہمیشہ کے لیے تھم جائے گا جس نے ہماری زندگیوں کو تماشا بنا رکھا تھا۔ کیونکہ اگر ہماری باطنی کیفیت کسی ایسی شے کے سہارے قائم ہے جو اپنی ذات میں ناپائیدار اور متغیر ہے، تو ہماری اندرونی حالت بھی لازماً متذبذب اور بے قرار رہے گی۔ اگر ہمارا باطن کسی بدلتی ہوئی اور فانی شے پر تکیہ کیے ہوئے ہے، تو وہ مسلسل عدم استحکام، بے چینی، اور اضطراب کا شکار رہے گا۔ اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ایک لمحے تو ہم خوش ہوتے ہیں، مگر جونہی وہ سہارا بدلتا ہے جس پر ہماری خوشی ٹکی تھی، ہماری مسرت پل بھر میں کافور ہو جاتی ہے۔ اور ہم غم کی دلدل میں جا گرتے ہیں۔ ہم ہمیشہ ایک انتہا سے دوسری انتہا کے درمیان جھولتے رہتے ہیں اور کبھی یہ سمجھ ہی نہیں پاتے کہ ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔

ہم جذبات کے اس دردناک تلاطم اور جھولے کا شکار اس لیے ہوتے ہیں کیونکہ ہم اس وقت تک کبھی دائمی سکون اور قرار پا ہی نہیں سکتے جب تک ہماری قلبی وابستگی اور انحصار اس ذات پر نہ ہو جو خود قائم و دائم اور سدا رہنے والی ہے۔ ہم اس وقت تک ثبات اور استقامت کی امید کیسے رکھ سکتے ہیں جب تک ہم نے جس شے کا دامن تھام رکھا ہے وہ خود غیر مستحکم، متزلزل اور فنا ہونے والی ہو؟ خلیفۂ اول سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تاریخی کلام اس سچائی کا کتنا عظیم اور روشن ثبوت ہے۔ جب سرورِ کائنات، حضور اکرم ﷺ کا وصالِ مبارک ہوا، تو صحابۂ کرام پر غم و اندوہ کی قیامت ٹوٹ پڑی اور وہ اس جاں گسل خبر کو سنبھال نہ پا رہے تھے۔ اگرچہ روئے زمین پر کوئی بھی انسان ایسا نہ تھا جو نبی کریم ﷺ سے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ والہانہ محبت کرتا ہو، لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خوب جانتے تھے کہ انسان کے توکل اور وابستگی کا واحد اور حقیقی مرکز کون سا ہونا چاہیے۔ انہوں نے فرمایا: "سنو! تم میں سے جو شخص محمد (ﷺ) کی عبادت کرتا تھا تو جان لے کہ محمد (ﷺ) کی وفات ہو چکی ہے۔ اور جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو بے شک اللہ سدا زندہ ہے، اسے کبھی موت نہیں آئے گی!"

دل کی اس لازوال استقامت کو حاصل کرنے کے لیے، اپنے باطنی سکون کا سرچشمہ اللہ کے سوا کسی اور چیز کو ہرگز نہ بننے دیں۔ اپنی کامیابی، ناکامی، یا اپنی ذاتی قدر و منزلت کا معیار اللہ کے حضور اپنے مقام اور تقوے کے سوا کسی فانی شے کو نہ ٹھہرائیں (جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ﴾، سورۃ الحجرات: 13)۔ اور اگر آپ نے یہ کر دکھایا، تو پھر آپ ایسے ناقابلِ شکست بن جائیں گے جسے کوئی توڑ

نہیں سکتا، کیونکہ آپ نے جس رسّی کو تھام رکھا ہے وہ کبھی ٹوٹنے والی نہیں۔ آپ ایسی باوقار ہستی بن جائیں گے جسے دنیا کی کوئی طاقت مغلوب نہیں کر سکتی، کیونکہ آپ کا پشت پناہ اور حامی وہ ہے جسے کبھی شکست نہیں دی جا سکتی۔ اور آپ کا دل کبھی پیاسا یا خالی نہیں رہے گا، کیونکہ آپ کی روحانی سیرابی کا سرچشمہ وہ بحرِ بیکراں ہے جو لامحدود ہے اور جس میں کبھی کمی نہیں آتی۔

جب مَیں سترہ برس کی عمر میں دیکھے گئے اپنے اس خواب پر نظر ڈالتی ہوں، تو سوچتی ہوں کہ کیا وہ معصوم بچی دراصل مَیں خود ہی تو نہ تھی؟ مجھے یہ گمان اس لیے ہوتا ہے کیونکہ اس وقت مَیں نے اسے جو جواب دیا تھا، وہ ایک ایسا کٹھن سبق تھا جسے سیکھنے کے لیے مجھے اپنی زندگی کے آئندہ کئی دردناک اور آزمائش بھرے سال نچھاور کرنے تھے۔ اس کے اس سوال پر کہ 'لوگ ایک دوسرے کو کیوں چھوڑ جاتے ہیں؟'، میرا جواب یہ تھا: "کیونکہ یہ فانی زندگی بے عیب اور کامل نہیں ہے؛ اور اگر یہ کامل ہوتی، تو پھر بھلا آنے والی اگلی زندگی (جنت) کو کیا کہا جاتا؟"

topqna.com

لوگ چلے تو جاتے ہیں، لیکن کیا وہ واپس لوٹتے ہیں؟

People Leave, But Do They Return?

کسی کا چھوڑ جانا بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ اور کسی عزیز کو کھو دینا اس سے بھی کہیں زیادہ جاں گسل۔ چنانچہ کچھ ہفتے قبل مَیں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ 'لوگ ایک دوسرے کو کیوں چھوڑ جاتے ہیں؟' اس سوال کے جواب نے مجھے اپنی زندگی کے چند گہرے ترین حقائق، اندرونی کشمکش اور روحانی ادراک سے روشناس کرایا۔ تاہم اس جواب نے میرے اندر ایک اور نیا سوال بھی بیدار کر دیا: کہ جب لوگ چلے جاتے ہیں، تو کیا وہ کبھی واپس بھی لوٹتے ہیں؟ جب کوئی ایسی چیز جس سے ہم والہانہ محبت کرتے ہیں ہم سے چھین لی جائے، تو کیا وہ کبھی لوٹ کر واپس آتی ہے؟ کیا یہ نقصان اور جدائی ابدی ہوتی ہے—یا یہ کسی بلند تر اور عظیم تر مقصد کے حصول کا محض ایک ذریعہ ہے؟ کیا کسی شے کا چھن جانا بذاتِ خود انجام ہے، یا یہ ہمارے دل کی روحانی بیماریوں کا وقتی علاج ہے؟

اس دنیاوی زندگی میں ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز رازپنہاں ہے۔ اس دنیا کی وہی صفت جو ہمیں سب سے زیادہ دکھ اور تکلیف پہنچاتی ہے، بعینہٖ وہی ہمیں سب سے بڑا سکون اور تسلی بھی بخشتی ہے: یعنی یہ کہ یہاں کوئی بھی چیز ہمیشہ قائم نہیں رہتی ! اس کا مفہوم کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے گلدان میں سجا ہوا وہ دلکش اور خوشبودار گلاب کل مرجھا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میری یہ شباب کی جوانی مجھ سے منہ موڑ لے گی۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ جو رنج و غم مَیں آج اپنے سینے میں محسوس کر رہی ہوں، وہ بھی کل بدل جائے گا۔ میری یہ تکلیف فنا ہو جائے گی۔ اگر میرے قہقہے ہمیشہ باقی رہنے والے نہیں ہیں—تو میرے بہنے والے آنسو بھی ہمیشہ جاری نہیں رہیں گے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ زندگی کامل نہیں ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ کامل نہیں ہے۔ یہ نہ تو مکمل طور پر اچھی ہے، اور نہ ہی یہ ہمہ تن بری ہے۔

اللہ رب العزت نے قرآنِ مجید کی ایک نہایت گہری اور پر حکمت آیت میں ہمیں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴾ "پس یقیناً تنگی اور مشکل کے ساتھ ہی آسانی ہے۔" (سورۃ الانشراح: 5) بچپن اور نو عمری

میں شاید مَیں اس آیت کے مفہوم کو غلط سمجھتی رہی تھی۔ مَیں یہ گمان کرتی تھی کہ اس کا مطلب ہے: مشکل اور تنگی کے بعد آسانی آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، میرا خیال تھا کہ زندگی اچھے اور برے ادوار کا مجموعہ ہے؛ برے دن گزر جائیں تو ان کے بعد اچھے دن طلوع ہوتے ہیں۔ مَیں یوں سوچتی تھی گویا زندگی یا تو سراسر خوشیوں کا نام ہے یا بالکل دکھوں کی داستان۔ لیکن یہ مبارک آیت یہ نہیں کہہ رہی۔ یہ آیت فرماتی ہے کہ تنگی کے ساتھ ہی آسانی ہے۔ آسانی اور کشادگی بالکل اسی وقت موجود ہوتی ہے جب تنگی اور مصیبت گھیرے ہوئے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی صورتحال نہ تو کلی طور پر بری ہوتی ہے (اور نہ ہی کلی طور پر اچھی)۔ ہم جس کٹھن سے کٹھن آزمائش میں بھی مبتلا ہوں، اس کے اندر بھی شکر گزاری کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور چھپا ہوتا ہے۔ مشکل کے عین وقت پر، اللہ تعالیٰ انسان کو اسے جھیلنے کا حوصلہ، صبر اور باطنی قوت بھی عطا فرما دیتا ہے۔

اگر ہم اپنی زندگی کے کٹھن ترین لمحوں اور ادوار کا گہرائی سے جائزہ لیں، تو ہم پر یہ راز کھلے گا کہ وہ ادوار بھی لاتعداد بھلائیوں اور خیر کے پہلوؤں سے مالامال تھے۔ اصل سوال یہ ہے کہ ہم اپنی توجہ کس رخ پر مرکوز رکھنا چاہتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ ہم جس دامِ فریب میں پھنس جاتے ہیں، اس کی جڑ اس باطل گمان میں ہے کہ یہ دنیا شاید کامل ہو سکتی ہے—یا تو سراپا خیر یا سراپا شر! حالانکہ یہ اس فانی دنیا کی فطرت ہی نہیں ہے۔ یہ کمال تو صرف اور صرف آخرت کے لیے خاص ہے۔ آخرت ہی وہ مقام ہے جہاں چیزیں اپنے نقطۂ کمال کو پہنچیں گی۔ جنت سراپا خیر اور مطلق بھلائی کا مسکن ہے، جس میں برائی اور دکھ کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ اور جہنم (اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کے عذاب سے پناہ میں رکھے) سراسر شر اور دکھ کا ٹھکانہ ہے، جس میں کسی خیر اور آسانی کا نام و نشان نہیں۔

اس بنیادی سچائی کو نہ سمجھنے کی وجہ سے، مَیں خود بھی اپنی زندگی کے عارضی حالات و کیفیات کی اسیر بن کر رہ جاتی تھی (خواہ وہ حالات اچھے ہوں یا برے)۔ مَیں ہر کیفیت کو اس کی آخری شدت کے ساتھ محسوس کرتی تھی—گویا کہ یہ کیفیت ہی میرا حتمی مقدر ہے اور کبھی ختم نہیں ہوگی۔ اس خاص لمحے میں جو میرا احساس ہوتا، وہ میری نگاہ میں پوری کائنات اور اس کی ہر شے کا رنگ بدل کر رکھ دیتا۔ اگر مَیں اس لمحے خوش ہوتی، تو ماضی و حال، دور و نزدیک، پوری کائنات ہی مجھے اس لمحے سراپا خیر اور کامل نظر آنے لگتی—گویا کہ دنیا ہی میں جنت اتر

آئی ہو۔ اور بالکل یہی معاملہ دکھوں اور منفی حالات کے ساتھ بھی پیش آتا۔ کوئی منفی کیفیت میری پوری ہستی کو نگل جاتی۔ وہ غم اس لمحے کے لیے میری کل کائنات، ماضی و حال، سب پر چھا جاتا اور مجھے پوری دنیا تاریک دکھائی دینے لگتی۔ چونکہ وہ لمحہ میری پوری کائنات بن بیٹھتا تھا، اس لیے مَیں اس کے دائرے سے باہر کچھ بھی دیکھنے سے قاصر ہو جاتی تھی۔ اس ایک لمحے کے سوا میرے لیے کسی اور چیز کا وجود ہی نہ رہتا۔ اگر آج آپ نے میرے ساتھ کوئی زیادتی یا ناروا سلوک کر دیا، تو مَیں یہی سمجھ بیٹھتی کہ آپ کو اب مجھ سے ذرا بھی ہمدردی یا محبت نہیں رہی—بجائے اس کے کہ مَیں یہ سمجھتی کہ یہ تو لامتناہی لمحوں کی زنجیر کی محض ایک کڑی ہے جو کسی تلخ رنگ میں رنگ گئی، یا یہ کہ آپ، مَیں اور یہ دنیا سرے سے بے عیب اور کامل ہیں ہی نہیں۔ اس خاص لمحے میں جو کیفیت مجھ پر طاری ہوتی، وہ سارے پس منظر کو مٹا دیتی تھی، کیونکہ وہ کیفیت دنیا کے بارے میں میرے پورے نقطۂ نظر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی۔

میرا خیال ہے کہ ہم میں سے بعض لوگ اپنے جذباتی اور حسی مزاج کے باعث اس طرزِ فکر کا زیادہ آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔ شاید یہی وہ باطنی سبب ہے جس کی بنا پر انسان اس ناشکری کے فتنے کا شکار ہو جاتا ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنی حدیثِ مبارکہ میں بیان فرمایا کہ عورت (یا انسان) کبھی غصے اور مایوسی میں کہہ اٹھتی ہے: "مَا رَأَیْتُ مِنْکَ خَیْرًا قَطُّ" (میں نے تجھ سے کبھی کوئی بھلائی دیکھی ہی نہیں!)۔ شاید ہم میں سے بعض لوگ اس لمحے ایسا اس لیے کہہ بیٹھتے ہیں یا محسوس کرتے ہیں کیونکہ جذباتی اور حسی اعتبار سے اس خاص لمحے میں انہیں واقعی کوئی بھلائی دکھائی نہیں دے رہی ہوتی؛ اس لیے کہ اس پل کا منفی احساس ان کے ماضی و حال کو نگل کر ان کی کل حقیقت بن چکا ہوتا ہے۔ ماضی اور حال سب سمٹ کر اس ایک تلخ لمحے کے اندر قید ہو جاتے ہیں۔

لیکن جب انسان کے دل پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ اس فانی زندگی میں کوئی بھی شے کامل اور مکمل نہیں ہے، تو دنیا کے بارے میں اس کا پورا تجربہ اور زاویۂ نگاہ یکسر بدل جاتا ہے۔ اچانک ہم ان وقتی لمحوں کے اسیر بننے سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ جب دل یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہاں کوئی بھی شے لامحدود نہیں ہے، اور یہاں کی کوئی چیز بھی 'کامل' نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ ہمیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ ہم ان وقتی لمحوں کی قید سے باہر نکل کر انہیں ان کی اصل اوقات میں دیکھ سکیں: کہ یہ کوئی الگ کائناتیں نہیں ہیں، نہ ہی یہ ہمارا

ماضی و حال اور مطلق حقیقت ہیں، بلکہ یہ تو لامتناہی لمحوں کی طویل زنجیر کا محض ایک عارضی لمحہ ہیں... اور یہ لمحہ بھی گزر جائے گا!

جب میری آنکھیں اشکبار ہوں، جب میرا کچھ کھو جائے، یا جب مَیں زخم کھا کر چور ہو جاؤں، تو جب تک میرے تن میں سانس باقی ہے، کوئی بھی صدمہ آخری اور حتمی نہیں ہے۔ جب تک زندگی میں آنے والا کل موجود ہے، اگلا لمحہ باقی ہے، تب تک امید کا دامن سلامت ہے، تبدیلی کا امکان روشن ہے، اور تلافی و بحالی کی راہ کھلی ہے۔ جو کھو گیا ہے، وہ ہمیشہ کے لیے نہیں کھویا۔

چنانچہ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے کہ 'کیا کھو جانے والی چیزیں کبھی واپس لوٹتی ہیں؟'، مَیں تاریخِ انسانیت کی حسین ترین اور درخشاں مثالوں پر نگاہ ڈالتی ہوں۔ کیا یوسف علیہ السلام اپنے بوڑھے باپ کی آغوش میں واپس نہیں لوٹ آئے تھے؟ کیا موسیٰ علیہ السلام اپنی تڑپتی ہوئی ماں کی گود میں واپس نہیں پہنچا دیے گئے تھے؟ کیا ہاجرہ علیہا السلام کو ویران صحرا میں تنہا چھوڑے جانے کے بعد ابراہیم علیہ السلام کا ساتھ اور اللہ کی نصرت دوبارہ میسر نہ آئی؟ کیا ایوب علیہ السلام پر آزمائش کے بعد ان کی کھوئی ہوئی صحت، دولت اور اولاد کو دگنا کر کے واپس نہیں لوٹا دیا گیا تھا؟ ان قرآنی داستانوں سے ہم ایک نہایت پرشکوہ، طاقتور اور روح پرور سبق حاصل کرتے ہیں: کہ جو شے اللہ کے لیے قربان کر دی جائے یا جسے اللہ اپنی حکمت سے لے لے، وہ کبھی ضائع اور برباد نہیں ہوتی! درحقیقت، صرف وہی شے باقی رہتی ہے جو اللہ کے پاس محفوظ ہو جائے، باقی سب کچھ تو فنا ہو جانے والا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے: ﴿مَا عِندَكُمْ يَنفَدُ ۖ وَمَا عِندَ اللَّهِ بَاقٍ ۗ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ "جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ فنا ہو جائے گا، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے۔ اور ہم صبر کرنے والوں کو ان کے بہترین اعمال کے بدلے ان کا اجر ضرور عطا فرمائیں گے۔" (سورۃ النحل: 96) پس جو کچھ اللہ کے پاس امانت رکھ دیا جائے، وہ کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ بلکہ نبی اکرم ﷺ کا تو ارشادِ پاک ہے: «إِنَّكَ لَنْ تَدَعَ شَيْئًا لِلَّهِ عَزَّ وَجَلَّ إِلَّا بَدَّلَكَ اللَّهُ بِهِ مَا هُوَ خَيْرٌ لَكَ مِنْهُ» "تم اللہ عزوجل کے خوف اور رضا کی خاطر جس چیز کو بھی چھوڑو گے، اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے بدلے میں لازماً اس سے بہتر چیز عطا فرمائے گا۔" (مسند احمد) کیا اللہ نے ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ

عنہا سے ان کے پیارے شوہر ابو سلمہ کو جدا نہیں فرمایا تھا، اور پھر اس جدائی کے صلے میں انہیں کائنات کی سب سے عظیم ہستی، خود رسول اللہ ﷺ کی رفاقت عطا نہ فرما دی؟

بعض اوقات اللہ تعالیٰ کسی شے کو چھینتا ہی اس لیے ہے تاکہ وہ پہلے سے بہتر عطا فرما سکے۔ لیکن یہ سمجھنا نہایت اہم ہے کہ اللہ کا عطا کرنا ہمیشہ اسی شکل اور صورت میں نہیں ہوتا جس کا ہم اپنے محدود ذہن سے تقاضا کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ علیم و خبیر بہتر جانتا ہے کہ ہمارے حق میں اصل بھلائی کس چیز میں ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴾ "اور عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو، اور عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔" (سورۃ البقرۃ: 216) لیکن اگر کسی چیز کو کسی نہ کسی شکل میں واپس ہی لوٹنا ہے، تو پھر سرے سے اسے چھینا ہی کیوں جاتا ہے؟ سبحان اللہ! اصل راز یہ ہے کہ چھن جانے اور 'کھونے' کے اسی عمل کے دوران ہی درحقیقت ہمیں اصل دولت عطا کی جا رہی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بے شمار نعمتیں اور تحائف عطا فرماتا ہے، مگر المیہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس منعمِ حقیقی کو چھوڑ کر اس کی دی ہوئی نعمتوں پر تکیہ کرنے لگتے ہیں۔ جب وہ ہمیں دولت سے نوازتا ہے، تو ہم اس پر انحصار کرنے کے بجائے پیسوں پر بھروسا کرنے لگتے ہیں۔ جب وہ ہمیں پیار کرنے والے انسان اور مخلص رشتے دیتا ہے، تو ہم اللہ کے بجائے ان انسانوں کے محتاج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جب وہ ہمیں جاہ و منصب یا طاقت و اقتدار بخشتا ہے، تو ہم ان ظاہری چیزوں کے سحر میں مبتلا ہو کر اللہ سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اور جب اللہ ہمیں صحت و تندرستی کی نعمت دیتا ہے، تو ہم فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ ہمیں کبھی موت نہیں آئے گی۔

اللہ ہمیں نعمتیں عطا کرتا ہے، مگر ہم نادانی میں ان نعمتوں سے اس طرح والہانہ محبت کرنے لگتے ہیں جس طرح صرف اور صرف اللہ سے کرنی چاہیے تھی۔ ہم ان دنیاوی تحائف کو اٹھا کر اپنے دل کے تخت پر بٹھا دیتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ہمارے دل کے تن و من پر قابض ہو جاتی ہیں۔ کچھ ہی عرصے میں حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہم ان کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہماری زندگی کا ہر جاگتا لمحہ انہی کے دھیان، انہی کی غلامی

اور انہی کی پرستش میں گزرنے لگتا ہے۔ وہ دل اور وہ عقل جسے اللہ نے صرف اپنی معرفت اور اپنی محبت کے لیے پیدا فرمایا تھا، وہ کسی اور فانی ہستی یا چیز کی جاگیر بن کر رہ جاتی ہے۔ اور پھر دل میں خوف کے سائے لہرانے لگتے ہیں؛ نعمت کے چھن جانے کا اندیشہ انسان کی روح کو مفلوج کر کے رکھ دیتا ہے۔ وہ نعمت—جسے صرف ہمارے ہاتھوں میں رہنا چاہیے تھا—ہمارے دل پر قابض ہو جاتی ہے، چنانچہ اسے کھو دینے کا ہولناک خوف ہمارے وجود کو نگلنے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ، وہ نعمت جو کبھی فرحت بخش تحفہ تھی، اب روح کے لیے اذیت کا ہتھیار اور ہماری اپنی ہی بنائی ہوئی ایک تنگ تاریک جیل بن جاتی ہے۔ اب بھلا اس دلدوز قید سے نجات کیسے ممکن ہو؟ ایسے عالم میں، اللہ تعالیٰ اپنی بے پایاں رحمت و عنایت کے طفیل ہمیں اس عذاب سے آزاد کراتا ہے... اور وہ اس نعمت کو ہم سے چھین لیتا ہے!

جب وہ شے ہم سے لے لی جاتی ہے، تو اس کے نتیجے میں ہم ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ سچے دل سے اللہ کی چوکھٹ کی طرف پلٹتے ہیں۔ اس بے بسی، کسمپرسی اور شدید محتاجی کے عالم میں ہم اللہ کے آگے گڑگڑاتے ہیں، التجا کرتے ہیں اور راتوں کو آنسو بہا کر دعائیں مانگتے ہیں۔ اس محرومی اور نقصان کے ذریعے ہم خلوص، عاجزی اور اللہ پر کامل انحصار کے اس اعلیٰ مقام تک پہنچ جاتے ہیں جس تک ہم عام حالات میں کبھی نہ پہنچ پاتے—اگر وہ نعمت ہم سے چھینی نہ جاتی! اس صدمے کی بدولت ہمارا دل پوری طرح دنیا سے کٹ کر صرف اور صرف اللہ کے رخِ انور کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

ذرا سوچیے، جب آپ پہلی بار کسی چھوٹے بچے کو اس کا من پسند کھلونا یا ویڈیو گیم لا کر دیتے ہیں جس کی وہ مدتوں سے ضد کر رہا تھا، تو کیا ہوتا ہے؟ وہ بچہ اس کھلونے میں اتنا کھو جاتا ہے کہ اسے دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔ جلد ہی وہ اس کے سوا کچھ اور کرنا ہی نہیں چاہتا۔ اسے اس کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ وہ نہ ہوم ورک کرنا چاہتا ہے اور نہ وقت پر کھانا کھاتا ہے۔ وہ اپنے ہی نقصان پر یوں مسحور ہو جاتا ہے جیسے اس پر نشہ طاری ہو۔ اب بحیثیتِ ایک شفیق اور محبت کرنے والے والدین، آپ کا طرزِ عمل کیا ہوگا؟ کیا آپ اسے اسی نشے میں غرق رہنے دیں گے کہ وہ اپنی زندگی کا توازن اور سدھ بدھ بالکل کھو بیٹھے؟ ہرگز نہیں۔ آپ آگے بڑھ کر وقتی طور پر اس سے وہ کھلونا چھین لیتے ہیں۔

آپ اسے وقتی طور پر اس کی نظروں سے دور کر دیتے ہیں۔

پھر، جب بچہ اپنی ترجیحات کو دوبارہ سمجھ لیتا ہے، اس کا ہوش و حواس اور ذہنی توازن بحال ہو جاتا ہے، اور جب اس کے دل و دماغ اور زندگی میں ہر چیز اپنی درست جگہ پر آجاتی ہے، تو پھر کیا ہوتا ہے؟ آپ وہ کھلونا اسے دوبارہ واپس دے دیتے ہیں۔ یا شاید اس سے بھی کوئی بہتر اور مفید تحفہ عنایت کر دیتے ہیں۔ لیکن اس بار، وہ کھلونا اب اس کے دل پر سوار نہیں ہوتا۔ وہ اپنی اصل اور درست جگہ پر رہتا ہے۔ یعنی وہ اب اس کے دل میں نہیں، بلکہ اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

مگر نعمت کو وقتی طور پر چھین لینے کے اس پورے عمل کے دوران سب سے عظیم معجزہ رونما ہو چکا ہوتا ہے۔ نعمت کا چھن جانا یا دوبارہ واپس مل جانا تو ثانوی اور معمولی سی بات تھی۔ اصل نعمت تو یہ تھی کہ اللہ نے آپ کی غفلت کو، غیر اللہ پر آپ کے تکیے کو اور مخلوق پر جمی ہوئی آپ کی نظروں کو توڑ ڈالا، اور اس کی جگہ اپنے ذکر کی حلاوت، اپنے در کی محتاجی اور صرف اپنی ذات پر کامل توکل کا نور عطا فرما دیا۔ یہی وہ حقیقی انعام تھا جس کے لیے وہ چھینا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ جب کسی کو اپنی بارگاہ سے محروم کرتا ہے، تو وہ دراصل اس سے بھی بڑا انعام عطا کرنے کے لیے روکتا ہے!

اور اسی لیے بعض اوقات وہ 'بہتر شے' جس سے نوازا جاتا ہے، وہ کائنات کی سب سے عظیم دولت ہوتی ہے: یعنی اللہ کا قرب اور اس کی معرفت! اللہ نے مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی معصوم لختِ جگر کو چھین لیا تاکہ وہ ان کی روح کو ہمیشہ کے لیے نجات دلا سکے۔ اللہ نے ان کی ننھی بیٹی کو اپنے پاس بلا لیا، مگر اس کے بدلے میں مالک بن دینار کو جہنم کی آگ سے پناہ عطا فرما دی اور انہیں گناہوں، غفلت اور خدا سے دوری کی اذیت ناک زندگی سے نکال کر توبہ کی دولت بخش دی۔ بیٹی کی جدائی کے اس زخم کے طفیل، مالک بن دینار کو وہ مبارک زندگی نصیب ہوئی جو ساری کی ساری اللہ کے قرب اور ولایت میں گزری۔ اور پھر جو نعمت ان سے دنیا میں جدا کی گئی تھی (یعنی ان کی پاکیزہ بیٹی)، وہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت الفردوس میں مالک بن دینار کے ساتھ رہے گی!

امام ابن قیم الجوزیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'مدارج السالکین' میں اس حکمت و حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے کیسا پر حکمت کلام فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "مومن کے حق میں اللہ تعالیٰ کا ہر فیصلہ سراسر عطا اور احسان ہوتا ہے، اگرچہ ظاہری طور پر وہ کسی محبوب شے کو روک لینے اور محروم کر دینے کی صورت ہی

میں کیوں نہ ہو؛ اور اس کا ہر فیصلہ ایک نعمت ہوتا ہے، خواہ وہ دیکھنے میں آزمائش، مصیبت اور بلا ہی کی شکل میں دکھائی دے؛ درحقیقت وہ تو ایک شفا اور علاج ہوتا ہے، اگرچہ بظاہر وہ انسان کو ایک جان لیوا بیماری محسوس ہو رہا ہو!"

چنانچہ اس سوال کا جواب کہ: 'جب کوئی چیز کھو جائے تو کیا وہ واپس لوٹتی ہے؟'—تو اس کا قطعی جواب ہے: ہاں! وہ واپس لوٹتی ہے۔ کبھی اسی دنیا میں، کبھی آخرت کی ابدی زندگی میں، اور کبھی کسی اس سے بھی زیادہ حسین اور بہتر صورت میں۔ لیکن سب سے عظیم ترین انعام تو چھین لینے اور واپس لوٹانے کے اس سارے پردے کے پیچھے پوشیدہ ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے: ﴿ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴾ "آپ فرما دیجیے کہ یہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت ہی کے باعث ہے، پس اسی پر لوگوں کو خوش ہونا چاہیے؛ یہ ان تمام چیزوں سے کہیں بہتر ہے جنہیں وہ جمع کرتے ہیں۔" (سورۃ یونس: 58)

topqna.com

اندرونی خلا کو پُر کرنا اور اصل گھر کی طرف واپسی

On Filling the Inner Hole and Coming Home

ہم اپنے اصل گھر میں تھے۔

اور پھر ہم نہ رہے۔ اپنے اصل مقام اور سرچشمے سے جدا کر کے، ہم زمان و مکان کی مسافتیں طے کر کے ایک دوسری ہی دنیا میں بھیج دیے گئے۔ ایک کمتر اور ادنیٰ دنیا میں۔ لیکن اس جدائی کے عمل میں ایک نہایت دردناک سانحہ رونما ہوا۔ ہم مادی و حسی اعتبار سے اب اللہ کے روبرو نہ رہے تھے۔ ہم اپنی مادی آنکھوں سے اس کا دیدار نہیں کر سکتے تھے، نہ ہی اپنی جسمانی آواز سے اس سے ہمکلام ہو سکتے تھے۔ اپنے جدِ امجد سیدنا آدم علیہ السلام کے برعکس، اب ہم وہ ابدی اور ہمہ گیر سکون و قرار اپنے دلوں میں محسوس نہیں کر پاتے تھے۔

چنانچہ ہم اس عالمِ سفلی میں اتر آئے۔ ہم اپنے پروردگار کے قرب سے جدا کر دیے گئے۔ اور اس ہجر و فراق کے درد سے ہم لہولہان ہو گئے۔ اپنی تاریخ میں پہلی بار ہماری روح سے خون رسا۔ اور اپنے خالق سے الگ ہونے کے اس سانحے نے ہماری روح پر ایک گہرا زخم لگا دیا۔ ایک ایسا ناسور جس کے ساتھ ہم میں سے ہر انسان اس دنیا میں جنم لیتا ہے۔ اور جیسے جیسے ہماری عمر بڑھتی گئی، اس زخم کی تڑپ اور جلن بھی بڑھتی چلی گئی؛ وہ گھاؤ گہرا سے گہرا تر ہوتا گیا۔ لیکن جوں جوں وقت کی دھول جمتی گئی، ہم اس تریاق اور شفا سے دور اور مزید دور ہوتے چلے گئے جو پہلے ہی سے ہماری فطرتِ سلیمہ میں ودیعت کر دی گئی تھی: یعنی دل، روح اور عقل کے ساتھ اللہ کے قریب ہو جانے کا تریاق!

اور یوں ہر گزرتے سال کے ساتھ، ہم اپنے اندر کے اس بھیانک اور خالی خلا کو بھرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ بے چین اور مضطرب ہوتے گئے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس اندرونی خلا کو بھرنے کی اسی اندھی جستجو ہی میں ہم بار بار ٹھوکریں کھا کر گرتے رہے۔ ہم میں سے ہر شخص نے الگ الگ گڑھوں میں گر کر ٹھوکر کھائی۔ اور ہم میں سے اکثر نے اپنے اس اندرونی خلا کی تکلیف کو سن (numb) کرنے کے لیے بے ہوشی کے

سہارے تلاش کیے۔ چنانچہ بنی نوع انسان کا ایک طبقہ منشیات، شراب اور نشہ آور ادویات کے دلدل میں جا گرا، جب کہ بعض نے باطنی اضطراب کو دبانے کے لیے تسکین کے دوسرے راستے چنے۔ ہم میں سے کچھ لوگ جسمانی لذتوں کی پرستش، جاہ و منصب، اور سیم و زر کی ہوس کے اسیر بن گئے۔ اور ہم میں سے بعض نے اپنے کیریئر، ملازمتوں اور کاروبار میں اپنی روح کو گم کر دیا۔

اور پھر، ہم میں سے کچھ لوگ انسانوں کے فریب میں آکر پھسل گئے۔ ہم میں سے کتنے ہی وہ ہیں جنہوں نے فانی انسانوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے اپنی ہستی کو برباد کر ڈالا۔

لیکن ذرا سوچیے، کیا ہو اگر ہماری زندگی کی یہ ہر ایک ٹھوکر، ہر آزمائش، اور ہر حسی تجربہ صرف اور صرف ایک ہی مقصد کے تحت ہماری تقدیر کا حصہ بنایا گیا ہو: یعنی یہ کہ ہمیں واپس ہمارے اصل وطن کی طرف لوٹا دیا جائے؟ کیا ہو اگر ہماری زندگی کی ہر فتح، ہر شکست، ہر جلوۂ حسن، ہر زوال، ہر ستم، اور چہرے پر کھلنے والی ہر مسکراہٹ کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ ہو کہ وہ ہمارے اور ہمارے رب کے درمیان حائل غفلت کے پردوں میں سے ایک اور پردہ چاک کر دے؟ اس کے اور ہمارے اس مقام کے درمیان حائل پردہ جہاں سے ہمارا سفر شروع ہوا تھا، اور جہاں واپس لوٹنے کے لیے ہماری روح تڑپ تڑپ کر راہیں تلاش کر رہی ہے؟

کیا ہو اگر کائنات اور زندگی کی ہر شے کا اصل مقصد صرف اور صرف دیدارِ الٰہی ہو؟

ہمیں یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ زندگی میں ہم جو کچھ بھی دیکھتے اور جھیلتے ہیں، اس کے پیچھے ایک گہری حکمت اور مقصد پوشیدہ ہے۔ اور یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اس مقصد کا ادراک حاصل کرتے ہیں یا غفلت میں پڑے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر، حسن اور خوبصورتی ہی کو لے لیجیے۔ کچھ لوگ تو ایسے بے حس ہوتے ہیں کہ حسن ان کے بالکل سامنے جلوہ گر ہو تب بھی وہ اسے پہچان نہیں پاتے۔ وہ غروبِ آفتاب کے پرشکوہ منظر یا سنہری دھوپ میں نہائے نارنجی درختوں کے سحر انگیز جنگل میں سے گزر جاتے ہیں، اور پلٹ کر ایک نگاہ بھی نہیں ڈالتے۔

جب کہ کچھ دوسرے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو حسن کو دیکھتے بھی ہیں اور اس کی داد بھی دیتے ہیں۔ وہ قدم روک لیتے ہیں اور اس نظارے کو اپنے اندر سمو لیتے ہیں۔ وہ اس جمال کی سحر انگیزی سے مغلوب بھی ہو سکتے

ہیں۔ لیکن ان کا سارا سفر بس وہیں آکر ختم ہو جاتا ہے۔ ایسا انسان بالکل اس شخص کی مانند ہے جو کسی خوبصورت فن پارے کی تعریف تو دل کھول کر کرتا ہے، لیکن اس کے مصور (Artist) اور تخلیق کار کے بارے میں جاننے کا کبھی خیال تک اپنے دل میں نہیں لاتا۔ وہ شاہکار تو خود اس لیے بنایا گیا تھا تاکہ مصور اپنے فن کے ذریعے ایک پیغام پہنچا سکے؛ لیکن اگر فن کا رسیا اس تصویر کے رنگوں ہی میں گم ہو کر رہ جائے—اور مصور کے اس پیغام کو کبھی نہ دیکھ پائے، تو وہ فن پارہ اپنے اصل مقصد کو پورا کرنے میں ناکام رہا۔

اس کائنات میں دمکتے ہوئے سورج کی پرشکوہ تجلیوں، زمین پر گرنے والی پہلی برف کی سفیدی، پہلی رات کے ہلال کی نزاکت، اور روح کو مسحور کر دینے والے ٹھاٹھیں مارتے سمندروں کا مقصد محض اس تنہا اور بے آب و گیاہ سیارے کو سجانا نہیں ہے۔ ان کی تخلیق کا مقصد اس سے کہیں زیادہ گہرا اور وسیع تر ہے۔ اس کا حقیقی مقصد وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں کھول کر بیان فرمایا ہے:

﴿ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ﴾ "بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں، عقل و بصیرت رکھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔"

﴿ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾ "وہ لوگ جو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں کے بل لیٹے ہوئے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں گہرائی سے غور و فکر کرتے ہیں، (اور پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد اور بے فائدہ پیدا نہیں فرمایا! تیری ذات پاک اور بے عیب ہے، پس تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے!" (سورۃ آل عمران: 190-191) یہ سارا حسن اور رعنائی ایک نشانی کے طور پر تخلیق کی گئی تھی—لیکن ایک ایسی نشانی جسے صرف ایک مخصوص اور چیدہ گروہ ہی سمجھ سکتا ہے: یعنی وہ اہلِ دل جو ہر لمحہ غور و فکر کرتے ہیں (عقل و دانش اور تفکر کو کام میں لاتے ہیں) اور انسانی زندگی کی ہر حالت میں (خواہ وہ کھڑے ہوں، بیٹھے ہوں، یا پہلو کے بل لیٹے ہوں) اپنے پروردگار کو یاد رکھتے ہیں۔

چنانچہ، شام کے وقت ڈھلتے ہوئے سورج کی شفق کو بھی اس کے پار جھانک کر دیکھنا ہوگا۔ ہمیں وہاں بھی منظر کے سحر میں گم نہیں ہو جانا۔ ہمیں اس شاندار رنگ و نور کی ظاہری خوبصورتی کے پار دیکھنا ہوگا، تاکہ

ہم اس حقیقی اور ازلی حسن کا جلوہ دیکھ سکیں جو اس پردے کے پیچھے جلوہ فرما ہے۔ کیونکہ اس کے پیچھے کارفرما جمال ہی درحقیقت 'حسنِ مطلق' ہے، جو تمام کائناتی حسن کا سرچشمہ اور منبع ہے۔ ہم جو کچھ بھی دیکھتے ہیں، وہ تو اس حسنِ ازل کا محض ایک ادنیٰ سا پرتو اور عکس ہے۔

ہمیں چمکتے ستاروں، سرسبز درختوں، اور برف سے ڈھکی فلک بوس پہاڑی چوٹیوں کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ ہم ان کے پیچھے چھپے ہوئے پیغام کو پڑھ سکیں۔ کیونکہ اگر ہم ایسا نہیں کرتے، تو ہماری مثال اس نادان شخص جیسی ہے جسے ایک نہایت خوبصورت، مرصع اور طلائی شیشے کی بوتل میں لپٹا ہوا کوئی پیغام ملے، مگر وہ اس بوتل کی ظاہری چمک دمک پر اتنا فریفتہ ہو جائے کہ اندر بند پیغام کو کھول کر پڑھنے کی زحمت ہی گوارا نہ کرے۔

مگر ستاروں کی اس تابانی اور شدت کے اندر کون سا پیغام بند ہے؟ یہ سب نشانیاں تو ہیں— لیکن آخر کس چیز کی نشانیاں؟ یہ تمام نشانیاں ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف اشارہ کرنے والے قطب نما ہیں، اس کی عظمت، اس کی جلالت، اور اس کے بے مثال جمال کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ اس کے قہر و جبروت، قوت اور قدرت کا اعلان ہیں۔ پس جو کچھ بھی تخلیق کیا گیا ہے اس کے حسن، جلال اور رعنائی کا مطالعہ کرو، اس پر غور کرو اور اسے اپنی روح میں جذب کرو— لیکن خبردار، یہیں پر رک نہ جانا! خود کو اس ظاہری حسن کے دام میں گم نہ کر بیٹھنا۔ اس سے آگے نگاہ اٹھاؤ اور سوچو کہ اگر ایک فانی مخلوق اتنی باکمال، اتنی عظیم اور اتنی پرکشش ہو سکتی ہے، تو وہ خالقِ اکبر خود کتنا باکمال، کتنا پرجلال، اور کتنا بے پایاں حسن و جمال کا مالک ہوگا!

اور آخرکار اپنے باطن کے نہاں خانوں میں اس حقیقت کا ذاتی و حسی تجربہ کرو کہ:

﴿ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ ﴾ "اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ تیری ذات ہر عیب سے پاک اور بلند تر ہے!" (سورۃ آل عمران: 191) مقصد... کائنات کی ہر ہر شے کا ایک مقصد ہے۔ آسمانوں میں، زمین کی وسعتوں میں، میرے اندر، یا آپ کے دل کے نہاں خانوں میں کوئی ایک ذرہ بھی ایسا نہیں ہے جسے بغیر کسی مقصد و حکمت کے پیدا کیا گیا ہو۔ آپ کی زندگی کا کوئی واقعہ، کوئی غم، کوئی خوشی، کوئی دکھ، کوئی لذت... اور کوئی جدائی و نقصان ایسا نہیں ہے جو حکمت اور مقصد سے خالی ہو۔ چنانچہ جس طرح ہمیں سورج، چاند اور ستاروں بھرے نیلگوں آسمان کی 'بوتل کے اندر بند پیغام' کو پڑھنا ہے، بالکل

اسی طرح ہمیں اپنی زندگی کے ذاتی تجربات و حوادث کے اندر پوشیدہ الٰہی پیغامات کی ورق گردانی بھی کرنی ہوگی۔

ہم انسان ہمیشہ معجزات اور نشانیوں کے متلاشی رہتے ہیں۔ ہم سدا یہی دعا مانگتے ہیں کہ کاش اللہ ہم سے 'ہمکلام' ہو، ہم سے بات کرے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس کی نشانیاں ہمارے چاروں طرف بکھری پڑی ہیں۔ وہ کائنات کی ہر ہر شے میں بول رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو ہر لمحہ اپنی قدرت سے 'کلام' فرما رہا ہے۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ کیا ہم دل کے کانوں سے سن بھی رہے ہیں یا نہیں؟

اللہ رب العزت کا فرمان ہے:

﴿ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۘ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ ۗ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴾ "اور بے علم لوگ کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے خود کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی انہی جیسی باتیں کہی تھیں۔ ان سب کے دل ایک جیسے ہو گئے۔ بے شک ہم نے یقین رکھنے والوں کے لیے نشانیاں کھول کر واضح کر دی ہیں۔" (سورۃ البقرۃ: 118) اگر ہم اپنے ساتھ پیش آنے والے ہر واقعے، اپنے ہر عمل—یا اپنی ہر کوتاہی کے پار جھانک کر اللہ کی مشیت اور اس کی ذات کا مشاہدہ کر سکیں، تو سمجھ لیجیے کہ ہم نے زندگی کا اصل مقصد پا لیا۔ جب آپ کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ رونما ہو جسے آپ پسند کرتے ہوں اور جس پر دل خوش ہو جائے، تو خبردار، اصل مقصد کو نظر انداز نہ کر بیٹھنا! یاد رکھیے کہ کوئی بات بغیر سبب کے نہیں ہوتی۔ اس کے اندر پوشیدہ حکمت کو تلاش کیجیے۔ اس مقصد کو کھوجیے جو اللہ نے اس عطا کردہ نعمت کے اندر رکھ دیا ہے۔ وہ اس نعمت کے ذریعے آپ کو اپنی صفاتِ عالیہ کا کون سا جلوہ دکھا رہا ہے؟ وہ اس عطا کے بدلے آپ کے باطن سے کس بندگی کا تقاضا کر رہا ہے؟

اسی طرح، جب زندگی میں کوئی ایسی ناگوار بات پیش آئے جسے آپ ناپسند کرتے ہوں یا جو آپ کے دل کو زخمی کر دے، تو ہوشیار رہیے کہ اس درد اور تکلیف کے پیدا کردہ وہم و فریب میں گم نہ ہو جائیے گا۔ اس درد کے پار جھانک کر دیکھیے۔ اس مصیبت کی بوتل میں بند الٰہی پیغام کو تلاش کیجیے۔ اس آزمائش کے مقصد کو پا لیجیے۔ اور اس درد کو ذریعہ بنائیے تاکہ وہ آپ کو اس پروردگار کے جلوۂ رحمت کی مزید ایک جھلک دکھا سکے۔

اگر آپ کے دین اور تقوے میں کوئی لغزش آجائے یا آپ گناہ کے گڑھے میں گر پڑیں، تو شیطان کو یہ موقع ہرگز نہ دیجیے کہ وہ آپ کو مایوس کر کے فریب میں مبتلا کر دے۔ اس لغزش کو اپنے دل کے لیے ایک ایسا ذریعہ بنا لیجیے کہ آپ اللہ کی رحمتِ بے پایاں کا پہلے سے کہیں زیادہ عمیق، قلبی اور روحانی مشاہدہ کر سکیں۔ اور پھر اسی رحمت کا دامن تھام کر اپنے گناہوں اور اپنی جان پر کیے گئے تمام تر مظالم سے نجات اور بخشش کی بھیک مانگیے۔

اگر زندگی میں کوئی ایسا مسئلہ آکھڑا ہو جو بظاہر بالکل لاینحل نظر آتا ہو، تو مایوس نہ ہوئیے۔ اس بند گلی میں اللہ کے اسمِ گرامی 'الفَتَّاح' (بند راستوں کو اپنے بندوں کے لیے کھول دینے والی ذات) کے جلوے کا مشاہدہ کیجیے۔ اور اگر آپ کے سر پر غموں کا کوئی طوفان امڈ آئے، تو خود کو اس میں غرق نہ ہونے دیجیے۔ اس طوفان کو اس مشاہدے کا وسیلہ بنائیے کہ جب دور دور تک کوئی سہارا نہ ہو، تو صرف اور صرف وہی خدائے رحیم ہے جو اپنے عاجز بندے کو ہولناک طوفانوں کے بھنور سے بحفاظت نکال لاتا ہے۔

اور یہ بھی یاد رکھیے کہ جب ساری کائنات فنا کے گھاٹ اتار دی جائے گی اور اس کے سوا ایک بھی ذی روح باقی نہ بچے گا، تو اللہ تعالیٰ خود ندا فرمائے گا:

- "لِّمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ؟" (آج کس کی بادشاہی ہے؟) (سورۃ غافر: 16) اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يَوْمَ هُم بَارِزُونَ ۖ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۚ لِّمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ "جس دن وہ سب کھلے میدان میں نکل آئیں گے، اللہ پر ان کی کوئی بات بھی چھپی نہ رہے گی۔ (اللہ فرمائے گا:) آج کس کی بادشاہی ہے؟ (جواب ملے گا:) اللہ ہی کی جو یکتا اور سب پر غالب و قہار ہے!" (سورۃ غافر: 16) آج کس کی بادشاہی ہے؟ اس فانی زندگی ہی کے اندر اس مطلق حاکمیت کی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش کیجیے۔ آج کس کا راج ہے؟ اور کون ہے جو آپ کو بچانے کی طاقت رکھتا ہے؟ اور کون ہے جو آپ کو شفا بخش سکتا ہے؟ اور کون ہے جو آپ کے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑ سکتا ہے؟ اور کون ہے جو آپ کو رزق عطا کر سکتا ہے؟ اور کون ہے جس کے دامنِ رحمت میں آپ پناہ لے سکتے ہیں؟ بتائیے، اس کے سوا اور کون ہے؟ آج کس کی بادشاہی ہے؟ لمن الملک الیوم؟

"لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ" (صرف اللہ کے لیے جو یکتا ہے اور سب پر غالب ہے!)۔ اس کے سوا کسی اور کے دربار کی طرف دوڑنا گویا اس غالب و برتر ہستی سے سرکشی کرنا ہے جس کے آگے سب بے بس ہیں۔ اس خدائے واحد کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف ہاتھ پھیلانا اپنے وجود کو بکھیر دینا ہے، جس کے بعد انسان کبھی باطنی طور پر سیراب نہیں ہو سکتا۔ بھلا اللہ کے سوا کسی اور فانی ہستی میں ہمارے دل، ہماری روح اور ہماری عقل کو جمعیت، کمال اور یکسوئی کیسے نصیب ہو سکتی ہے؟

چنانچہ، اس واپسی کے سفر پر، جہاں سے ہمارا آغاز ہوا تھا، ہم اس کے سوا اور کس کے حضور دوڑ کر جائیں؟ ہم اس کے سوا اور کس کی طلب کریں؟ بہرحال، ہم تمام انسانوں کی دلی تمنا اور آرزو تو بالکل ایک ہی ہے: یعنی یہ کہ ہمارا باطن جڑ جائے، ہم سرشار اور مطمئن ہو جائیں، اور ایک بار پھر فخر سے پکار اٹھیں:

کہ ہم اپنے اصل گھر پہنچ گئے ہیں!

topqna.com

برتن کو خالی کرنا

Emptying the Vessel

اس سے پہلے کہ آپ کسی بھی برتن کو بھر سکیں، آپ کو پہلے اسے خالی کرنا پڑتا ہے۔ ہمارا دل بھی ایک برتن ہے۔ اور کسی بھی برتن کی مانند، دل کو بھی—اس سے پہلے کہ اسے کسی شے سے بھرا جائے—لازماً خالی کرنا ہوگا۔ کوئی انسان کبھی یہ امید نہیں رکھ سکتا کہ وہ اپنے دل کو اللہ کی محبت و معرفت سے بھر لے، جب تک کہ اس کے دل کا یہ برتن اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے سوا غیر اللہ سے اٹا پڑا ہو!

دل کو خالی کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان محبت کرنا ہی چھوڑ دے۔ اس کے برعکس، سچی محبت—جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کا منشا فرمایا ہے—سب سے زیادہ خالص اور شفاف اسی وقت ہوتی ہے جب اس کی بنیاد کسی جھوٹی اور بت نما وابستگی پر نہ ہو۔ دل کو سب سے پہلے خالی کرنے کا یہ سارا عمل کلمۂ شہادت (شہادتِ ایمان) کے پہلے نصف حصے کے اندر واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ ہمارے کلمۂ شہادت کا آغاز ایک نہایت اہم نفی، ایک بنیادی تخلیے اور برتن کو خالی کرنے سے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم حقیقی توحید کے بلند مقام تک پہنچنے کی امید باندھیں، اور اس سے پہلے کہ ہم خدائے واحد پر اپنے پختہ ایمان کا اقرار کر سکیں، ہم سب سے پہلے اعلان کرتے ہیں: "لا إِلٰہ" (کوئی معبود نہیں!)۔ 'الٰہ' کا مطلب ہے وہ ہستی یا شے جس کی پرستش اور عبادت کی جائے۔ لیکن یہ بات ذہن نشین رکھنا ازحد ضروری ہے کہ الٰہ صرف وہی شے نہیں ہوتی جس کے آگے ہم نماز پڑھتے ہیں یا سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ الٰہ تو درحقیقت وہ ہستی یا شے ہے جس کے گرد ہماری پوری زندگی گھومتی ہے، جس کا حکم ہم ہر حال میں بجا لاتے ہیں، اور جو ہمارے نزدیک تمام تر چیزوں پر مقدم اور سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔

یہ وہ شے ہوتی ہے جس کے لیے ہم جیتے ہیں—اور جس کے بغیر ہم جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے!

چنانچہ روئے زمین پر بسنے والا ہر فرد—خواہ وہ دہریہ (ملحد) ہو، لا ادری (تشکیک پسند)، مسلمان ہو، عیسائی ہو یا یہودی—ہر ایک کا کوئی نہ کوئی 'الٰہ' ضرور ہوتا ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی چیز کی بندگی کر رہا ہے۔ اکثر انسانوں کے

لیے ان کا یہ معبود اور الٰہ اسی دنیا کی کوئی نہ کوئی فانی شے ہوتی ہے۔ بعض لوگ دولت کے پجاری ہوتے ہیں، بعض جاہ و منصب کی پوجا کرتے ہیں، بعض شہرت اور نام و نمود کو پوجتے ہیں، اور بعض اپنی ہی عقل اور فہم کی پرستش میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ دوسرے انسانوں کو اپنا خدا بنا لیتے ہیں۔ اور بے شمار لوگ ایسے ہیں، جیسا کہ قرآنِ مجید نے ان کا نقشہ کھینچا ہے، جو اپنی ہی خودی، اپنی ہی نفسانی خواہشات اور ترنگوں کو اپنا معبود بنا بیٹھتے ہیں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿ أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَن يَهْدِيهِ مِن بَعْدِ اللَّهِ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴾ "بھلا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش ہی کو اپنا معبود بنا لیا ہے؟ اور اللہ نے (اس کے باطن کو) جانتے ہوئے اسے گمراہی میں ڈال دیا، اور اس کے کان اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ پس اللہ کے بعد اب اسے کون ہدایت دے سکتا ہے؟ کیا تم پھر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے؟" (سورۃ الجاثیۃ: 23) پرستش اور بندگی کی یہ تمام اشیاء دراصل وہی چیزیں ہیں جن سے ہم اندھی قلبی وابستگی قائم کر لیتے ہیں۔ تاہم جس چیز سے دل لگ جائے، وہ محض ایسی شے نہیں ہوتی جس سے ہم محبت کرتے ہوں؛ بلکہ وہ ایسی شے بن جاتی ہے جس کی ہمیں اس لفظ کے گہرے ترین مفہوم میں شدید اور ناگزیر ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ایسی چیز بن جاتی ہے کہ اگر وہ ہاتھ سے چھوٹ جائے، تو انسان کے اندر مکمل تباہی اور قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ اگر اللہ کے سوا کوئی بھی ایسی چیز—یا کوئی بھی ایسا انسان ہے—جسے ہم کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں، تو سمجھ لیجیے کہ ہم ایک جھوٹی، شرک آمیز اور باطل وابستگی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اپنے چہیتے لختِ جگر کی قربانی کا حکم کیوں دیا گیا تھا؟ وہ حکم اس لیے دیا گیا تھا تاکہ ان کے قلبِ اطہر کو آزاد کیا جا سکے۔ تاکہ انہیں ایک باطل قلبی وابستگی سے رہائی دلائی جا سکے۔ اور جونہی ان کا دل اس ظاہری بندھن سے بالکل آزاد اور یکسو ہو گیا، تو ان کی محبت کی وہ متاع (یعنی ان کا بیٹا، جو اب وابستگی نہیں بلکہ خالص محبت تھی) انہیں صحیح سلامت واپس لوٹا دی گئی!

اگر کائنات میں کوئی بھی ایسی شے—یا کوئی بھی ایسا شخص ہے—جس کی جدائی اور محرومی ہمیں اندر سے مکمل طور پر توڑ کر خاک میں ملا دے، تو جان لیجیے کہ ہم ایک باطل وابستگی کا شکار ہیں۔ جھوٹی اور باطل

وابستگیاں وہ چیزیں ہوتی ہیں جنہیں کھو دینے کا خوف ہمارے دلوں پر ایک پاگل پن اور بیماری کی حد تک طاری رہتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہوتی ہے کہ اگر ہمیں ذرا سا بھی محسوس ہو کہ وہ ہم سے دور کھسک رہی ہے، تو ہم دیوانہ وار اس کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ ہم اس کے تعاقب میں اس لیے دوڑتے ہیں کیونکہ کسی ایسی شے کا چھن جانا ہماری روح میں مکمل تباہی مچا دیتا ہے، اور اس تباہی اور عذاب کی شدت کا براہِ راست تعلق ہماری اس باطل وابستگی کے درجے سے ہوتا ہے۔ یہ قلبی وابستگیاں پیسوں سے ہو سکتی ہیں، ہماری مادی جائیداد سے، فانی انسانوں سے، کسی خاص نظریے یا آئیڈیالوجی سے، جسمانی لذتوں سے، کسی نشے سے، شان و شوکت اور اسٹیٹس سمبلز سے، ہمارے کیریئر اور ملازمت سے، معاشرے میں ہمارے امیج اور تاثر سے کہ لوگ ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہیں، ہماری جسمانی خوبصورتی یا ظاہری حسن سے، ہمارے لباس اور فیشن کے انداز سے، ہماری تعلیمی ڈگریوں سے، ہمارے دفتری عہدوں اور خطابات سے، معاملات پر ہر وقت اپنا کنٹرول رکھنے کے احساس سے، یا پھر ہماری اپنی عقل، فہم اور منطق پسندی سے! لیکن جب تک ہم ان باطل اور بت نما وابستگیوں کے جال کو توڑ نہیں ڈالتے، ہم اپنے دل کے برتن کو کبھی خالی نہیں کر سکتے۔ اور اگر ہم نے دل کے اس برتن کو خالی نہ کیا، تو ہم کبھی بھی اس میں حقیقی معنوں میں اللہ کے انوار و تجلیات کو نہیں سما سکیں گے۔

اپنے دل کو تمام باطل اور غیر شرعی وابستگیوں سے آزاد کرانے کی یہ مسلسل جدوجہد، اور دل کے برتن کو غیر اللہ سے پاک اور خالی کرنے کی یہ کشمکش، اس دنیاوی زندگی کی سب سے عظیم اور فیصلہ کن جنگ (جہادِ اکبر) ہے۔ یہی مجاہدہ توحیدِ خالص کی اصل روح اور مغز ہے۔ اور چنانچہ اگر آپ گہری بصیرت سے جائزہ لیں، تو آپ پر یہ راز کھلے گا کہ اسلام کے پانچوں ارکان بنیادی طور پر دنیا سے دل کو الگ اور آزاد کرنے (detachment) ہی کے گرد گھومتے ہیں اور اسی کی تربیت دیتے ہیں:

۱۔ کلمۂ شہادت (ایمان کا اقرار): شہادتِ حق دراصل اسی باطنی آزادی اور تخلیے کا زبانی اقرار ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ہم کوشاں ہیں: یعنی یہ کہ ہماری بندگی، ہماری حتمی اور والہانہ محبت، ہماری تمام تر امیدوں اور تمام تر خوف و خشیت کا واحد مرکز صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے۔ صرف اور صرف اللہ!

اپنے وجود کو خالقِ کائنات کی ذات کے سوا دنیا کی ہر فانی وابستگی کے جال سے آزاد کرا لینا ہی درحقیقت توحید کا سب سے سچا، شفاف اور کامل مظہر ہے۔

۲۔ نماز (پنج وقتہ نمازیں): دن میں پانچ مرتبہ ہمیں اس فانی دنیا سے اپنا دامن چھڑا کر الگ ہونا پڑتا ہے تاکہ ہم اپنے خالق اور اپنی زندگی کے حتمی مقصد پر اپنی توجہ یکسو کر سکیں۔ دن میں پانچ بار ہم دنیاوی مصروفیات کی جس جھنجھٹ میں بھی الجھے ہوں، اس سے خود کو کاٹ کر اللہ کے حضور جھک جاتے ہیں۔ نماز کا حکم صرف دن یا ہفتے میں ایک بار بھی دیا جا سکتا تھا، یا پانچوں نمازیں دن کے کسی ایک ہی وقت میں ادا کرنے کا حکم بھی ہو سکتا تھا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ نمازوں کو پورے دن کے مختلف اوقات پر پھیلا دیا گیا ہے۔ اگر انسان اپنے اوقات پر نمازوں کی پابندی کا اہتمام کرے، تو اسے دنیاوی معاملات سے حد سے زیادہ دل لگانے کا کوئی موقع ہی نہیں ملتا۔ جونہی ہم دنیا کے کسی بھی فریب میں غرق ہونے لگتے ہیں (چاہے وہ ہماری نوکری ہو، ٹی وی پر دیکھا جانے والا کوئی شو ہو، امتحانات کی تیاری ہو، یا وہ شخص جو ہمارے دماغ پر سوار ہو چکا ہو)، ہم پر لازم کر دیا جاتا ہے کہ ہم فوراً اس سے اپنا دامن چھڑائیں اور اپنے دل کا رخ اس واحد اور حقیقی ذات کی طرف موڑ لیں جو لائقِ پرستش اور لائقِ بندگی ہے۔

۳۔ صیام (ماہِ رمضان کے روزے): روزہ تو سراسر دنیاوی تعلقات اور جسمانی لذتوں سے دل کو الگ کرنے اور تجرید کا نام ہے۔ یہ کھانے، پینے، صنفی قربت، اور لغو و بے ہودہ کلام سے دامن کش رہنے کی مشق ہے۔ اپنے جسمانی اور حیوانی تقاضوں کو لگام دے کر ہم اپنے باطن کی روحانی خودی کو پاکیزہ، معزز اور بلند تر بناتے ہیں۔ روزے کے ذریعے ہم مجبور ہوتے ہیں کہ ہم اپنی جسمانی ضروریات، شہوات اور وقتی لذتوں کے بندھنوں سے خود کو آزاد کریں۔

۴۔ زکوٰۃ (مالی ایثار): زکوٰۃ کا سارا فلسفہ اپنے دل کو مال و دولت کے موہ اور لالچ سے آزاد کرانا اور اسے محض اللہ کی رضا کی خاطر دوسروں پر لٹانا ہے۔ اپنی محنت کی کمائی میں سے دوسروں کا حق ادا کر کے، ہم اس بات پر مجبور کیے جاتے ہیں کہ ہم اپنے دل کے اندر سے دولت کی بت پرستی اور اس کے ساتھ بیمار وابستگی کو پاش پاش کر دیں۔

۵۔ حج (بیت اللہ کی زیارت): حج درحقیقت دنیا سے تمام تر تعلقات توڑ لینے اور تجرید اختیار کرنے کا سب سے جامع، ہمہ گیر اور عمیق ترین عمل ہے۔ ایک حاجی اپنی زندگی کی ہر ہر چیز کو اپنے پیچھے چھوڑ آتا ہے۔ وہ اپنے چہیتے خاندان کو، اپنے پرآسائش گھر کو، اپنی لاکھوں کی تنخواہ اور بینک بیلنس کو، اپنے مخملی اور گرم بستر کو، اپنے قیمتی جوتوں اور برانڈڈ پوشاکوں کو تج دیتا ہے؛ اور ان سب کے بدلے کھلے میدان کی مٹی پر یا بھیڑ بھرے خیمے میں راتیں گزارتا ہے، اور اس کا سارا لباس صرف دو سادہ، ان سلے سفید کپڑوں کے ٹکڑوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ حج کے میدان میں دنیا کے اسٹیٹس اور طبقاتی امتیازات کا کوئی نام و نشان نہیں رہتا۔ وہاں نہ تو ٹامی ہلفیگر (Tommy Hilfiger) کا کوئی برانڈڈ احرام ہوتا ہے، اور نہ ہی کوئی فائیو اسٹار خیمے ! (حج کے جو پیکجز فائیو اسٹار ہوٹلوں کے اشتہار دیتے ہیں، وہ دراصل حج سے پہلے یا بعد کے دنوں کی بات کر رہے ہوتے ہیں۔ حج کے اصل ایام کے دوران تو آپ کو منیٰ کے عام خیموں میں سونا پڑتا ہے، اور مزدلفہ میں کھلے آسمان تلے ننگی زمین پر رات گزارنی ہوتی ہے !)۔

ذرا اس حقیقت پر غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بے پایاں حکمت اور رحمت کے تحت ہم سے محض یہ نہیں فرمایا کہ تم دنیا سے اپنے دل کو آزاد کر لو—بلکہ اس نے ہمیں واضح طور پر وہ راستہ بھی دکھا دیا کہ یہ کیونکر ممکن ہے۔ ان پانچ ارکانِ اسلام سے آگے بڑھ کر، ہمارا اسلامی لباس اور حلیہ تک ہمارے اندر دنیا سے بے نیازی اور تجرید پیدا کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ہمیں واضح حکم فرمایا ہے کہ ہم بھیڑ کی اندھی پیروی کرنے کے بجائے اپنا ایک الگ اور ممتاز تشخص قائم کریں، حتیٰ کہ اپنے ظاہری حلیے اور پوشاک میں بھی۔ جب آپ حجاب اوڑھتی ہیں، سر پر ٹوپی رکھتے ہیں، یا چہرے پر سنتِ نبوی کے مطابق داڑھی سجاتے ہیں، تو آپ چاہیں بھی تو اس فانی دنیا کے ہجوم میں اندھوں کی طرح گھل مل نہیں سکتے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمانِ عالیشان ہے: «بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا، وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ غَرِيبًا، فَطُوبَىٰ لِلْغُرَبَاءِ» ”اسلام کا آغاز اجنبیت کے عالم میں ہوا تھا، اور عنقریب یہ اسی طرح اجنبی بن جائے گا جیسے شروع ہوا تھا؛ پس خوشخبری اور مبارکباد ہے ان اجنبیوں کے لیے !“ (صحیح مسلم) اس فانی دنیا میں ایک 'اجنبی' کی مانند بن کر رہنے ہی کی بدولت ہم اس دنیا میں تو رہ سکتے ہیں، مگر اس دنیا کو اپنے دل میں بسائے بغیر! اور دنیا سے دل کی اسی آزادی اور تجرید کے ذریعے ہی ہم اپنے دل کے برتن کو اس لائق بنا سکتے ہیں کہ وہ اس شے کے لیے خالی ہو سکے جو اسے حقیقی غذا بخشتی ہے اور اسے حیاتِ نو عطا کرتی ہے۔ اپنے دل کو خالی کر کے، ہم اسے اس کی حقیقی غذا کے لیے تیار کرتے ہیں:

اور وہ غذا صرف اور صرف اللہ ہے!

topqna.com

عطا کی محبت میں

For the Love of the Gift

ہم سب کو تحفے اور عطائیں بے حد پسند ہوتی ہیں۔ ہم ان تمام نعمتوں سے پیار کرتے ہیں جو ہماری زندگیوں کو حسن اور رونق بخشتی ہیں۔ ہم اپنی اولاد سے، اپنے شریکِ حیات سے، اپنے والدین سے، اور اپنے دوستوں سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ ہم اپنی جوانی اور اپنی صحت کو عزیز رکھتے ہیں۔ ہمیں اپنے خوبصورت گھر، شاندار گاڑیاں، مال و دولت اور اپنا حسن و جمال بہت پیارا لگتا ہے۔ لیکن کیا ہوتا ہے جب کوئی تحفہ یا عطا محض ایک تحفہ رہنے کے بجائے اس سے کہیں آگے نکل جائے؟ کیا ہوتا ہے جب دل کی کوئی معمولی سی خواہش انسان کی ناگزیر ضرورت کا روپ دھار لے، اور کوئی احسان و نوازش انسان کے لیے اندھے انحصار اور بیساکھی میں بدل جائے؟ تب کیا بنتا ہے جب کوئی عطا صرف عطا نہ رہے؟

تحفہ یا عطا دراصل ہوتی کیا ہے؟ تحفہ وہ شے ہے جو ہم نے خود پیدا نہیں کی، نہ وہ ہماری اپنی ذاتی ملکیت تھی۔ تحفہ تو وہ ہے جو کسی دوسرے کی طرف سے عنایت کیا جاتا ہے—اور جسے کسی بھی وقت واپس بھی لیا جا سکتا ہے۔ ہم کسی تحفے کے ازلی و ابدی مالک نہیں ہوتے۔ اسی طرح کوئی تحفہ ہمارے زندہ رہنے کے لیے ناگزیر شرط بھی نہیں ہوتا۔ یہ آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ ہم تحائف کو پانا چاہتے ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں —مگر ہماری سانسوں کا تسلسل ان کے وجود سے مشروط نہیں ہے۔ ہم ان کے محتاج نہیں ہیں۔ نہ تو ہم صرف تحائف حاصل کرنے کے لیے دنیا میں جی رہے ہیں، اور نہ ہی ان کے چھن جانے سے ہم مرجایا کرتے ہیں۔ وہ نہ تو ہمارے لیے ہوا ہیں اور نہ ہی ہماری خوراک، مگر اس کے باوجود ہم ان سے دل لگائے بیٹھے ہیں۔ بھلا تحفے سے کسے پیار نہیں ہوتا؟ کون ہے جو ڈھیروں انعامات پانے کی تمنا نہیں رکھتا؟ اور ہم بھی اس ذاتِ کریم (سب سے زیادہ سخاوت فرمانے والے رب) سے یہی مانگتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنی رحمتوں اور نعمتوں سے کبھی محروم نہ کرے۔ لیکن اس سب کے باوجود، کسی تحفے کو کبھی بھی اپنے توکل اور انحصار کا مرکز نہیں بننا چاہیے، اور نہ ہی ان کے بغیر ہماری زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

ہمیشہ یاد رکھیے کہ کسی بھی شے کو تھامنے اور سنبھالنے کے لیے صرف دو ہی جگہیں ہوتی ہیں: یا تو ہاتھ میں، یا پھر دل میں ! ہم کسی تحفے یا عطا کو کہاں رکھتے ہیں؟ تحفے کو کبھی دل کے اندر بٹھایا نہیں جاتا۔ اس کی اصل جگہ ہاتھ ہے۔ چنانچہ جب وہ تحفہ ہاتھ سے لے لیا جاتا ہے، تو اس کے چھن جانے کا درد صرف ہاتھ کو ہوتا ہے—وہ درد دل کو زخمی نہیں کرتا ! اور جس شخص نے بھی اس دنیاوی زندگی میں چند دن گزارے ہیں، وہ بخوبی جانتا ہے کہ ہاتھ کا درد کبھی دل کے درد جیسا نہیں ہوتا۔ دل کا درد تو اس وقت اٹھتا ہے جب انسان سے وہ شے چھن جائے جس سے اس نے بتوں کی طرح دل لگا رکھا ہو، جس کا اسے نشہ ہو چکا ہو، اور جس کا وہ محتاج بن چکا ہو۔ وہ درد کسی دوسرے عام درد جیسا نہیں ہوتا۔ وہ کوئی معمولی تکلیف نہیں ہوتی۔ اور وہی روح فرسا درد دراصل اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ ہم نے ابھی ابھی اپنی کسی غلط وابستگی کو کھویا ہے—یعنی ایک ایسا تحفہ جسے ہم نے ہاتھ میں رکھنے کے بجائے غلطی سے اپنے دل کے تخت پر بٹھا دیا تھا !

ہاتھ میں ہونے والا درد بھی یقیناً ایک درد ہے—لیکن وہ بالکل مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔ بے حد مختلف ! ہاتھ کے درد کا مطلب کسی ایسی چیز کا کھو جانا ہے جس پر ہماری روح کا دارومدار نہیں تھا۔ جب کوئی تحفہ ہاتھ سے چھین لیا جائے—یا سرے سے کبھی دیا ہی نہ جائے—تو ہم بحیثیتِ انسان ایک فطری رنج و ملال محسوس کرتے ہیں۔ ہم اداس ہوتے ہیں۔ ہماری آنکھوں سے آنسو بھی بہتے ہیں۔ لیکن وہ چوٹ صرف ہاتھ تک محدود رہتی ہے؛ ہمارا دل صحیح سلامت اور اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دھڑکتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل تو صرف اور صرف اللہ ہی کے لیے خاص ہے۔

اور صرف اسی خدائے واحد کے لیے !

اگر ہم اپنی زندگی کی ان تمام چیزوں کا دیانت داری سے جائزہ لیں جو ہمارے اندر سب سے زیادہ خوف یا درد کو جنم دیتی ہیں، تو ہم باآسانی اس بات کی نشاندہی کر سکتے ہیں کہ ہم نے کن کن نعمتوں کو غلط جگہ پر سجا رکھا ہے۔ اگر شادی نہ ہو پانا، اپنی پسند کے انسان کے ساتھ زندگی نہ گزار سکنا، بے اولادی کا غم، نوکری کا نہ ملنا، کسی خاص فیشن یا ظاہری حلیے میں نہ ڈھل سکنا، کوئی خاص ڈگری نہ پا سکنا، یا معاشرے میں کسی اونچے منصب تک نہ پہنچ پانا ہمارے اندرونی سکون کو نگل چکا ہے اور ہمیں جیتے جی مار رہا ہے، تو ہمیں فوراً خود کو بدلنے کی

ضرورت ہے۔ ہمیں اس بات کو بدلنا ہوگا کہ ہم نے اس نعمت کو کہاں محفوظ کر رکھا ہے؛ ہمیں اس تحفے کو اپنے دل کے تخت سے اٹھا کر واپس اپنے ہاتھ میں لانا ہوگا جہاں اس کی اصل اور جائز جگہ ہے !

ہم ان تمام پاکیزہ چیزوں سے محبت کر سکتے ہیں۔ محبت کرنا تو انسان کی سرشت میں ہے۔ اور جن نعمتوں سے ہم پیار کرتے ہیں ان کی خواہش رکھنا بھی عینِ انسانی فطرت ہے۔ لیکن ہماری اصل مصیبت اس وقت شروع ہوتی ہے جب ہم اللہ کے تحفے کو اپنے دل میں بٹھا لیتے ہیں، اور خود اللہ کو اٹھا کر اپنے ہاتھ میں رکھ دیتے ہیں ! کتنے دکھ اور ستم ظریفی کی بات ہے کہ ہم نادانی میں یہ یقین کر بیٹھتے ہیں کہ ہم اللہ کے بغیر تو زندہ رہ سکتے ہیں— لیکن اگر اس کا دیا ہوا کوئی فانی تحفہ ہم سے چھوٹ جائے، تو ہم پاش پاش ہو جاتے ہیں اور آگے جینے کی ہمت ہار بیٹھتے ہیں !

اس المیے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم بڑی آسانی اور بے دردی سے اللہ کے احکامات کو ایک طرف اٹھا کر رکھ دیتے ہیں، مگر ہمارا دل اس فانی تحفے کے بغیر ایک پل بھی زندہ رہنے کو تیار نہیں ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اس دنیاوی تحفے کی خاطر خود اپنے پروردگار کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے لیے نماز کو قضا کر دینا یا چھوڑ دینا تو بہت آسان ہو جاتا ہے، مگر ہمارا دل کہتا ہے کہ خبردار، میری دفتری میٹنگ، میری موویٔ، میری پکنک، میری شاپنگ، میری کلاس، میری پارٹی یا باسکٹ بال کا میچ مجھ سے نہ چھٹنا چاہیے ! ہمارے لیے سودی قرضے لینا یا شراب اور حرام اشیاء کا کاروبار کرنا تو آسان بن جاتا ہے، بس شرط یہ ہے کہ میرے منافع کی شرح اور میرا اونچا کیریئر مجھ سے نہ چھنے ! بس میری وہ چمچماتی نئی گاڑی اور پرشکوہ محل نما بنگلہ مجھ سے دور نہ ہو ! ہمارے لیے کسی کے ساتھ نامحرم اور حرام تعلقات استوار کرنا اور ڈیٹ پر جانا تو آسان ہو جاتا ہے، مگر ہمارا دل پکارتا ہے کہ بس جس سے مَیں نام نہاد 'محبت' کرتا ہوں وہ مجھ سے جدا نہ ہو ! ہمارے لیے حجاب کو اتار پھینکنا یا پردے سے غافل ہو جانا تو بہت آسان ہو جاتا ہے—بس میری خوبصورتی، میرا جلوۂ حسن، میرے لیے آنے والے شادی کے رشتے، اور لوگوں کے سامنے میرا فیشن ایبل تاثر مجھ سے نہ چھنے ! ہمارے لیے حیا اور شرم کے اس پاکیزہ لباس کو اتار دینا تو آسان ہو جاتا ہے جسے اللہ نے اصل حسن قرار دیا ہے، لیکن ہم کہتے ہیں کہ مجھے میری اس تنگ اور چست جینز سے محروم نہ کیا جائے—کیونکہ اس فانی معاشرے نے میرے ذہن میں یہ ٹھونس دیا ہے کہ یہی اصل خوبصورتی ہے !

یہ سب اس لیے ہوتا ہے کیونکہ وہ دنیاوی تحفہ ہمارے دل کے اندر جا بیٹھا ہے، جبکہ ہم نے اللہ کو محض اپنے ہاتھ میں تھما رکھا ہے۔ اور جو شے ہاتھ میں ہو، اسے تو کسی بھی وقت آسانی سے نیچے رکھ دیا جاتا ہے۔ جب کہ جو شے دل میں رچ بس جائے، اس کے بغیر انسان جی ہی نہیں سکتا—اور اسے پانے کے لیے وہ دنیا و آخرت کی ہر قیمتی چیز قربان کرنے پر تل جاتا ہے۔ لیکن جلد یا بدیر، ہمیں اپنے گریبان میں جھانک کر اپنے آپ سے یہ فیصلہ کن سوال پوچھنا ہی ہوگا کہ ہم درحقیقت کس کی پوجا کر رہے ہیں: اللہ کے دیے ہوئے تحفے کی یا خود منعمِ حقیقی (عطا کرنے والے رب) کی؟ اس فانی خوبصورتی کی یا اس ذات کی جو تمام تر حسن و جمال کا سرچشمہ اور خالق ہے؟ رزق کی یا رزاقِ کائنات کی؟

ایک فانی مخلوق کی، یا کائنات کے خالقِ اکبر کی؟

ہمارے اس غلط اور اندھے انتخاب کا المیہ یہ ہے کہ ہم دنیاوی وابستگیوں کے آہنی طوق خود اپنے گلے میں ڈال لیتے ہیں، اور پھر روتے ہیں کہ ہمارا دم کیوں گھٹ رہا ہے! ہم اپنی اصل اور حقیقی روحانی آکسیجن کو خود اپنے ہاتھوں سے ترک کر دیتے ہیں، اور پھر حیران ہوتے ہیں کہ ہمیں سانس کیوں نہیں آ رہی! ہم اپنی روح کی واحد غذا کو اپنے ہاتھوں سے لٹا دیتے ہیں، اور پھر شکوہ کرتے ہیں کہ ہم بھوک سے تڑپ تڑپ کر کیوں مر رہے ہیں! آخرکار، خنجر بھی ہم خود ہی اپنے سینے میں گھونپتے ہیں اور پھر چیخ و پکار کرتے ہیں کہ ہائے، یہ کتنا دردناک ہے! کتنا بے پناہ درد! لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ ہم نے جو کچھ بھی کیا، خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے ساتھ کیا ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿ وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ ﴾ "اور تمہیں جو بھی مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی کے سبب ہے، اور وہ تو بہت سی کوتاہیوں سے درگزر فرما دیتا ہے۔" (سورۃ الشوریٰ: 30) ہاں! سچ یہی ہے کہ ہم نے جو کچھ کیا، اپنے ہی ساتھ کیا۔ لیکن ذرا دیکھیے کہ اس آیت کا اختتام کن پیارے کلمات پر ہوتا ہے: "وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ" (اور وہ بہت سے گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے!)۔ یہاں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ 'یعفو' ہے، جو اللہ تعالیٰ کی صفتِ جلیلہ 'العَفُوّ' سے ماخوذ ہے۔ اس کا مفہوم محض معاف کر دینا یا درگزر کرنا ہی نہیں، بلکہ گناہ اور خطاؤں کے نشان تک کو جڑ سے مٹا دینا ہے! چنانچہ ہم نے

چاہے کتنی ہی بار نادانی میں وہ خنجر اپنے ہی سینے میں کیوں نہ گھونپ لیا ہو، اللہ تعالیٰ ہمارے اس زخم کو اس طرح مندمل اور شفایاب کرنے پر قادر ہے—گویا کہ وہ وار کبھی ہوا ہی نہ تھا! 'الجَبَّار' (ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دینے والی ذات) اس دل کو پھر سے مکمل کر سکتی ہے۔

بشرطیکہ تم سچے دل سے اسی کی بارگاہ میں رجوع کرو!

لیکن ذرا سوچیے، وہ شخص کتنا بڑا بیوقوف اور نادان ہوگا جو چند سانسوں کی آکسیجن کے بدلے ایک خوبصورت ہار کا سودا کر لے؟ یہ تو اس شخص کی مانند ہے جو کہے کہ: "بس مجھے یہ گلے کا ہار دے دو، اس کے بعد تم چاہے مجھ سے میری آکسیجن ہی کیوں نہ چھین لو! میرا گلا گھونٹ دو، میرا دم نکال دو، بس مرتے وقت یہ چمچماتا ہار میرے گلے میں سجا ہونا چاہیے!"

اور سب سے بڑا ستم تو یہ ہے کہ درحقیقت وہ گلے کا ہار ہی وہ پھندا بن جاتا ہے جو ہمارا دم گھونٹ ڈالتا ہے! یہ ہماری اپنی ہی وہ باطل وابستگیاں ہیں—وہ اشیاء اور انسان جنہیں ہم نے اللہ سے بڑھ کر اپنے دل میں جگہ دے رکھی ہے—جو آخرکار ہماری روح کا گلا گھونٹ کر ہمیں ہلاک کر دیتی ہیں!

ہماری اصل تباہی اس دن شروع ہوئی جب ہم نے اس عطا کو ہی اپنی زندگی کی آکسیجن سمجھ لیا، بجائے اس کے کہ ہم اسے اس کی اصل حیثیت میں دیکھتے: یعنی محض ایک عارضی تحفہ! چنانچہ اپنی اس باطنی اندھی پن کی وجہ سے، ہم اس تحفے کے دستِ نگر اور محتاج بن گئے، اور ہم نے اپنی حقیقی آکسیجن (اللہ کے تعلق) کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ جب وہ تحفہ ہم سے واپس لے لیا گیا، یا سرے سے دیا ہی نہ گیا، تو ہم نے گمان کر لیا کہ اب ہم مزید زندہ نہیں رہ سکتے۔ لیکن یہ وہ سفید جھوٹ تھا جو ہم نے خود اپنے آپ سے بولا، یہاں تک کہ خود ہی اس پر ایمان لے آئے! یہ سچ نہیں ہے۔ کائنات میں صرف ایک ہی نقصان ایسا ہے جس کا کوئی مداوا نہیں اور جس سے انسان کبھی سنبھل نہیں سکتا۔ زندگی میں آگے نہ بڑھ سکنے کی صرف اور صرف ایک ہی حقیقی وجہ ہو سکتی ہے: یعنی یہ کہ اگر ہم نے اپنی زندگی میں سے اللہ کو ہی کھو دیا ہو! اور ستم ظریفی دیکھیے کہ ہم میں سے کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو اپنی زندگیوں سے اپنے پروردگار کو کھو چکے ہیں اور اس کے باوجود یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ وہ زندہ ہیں! اللہ کی دی ہوئی فانی نعمتوں پر ہمارے جھوٹے انحصار اور تکیے نے ہمیں کس قدر ہولناک فریب میں مبتلا کر رکھا ہے۔

صرف اور صرف اللہ کی ذات ہی ہماری حقیقی بقا اور زندگی کی ضامن ہے۔ اس کے دیے ہوئے تحائف نہیں۔ اللہ ہی ہمارا واحد سہارا اور ہماری واحد ناگزیر ضرورت ہے۔ اللہ رب العزت کا فرمان ہے:

﴿ أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ ۖ وَيُخَوِّفُونَكَ بِالَّذِينَ مِن دُونِهِ ۚ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴾ "کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ اور وہ آپ کو اللہ کے سوا دوسروں سے ڈراتے ہیں! اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو اس کے لیے کوئی راہ دکھانے والا نہیں ہے۔" (سورۃ الزمر: 36) ہم سب کی زندگی میں کچھ جائز ضروریات ہوتی ہیں اور کچھ خواہشات۔ ہماری اصل روحانی اذیت اس وقت شروع ہوتی ہے جب ہم اپنی عارضی خواہشات کو اپنی لازمی 'ضرورت' کا درجہ دے دیتے ہیں، اور اپنی واحد حقیقی ضرورت (یعنی ذاتِ باری تعالیٰ) کو ایک ایسی ثانوی شے سمجھ بیٹھتے ہیں جس کے بغیر بھی ہمارا کام چل سکتا ہے۔ ہمارا اصل دکھ اس وقت جنم لیتا ہے جب ہم راستے کے 'وسیلے' اور اپنی اصل 'منزل' کے درمیان خلط ملط کر بیٹھتے ہیں۔ پوری کائنات میں صرف اللہ کی ذات ہی اصل اور حتمی 'منزل' ہے۔ اس کے سوا ہر ہر چیز محض اس منزل تک پہنچنے کا ایک 'ذریعہ اور وسیلہ' ہے۔ ہم اسی لمحے کرب و اذیت کی بھٹی میں جھونک دیے جاتے ہیں جس پل ہماری نگاہ اپنی اصل منزل سے ہٹ کر راستے کے اسباب اور وسائل کے اندر گم ہو جاتی ہے۔

بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی ہر نعمت اور تحفے کا اصل مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب تر لے آئے۔ خود وہ تحفہ بھی تو دراصل ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ مثال کے طور پر، کیا رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ نکاح اور شادی انسان کے نصف دین کی تکمیل ہے؟ آخر ایسا کیوں ہے؟ اگر اس رشتے کو اس کے درست مقصد کے تحت نبھایا جائے، تو اس دنیاوی زندگی کا شاید ہی کوئی دوسرا پہلو ایسا ہو جو انسان کے اخلاق اور کردار کی تعمیر پر اس قدر ہمہ گیر، گہرا اور انقلابی اثر مرتب کر سکتا ہو۔ آپ کتابوں میں صبر، شکر، رحمت، عاجزی، سخاوت، ایثارِ نفس، اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دینے جیسی عظیم صفات کے فضائل تو پڑھ سکتے ہیں؛ لیکن جب تک آپ کو عملی زندگی کے کسی ایسے کٹھن میدان میں نہ اتارا جائے جہاں ان تمام اوصاف کا کڑا امتحان ہو، تب تک آپ کے اندر یہ اوصاف کبھی پروان نہیں چڑھ سکتے۔

شادی جیسے پاکیزہ تحائف آپ کو اللہ کے قریب تر لانے کا ایک بہترین وسیلہ ثابت ہوں گے—مگر صرف اس وقت تک جب تک وہ محض ایک 'وسیلہ' رہیں، اور خود اصل 'منزل' نہ بن جائیں! اللہ کے تمام تحائف اس وقت تک اس کے قرب کا ذریعہ بنے رہتے ہیں جب تک انہیں ہاتھ میں سنبھال کر رکھا جائے، دل کے اندر نہ بسایا جائے۔ ہمیشہ یاد رکھیے کہ جو شے بھی دل کے تخت پر بیٹھ جاتی ہے، وہی آپ کی حاکم بن جاتی ہے اور آپ پر حکمرانی کرتی ہے۔ وہی شے انسان کی تگ و دو کا مرکز بن جاتی ہے اور انسان اسے پانے اور سنبھالنے کے لیے ہر شے لٹانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ وہی انسان کے باطن کا بنیادی سہارا بن جاتی ہے۔ چنانچہ اس مقام پر تو صرف اسی ذات کو ہونا چاہیے جو ابدی ہو، جو کبھی تھکتی نہ ہو، اور جو کبھی ٹوٹتی نہ ہو۔ اسے لازماً ایسی ہستی ہونا چاہیے جو کبھی چھوڑ کر نہ جائے اور جسے کبھی زوال نہ آئے۔ اور پوری کائنات میں ایسی صفت رکھنے والی صرف اور صرف ایک ہی ذات ہے: اور وہ ہے ہمارا خالقِ اکبر!

topqna.com

چھت پر سکون کی تلاش

Peace on a Rooftop

ہم سب کی زندگی میں بعض لمحات ایسے آتے ہیں جو شدت اور گہرائی سے لبریز ہوتے ہیں۔ میرے لیے ایسا ہی ایک بے پایاں لمحہ اس وقت آیا جب مَیں مسجدِ حرام کی چھت پر کھڑی تھی۔ میرے اوپر صرف نیلا آسمان تھا، اور میرے نیچے کعبۃ اللہ کا وہ مسحور کن اور روح پرور نظارہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس فانی دنیا، اور آنے والی ابدی آخرت کی ایک درخشاں نشانی بن کر جلوہ گر تھا۔ یوں تو میرے اردگرد انسانوں کا ایک بے پناہ اور ٹھاٹھیں مارتا ہوا ہجوم تھا—ایک ایسا بے مثل مجمع جس کی مثال روئے زمین پر کہیں اور نہیں مل سکتی —لیکن میرے لیے کیفیت یہ تھی گویا مَیں وہاں بالکل اکیلی اور تنہا کھڑی ہوں۔ صرف اور صرف اپنے اللہ کے ساتھ !

مَیں مسجدِ حرام کی اس چھت پر اپنے ساتھ بے شمار صدمات، دل کا کرب، الجھنیں اور شکوک و شبہات لے کر آئی تھی۔ مَیں بے پناہ کمزوریوں، بشری ناتوانی، اور روح کے ناسوروں کے ساتھ وہاں پہنچی تھی۔ اپنی زندگی کے ایک نازک دو راہے پر کھڑی، مَیں اپنے ساتھ آنے والے کل کا اندیشہ و خوف، اور آئندہ کے امکانات کی لرزتی ہوئی امیدیں تھامے ہوئے تھی۔ چنانچہ جب مَیں اس چھت پر کھڑی تھی، تو مجھے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا وہ واقعہ یاد آگیا جب وہ بحرِ احمر کے کنارے لا کھڑے کیے گئے تھے۔ ان کی ظاہری اور مادی آنکھیں تو بس پانی کی ایک دیوار دیکھ رہی تھیں جس نے انہیں محصور کر رکھا تھا، جب کہ پیچھے سے فرعون کا خونخوار لشکر تیزی سے امڈتا چلا آ رہا تھا؛ لیکن ان کی باطنی اور روحانی نگاہیں صرف اور صرف اللہ کی نصرت دیکھ رہی تھیں، اور انہیں نجات کا راستہ اتنا یقینی اور روشن دکھائی دے رہا تھا گویا وہ پہلے ہی اس راہ پر قدم رکھ چکے ہوں ! جب ان کی قوم کے لوگ—جو یقین اور توکل کی دولت سے یکسر محروم تھے—چیخ رہے تھے کہ ہم تو پکڑے گئے، اس پرآشوب لمحے میں بھی موسیٰ علیہ السلام کے پائے ثبات میں ذرا سی بھی لغزش نہ آئی۔

جب مَیں وہاں کھڑی تھی، تو مجھے دور سے آتی وہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو مجھے مستقبل کے ہولناک اندیشوں سے ڈرا رہی تھیں—مگر میرے دل کے نہاں خانے میں صرف یہی ایک صدا گونج رہی تھی: "إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ" "ہرگز نہیں! یقیناً میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا!" (سورۃ الشعراء: 62) تاہم اپنے اردگرد پھیلی ہوئی مشکلات، انتشار اور درد کے ان طلسماتی فریبوں کے پار جھانکنا صرف اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب ہم اپنے دل کو ایک ہی نقطے پر مرکوز (focus) کرنے کی اجازت دیں۔ اسلام کی بنیاد 'توحید' پر ہے، لیکن توحید محض زبان سے یہ اقرار کر لینے کا نام نہیں ہے کہ اللہ ایک ہے۔ اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ عمیق اور روح پرور ہے۔ توحید دراصل زندگی کے مقصد کی وحدت، خوف و خشیت کی وحدت، بندگی کی وحدت، اور اللہ کے لیے خالص اور والہانہ محبت کی وحدت کا نام ہے۔ یہ فکر، نگاہ اور توجہ کی یکسوئی ہے۔ یہ اپنی پوری نگاہ کو صرف ایک ہی نقطۂ مرکز پر جما دینے کا نام ہے، جس کے بعد زندگی کی ہر ہر شے خود بخود اپنی درست جگہ پر آ کر سج جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی ایک نہایت پیاری اور حکمت سے لبریز حدیثِ مبارکہ اس حقیقت کا کیسا بے عیب نقشہ کھینچتی ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «مَنْ كَانَتِ الآخِرَةُ هَمَّهُ جَعَلَ اللهُ غِنَاهُ فِي قَلْبِهِ، وَجَمَعَ لَهُ شَمْلَهُ، وَأَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ، وَمَنْ كَانَتِ الدُّنْيَا هَمَّهُ جَعَلَ اللهُ فَقْرَهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ، وَفَرَّقَ عَلَيْهِ شَمْلَهُ، وَلَمْ يَأْتِهِ مِنَ الدُّنْيَا إِلَّا مَا قُدِّرَ لَهُ» "جس شخص کی تمام تر تگ و دو اور فکر کا محور آخرت بن جائے، اللہ تعالیٰ اس کے دل میں بے نیازی اور غنا رکھ دیتا ہے، اور اس کے تمام بکھرے ہوئے معاملات کو سمیٹ کر درست فرما دیتا ہے، اور دنیا ذلیل و خوار ہو کر اس کے قدموں میں آتی ہے۔ اور جس کی تمام تر فکر و سوچ کا مرکز صرف دنیا بن جائے، اللہ تعالیٰ اس کی محتاجی اور غربت کو اس کی دونوں آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے، اور اس کے تمام معاملات کو منتشر اور پراگندہ کر دیتا ہے، اور دنیا میں سے بھی اسے صرف اتنا ہی ملتا ہے جتنا اس کے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا۔" (سنن الترمذی) اگر آپ نے کبھی تھری ڈی تصویری معمے (Magic Eye picture) دیکھے ہوں، تو آپ اس سچائی کی ایک لاجواب تمثیل سمجھ سکتے ہیں۔ پہلی نظر میں وہ تصویر مختلف بے معنی اور بے ترتیب لکیروں اور اشکال کا مجموعہ دکھائی دیتی ہے، جس میں نہ کوئی ربط ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی مقصد۔ لیکن اگر آپ اس تصویر کو بالکل اپنے چہرے کے قریب لائیں اور اپنی دونوں آنکھوں کی توجہ کو صرف ایک ہی نقطے پر جما لیں، اور پھر تصویر کو آہستہ آہستہ چہرے سے دور ہٹاتے جائیں، تو اچانک وہ مخفی تصویر پوری خوبصورتی اور وضاحت کے

ساتھ آپ کے سامنے ابھر آتی ہے۔ لیکن جونہی آپ اپنی نگاہ اس ایک واحد نقطۂ مرکز سے ہٹاتے ہیں، وہ خوبصورت منظر پل بھر میں غائب ہو جاتا ہے اور آپ کے سامنے دوبارہ وہی بے ربط، انتشار زدہ اور بے ہنگم لکیروں کا سمندر باقی رہ جاتا ہے!

بالکل اسی طرح، جتنا زیادہ ہم اپنی توجہ کا مرکز اس فانی دنیا کو بناتے ہیں، ہمارے معاملات اتنے ہی زیادہ انتشار، اضطراب اور بکھراؤ کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہم جتنا زیادہ اس دنیا کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتے ہیں، یہ دنیا اتنی ہی تیزی سے ہم سے دور بھاگتی ہے۔ اور ستم ظریفی دیکھیے کہ ہم جتنا زیادہ دولت کے انبار کے پیچھے دوڑتے ہیں، اندر سے اتنی ہی زیادہ غربت، محرومی اور فقر محسوس کرتے ہیں! اگر پیسہ ہی آپ کی زندگی کا واحد مقصد بن جائے، تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کے پاس خواہ کتنا ہی مال کیوں نہ آجائے، آپ کے دل میں ہر گھڑی اسے کھو دینے کا خوف سوار رہے گا۔ اور ہر گھڑی کا یہی خوف تو اصل غربت اور ناداری ہے! یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایسے بدبخت لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ غربت اور فقر ہمیشہ ان کی آنکھوں کے سامنے لٹکا رہتا ہے۔ انہیں اس کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ چاہے ان کے پاس کتنا ہی مال و متاع کیوں نہ ہو، ان کے دل میں قناعت کا دور دور تک پتہ نہیں ہوتا؛ بس ہوس اور لالچ بڑھتی جاتی ہے اور ہر وقت نقصان کا خوف لاحق رہتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس، جو لوگ اپنی توجہ کا رخ اللہ کی ذات پر مرکوز کر لیتے ہیں، دنیا خود ان کے قدموں میں سمٹ آتی ہے، اور اللہ ان کے دلوں کو قناعت، بے نیازی اور قلبی سکون کے نور سے بھر دیتا ہے۔ اگر ان کے پاس بظاہر کم مال بھی ہو، تب بھی وہ خود کو کائنات کا سب سے غنی انسان محسوس کرتے ہیں، اور وہ اپنے اسی قلیل مال میں سے بھی دوسروں پر کھلے دل سے لٹانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

اور جب ایسے باایمان لوگ خود کو زندگی کے مصائب میں گھرا ہوا پائیں—خواہ وہ مالی تنگی ہو، جسمانی درد ہو، تنہائی کا عذاب ہو، خوف کا سایہ ہو، دل کا ٹوٹنا ہو، یا رنج و الم کا بوجھ—تو انہیں بس اتنا کرنا ہوتا ہے کہ وہ اپنا رخ اللہ کی بارگاہ کی طرف موڑ لیں۔ اور وہ پروردگار ہمیشہ ان کے لیے آزمائشوں سے نکلنے کی کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکال دیتا ہے۔ جان لیجیے کہ یہ کوئی محض دل کو خوش کرنے والا فلسفہ یا کھوکھلا نظریہ نہیں ہے۔ یہ تو ایک ربانی وعدہ ہے۔ خود مالکِ کائنات کا کیا ہوا وہ سچا وعدہ، جس نے قرآنِ مجید میں دو ٹوک فرما دیا ہے:

﴿ وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ﴾ "اور جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے (تقویٰ اختیار کرتا ہے)، اللہ اس کے لیے (ہر مشکل سے) نکلنے کی راہ بنا دیتا ہے۔ اور اسے ایسے راستے سے رزق عطا فرماتا ہے جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور جو شخص اللہ پر توکل اور بھروسا کرتا ہے، تو اللہ اس کے لیے کافی ہے!" (سورۃ الطلاق: 2-3) اللہ ہی ان کے لیے کافی ہے۔ اللہ ہی سب سے بڑا سہارا ہے۔ جو لوگ اللہ کو اپنی زندگی کی اولین اور حتمی ترجیح بنا لیتے ہیں، ان کے نصیب میں صرف اور صرف سکون و سلامتی لکھ دی جاتی ہے؛ کیونکہ اس فانی زندگی میں ان کے ساتھ جو کچھ بھی پیش آئے، وہ سراسر خیر ہوتا ہے اور وہ اسے اللہ کی مشیت اور اس کی رضا سمجھ کر سر آنکھوں پر قبول کر لیتے ہیں۔ ذرا تصور تو کیجیے کہ آپ کی زندگی کا ہر ہر واقعہ سراسر بھلائی اور خیر بن جائے! یہی وہ باکمال کیفیت ہے جو اس کامل مومن کا مقدر بنتی ہے، جیسا کہ حضور نبی رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا: «عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ» "مومن کا معاملہ بھی کتنا عجیب اور لاجواب ہے! اس کا ہر ہر معاملہ سراسر خیر ہی خیر ہوتا ہے، اور یہ فضیلت مومن کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں۔ اگر اسے کوئی خوشی اور راحت نصیب ہو تو وہ شکر ادا کرتا ہے، پس یہ اس کے لیے خیر بن جاتا ہے؛ اور اگر اسے کوئی تکلیف اور رنج پہنچے تو وہ صبر کرتا ہے، اور یہ بھی اس کے حق میں خیر بن جاتا ہے!" (صحیح مسلم) اور چنانچہ ایسے سچے مومن کے سینے کے اندر دنیا ہی میں جنت کی ایک بہار اتر آتی ہے۔ یہی وہ دنیاوی جنت ہے جس کا تذکرہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس لافانی قول میں فرمایا تھا: "بے شک اس دنیا میں بھی ایک جنت ہے؛ جو شخص اس دنیاوی جنت میں داخل نہیں ہوا، وہ آخرت کی ابدی جنت میں کبھی داخل نہیں ہو سکے گا!"

اور اس دنیاوی جنت کے اندر نصیب ہونے والا وہ کامل اور ہمہ گیر امن و سکون کسی وقتی لمحے کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک ایسی لازوال روحانی کیفیت کا نام ہے جو ابد تک قائم رہتی ہے!

دنیا کا سمندر

The Ocean of Dunya

کل مَیں ساحلِ سمندر پر گئی۔ جب مَیں وہاں بیٹھی کیلیفورنیا کے سمندر کی دیو قامت لہروں کو دیکھ رہی تھی، تو مجھ پر ایک عجیب و غریب سچائی کا انکشاف ہوا۔ یہ سمندر آنکھوں کو خیرہ کر دینے کی حد تک دلکش اور خوبصورت ہے۔ لیکن جتنا یہ حسین ہے، عین اسی قدر یہ ہلاکت خیز اور جان لیوا بھی ہے! وہی سحر انگیز لہریں جن کی رعنائی کو ہم ساحل پر کھڑے ہو کر داد دیتے ہیں، اگر ہم ان کے اندر اتر جائیں تو وہی لہریں ہمیں لمحوں میں موت کی نیند سلا سکتی ہیں۔ پانی، جو زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے سب سے بنیادی اور ناگزیر مادہ ہے، وہی پانی انسان کا گلا گھونٹ کر ڈبو دینے کی بھی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اور یہی سمندر جو اپنے سینے پر دیو ہیکل بحری جہازوں کو تیرائے رکھتا ہے، ذرا سی سرکشی پر انہی جہازوں کو پاش پاش کر کے غرقاب بھی کر دیتا ہے۔

ہماری یہ دنیاوی زندگی (دنیا) بالکل اس بے پایاں سمندر کی مانند ہے۔ اور ہمارے دل گویا اس سمندر پر تیرتی ہوئی کشتیاں ہیں! ہم اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اور اپنی حتمی منزل تک پہنچنے کے واسطے اس سمندر کو بطورِ ذریعہ استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ سمندر صرف اور صرف ایک 'ذریعہ' ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ سمندر کی غذا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ سفر کرنے اور مسافتیں طے کرنے کا وسیلہ ہے۔ یہ ایک بلند تر اور عظیم مقصد کے حصول کا راستہ ہے۔ لیکن یہ ایک ایسی راہگزر ہے جس میں سے ہمیں محض گزرنا ہے، یہاں ہمیشہ ڈیرے ڈال کر بیٹھنے کا سوچنا بھی حماقت ہے۔ ذرا تصور کیجیے کہ اگر سمندر ہی محض ایک وسیلہ رہنے کے بجائے ہماری اصل منزل بن جائے، تو کیا انجام ہوگا؟

بالآخر ہم اس کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق ہو جائیں گے!

جب تک سمندر کا پانی کشتی کے باہر رہتا ہے، کشتی لہروں کے دوش پر تیرتی رہتی ہے اور ملاح کے قابو میں رہتی ہے۔ لیکن کیا ہوتا ہے جونہی وہ نمکین پانی کشتی کی دراڑوں سے اندر سرایت کرنے لگے؟ کیا گزرتی ہے

جب یہ دنیا ہمارے دل کے باہر ایک وسیلہ رہنے کے بجائے دل کے اندر داخل ہو جائے؟ کیا بنتا ہے جب دنیا محض ایک ظاہری ذریعہ رہنے کے بجائے ہمارے دل پر سوار ہو جائے؟

بس وہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب کشتی ڈوب جاتی ہے!

وہی وہ گھڑی ہوتی ہے جب انسان کا دل یرغمال بن جاتا ہے اور دنیا کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب دنیا—جو کل تک ہمارے تابع اور ہمارے زیرِ نگیں تھی—اب الٹا ہم پر حکمرانی کرنے لگتی ہے! جب سمندر کا پانی کسی کشتی کے اندر بھر جاتا ہے اور اس پر غالب آجاتا ہے، تو وہ کشتی پھر ملاح کے قابو میں نہیں رہتی۔ وہ بے بس کشتی پھر سمندر کے رحم و کرم پر ہوتی ہے، جہاں لہریں چاہیں اسے پٹخ دیں۔

اس طوفانی بحر میں غرقاب ہونے سے بچنے اور لہروں کے اوپر تیرتے رہنے کے لیے، ہمیں اس دنیا کو بالکل اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھنا ہوگا؛ کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہمیں متنبہ فرمایا ہے کہ: ﴿ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ﴾ (بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں، سورۃ آل عمران: 190)۔ ہم اس دنیا کے اندر بستے ہیں، اور یہ دنیا درحقیقت ہمارے ہی فائدے اور استعمال کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ دنیا سے بے رغبتی اور زہد (detachment) کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم دنیاوی معاملات اور زندگی سے بالکل کٹ کر بیٹھ جائیں۔ بلکہ اس کے برعکس، رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ ہمیں دنیا میں رہنا ہوگا:

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: تین افراد نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے گھروں میں آئے تاکہ وہ نبی کریم ﷺ کی نفل عبادات کے طریقے کے بارے میں دریافت کریں۔ جب انہیں آپ ﷺ کی عبادت کا معمول بتایا گیا، تو گویا انہوں نے اسے کم سمجھا اور آپس میں کہنے لگے: 'بھلا ہمارا رسول اللہ ﷺ سے کیا مقابلہ ہو سکتا ہے، جن کے اگلے پچھلے تمام گناہ پہلے ہی بخش دیے گئے ہیں!' چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا: 'میں ساری ساری رات جاگ کر ہمیشہ نماز پڑھوں گا۔' دوسرے نے کہا: 'میں ہمیشہ مسلسل روزے رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔' اور تیسرے نے کہا: 'میں عورتوں سے ہمیشہ کنارہ کش رہوں گا اور کبھی نکاح نہیں کروں گا۔' جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: «أَنْتُمُ الَّذِينَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا؟ أَمَا وَاللَّهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلَّهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ، لَكِنِّي أَصُومُ وَأُفْطِرُ،

وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي» "کیا تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں؟ سن لو! اللہ کی قسم، مَیں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تم سب سے زیادہ اس کا تقویٰ رکھنے والا ہوں؛ لیکن اس کے باوجود مَیں نفلی روزے رکھتا بھی ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں، رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور مَیں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ پس جس نے میری سنت سے روگردانی کی، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں!" (متفق علیہ: صحیح بخاری و صحیح مسلم) رسول اللہ ﷺ نے دنیا سے اپنے دل کو آزاد رکھنے کے لیے دنیا کو ترک نہیں فرمایا تھا۔ آپ ﷺ کا زہد اور بے نیازی اس سے کہیں زیادہ عمیق تھی۔ وہ دل کا زہد اور قلب کی بے نیازی تھی۔ آپ ﷺ کی حتمی قلبی وابستگی صرف اور صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات اور اس کے پاس موجود ابدی گھر کے ساتھ تھی؛ کیونکہ آپ ﷺ اللہ کے اس کلام کی حقیقت کو سب سے گہرائی سے جانتے تھے:

﴿ وَمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ ۚ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴾ "اور یہ دنیاوی زندگی تو کھیل اور تماشے کے سوا کچھ بھی نہیں! اور حقیقت میں آخرت کا گھر ہی اصل اور سچی زندگی ہے، کاش وہ لوگ جانتے ہوتے!" (سورۃ العنکبوت: 64) دنیا سے دل کے الگ ہونے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم دنیاوی مال و متاع کے مالک ہی نہیں بن سکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ جلیل القدر صحابۂ کرام میں سے کتنے ہی صحابہ بے پناہ دولت مند اور صاحبِ ثروت تھے۔ بلکہ زہد اور بے رغبتی کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم دنیا کو اس کے اصل روپ میں دیکھیں اور اسی حیثیت سے اس کے ساتھ برتاؤ کریں: یعنی محض ایک عارضی ذریعہ اور وسیلہ! زہد یہ ہے کہ دنیا آپ کے ہاتھوں میں رہے—نہ کہ آپ کے دل کے اندر بسی ہو! جیسا کہ امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کیسی دانائی اور بلاغت سے فرمایا تھا: "الزُّهْدُ لَيْسَ أَنْ لَا تَمْلِكَ شَيْئًا، وَلَكِنَّ الزُّهْدَ أَنْ لَا يَمْلِكَكَ شَيْءٌ" "زہد یہ نہیں ہے کہ تمہارے پاس دنیا کی کوئی چیز نہ ہو؛ بلکہ حقیقی زہد یہ ہے کہ دنیا کی کوئی بھی چیز تمہاری مالک نہ بن جائے!"

بالکل اسی طرح جیسے سمندر کا پانی اگر کشتی کے اندر گھس آئے تو کشتی ڈوب جاتی ہے، بعینہٖ اسی طرح جس لمحے ہم نے دنیا کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دے دی، ہماری روحانی کشتی غرق ہو جائے گی۔ سمندر کبھی اس لیے بنایا ہی نہیں گیا تھا کہ وہ کشتی کے اندر داخل ہو؛ وہ تو محض ایک ایسا راستہ اور ذریعہ تھا جسے کشتی کے

باہر ہی رہنا چاہیے۔ بالکل اسی طرح یہ دنیا بھی کبھی اس لیے پیدا نہیں کی گئی تھی کہ یہ ہمارے دل کا مکین بن جائے۔ یہ تو محض ایک مادی وسیلہ ہے جسے باہر رہنا چاہیے، نہ یہ کہ یہ ہمارے باطن میں اتر کر ہم پر حاکم بن جائے۔ یہی حکمت ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں بار بار اس فانی دنیا کو 'مَتَاع' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ لفظِ 'متاع' کا مفہوم ہے: "عارضی دنیاوی فائدے اور وقتی کام آنے والا سامان"۔ یہ محض ایک عارضی سامان ہے، ایک برتنے کی چیز ہے۔ یہ محض ایک اوزار ہے۔ یہ راستہ ہے—منزلِ مقصود نہیں!

اور یہی وہ لافانی اور پر حکمت تصور ہے جس کا حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے ایک نہایت فصیح و بلیغ ارشاد میں نقشہ کھینچا، جب آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَا لِي وَلِلدُّنْيَا؟ مَا أَنَا فِي الدُّنْيَا إِلَّا كَرَاكِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا» "بھلا میرا اس دنیا سے کیا واسطہ اور کیا تعلق؟ میری مثال اس دنیا میں تو بس اس سوار کی مانند ہے جو سخت دھوپ میں سفر کے دوران کسی درخت کے سائے تلے تھوڑی دیر کے لیے سستانے کو رکتا ہے، اور پھر ذرا سا آرام کرنے کے بعد اس درخت کو وہیں چھوڑ کر اپنے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے!" (مسند احمد، سنن الترمذی) ذرا ایک لمحے کے لیے ایک مسافر کی نفسیات اور طرزِ فکر پر غور کیجیے۔ کیا ہوتا ہے جب آپ سفر میں ہوں یا آپ کو بخوبی علم ہو کہ کسی جگہ پر آپ کا قیام محض چند گھڑیوں کا ہے؟ جب آپ کسی اجنبی شہر میں سے صرف ایک رات گزارنے کے لیے گزر رہے ہوں، تو بھلا آپ اس جگہ سے کتنا دل لگاتے ہیں؟ اگر آپ کو معلوم ہو کہ یہ عارضی ٹھکانہ ہے، تو آپ موٹل 6 (ایک سستے سے سرائے) کے معمولی کمرے میں بھی خوشی سے رات کاٹ لیں گے۔ لیکن کیا آپ وہاں ہمیشہ کے لیے رہائش اختیار کرنا پسند کریں گے؟ شاید کبھی نہیں۔ فرض کیجیے آپ کے ادارے کا مالک آپ کو کسی دوسرے شہر میں ایک محدود مدت کے پروجیکٹ پر بھیجتا ہے۔ فرض کیجیے اس نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ وہ پروجیکٹ کب ختم ہوگا، لیکن آپ کو یقین ہے کہ آپ کو کسی بھی دن، کسی بھی پل واپس اپنے اصل گھر بلایا جا سکتا ہے۔ اب ذرا سوچیے کہ اس عارضی شہر میں آپ کا رویہ کیسا ہوگا؟ کیا آپ وہاں زمینوں اور جائیدادوں کے وسیع انبار خریدنے میں لگ جائیں گے اور اپنی ساری جمع پونجی قیمتی فرنیچر اور پر تعیش گاڑیوں پر لٹا دیں گے؟ ہرگز نہیں۔ حتیٰ کہ مارکیٹ میں شاپنگ کرتے ہوئے بھی کیا آپ گاڑی بھر بھر کر مہینوں کا کھانا

اور خراب ہو جانے والا راشن خریدیں گے؟ قطعی نہیں ! آپ شاید دو دن کی ضرورت سے زیادہ سامان خریدتے ہوئے بھی ہچکچائیں گے۔کیونکہ آپ کا باس کسی بھی لمحے آپ کو واپس بلا سکتا ہے !

یہی ایک بیدار مغز مسافر کی سوچ ہوتی ہے۔ جب انسان کے اندر یہ شعور بیدار ہو جاتا ہے کہ یہ قیام محض عارضی اور ناپائیدار ہے، تو دنیا سے ایک فطری بے نیازی اور قلبی آزادی خود بخود جنم لیتی ہے۔ یہی وہ باطنی حقیقت ہے جس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے اپنی بے پایاں حکمت سے اس حدیث میں رہنمائی فرمائی ہے۔ آپ ﷺ خوب جانتے تھے کہ اس فانی زندگی کی محبت میں گرفتار ہو جانے کا انجام کتنا ہولناک ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ ﷺ کو اپنی امت کے حق میں جس فتنے کا سب سے زیادہ اندیشہ تھا، وہ یہی فتنہ تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «فَوَاللَّهِ مَا الْفَقْرَ أَخْشَى عَلَيْكُمْ، وَلَكِنْ أَخْشَى عَلَيْكُمْ أَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا كَمَا بُسِطَتْ عَلَى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، فَتَنَافَسُوهَا كَمَا تَنَافَسُوهَا، فَتُهْلِكَكُمْ كَمَا أَهْلَكَتْهُمْ» ”پس اللہ کی قسم ! مجھے تمہارے بارے میں فقر اور تنگدستی کا کوئی خوف نہیں ہے، بلکہ مجھے تو اندیشہ اس بات کا ہے کہ تم پر دنیا اس طرح فراخ اور کشادہ کر دی جائے گی جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر کشادہ کی گئی تھی، پھر تم دنیا پانے کے لیے ایک دوسرے سے اسی طرح ہوس اور مقابلے بازی کرو گے جس طرح اگلوں نے کی تھی، اور پھر یہ دنیا تمہیں بھی اسی طرح برباد کر کے رکھ دے گی جس طرح اس نے ان کو برباد کر ڈالا تھا !“ (متفق علیہ: صحیح بخاری و صحیح مسلم) ہمارے پیارے آقا و مولا، سرورِ دو عالم ﷺ نے اس فانی زندگی کی اصل حقیقت کو پوری طرح پہچان رکھا تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے بھی اپنے دل کو اس کی غلاظت سے پاک اور بے نیاز رکھنے کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔ آپ ﷺ بھی اسی طوفانی بحر میں بادبان کھول کر آگے بڑھے جس میں ہم سب کو سفر کرنا ہے۔ لیکن آپ ﷺ کی کشتی خوب جانتی تھی کہ وہ کہاں سے آئی ہے، اور اسے کس ساحل کی طرف جانا ہے۔ وہ ایک ایسی باوقار اور مقدس کشتی تھی جو سمندر کے سینے پر رواں رہنے کے باوجود اندر سے بالکل خشک رہی ! آپ ﷺ پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ جو سمندر دھوپ میں چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے، وہی سمندر ان نادان کشتیوں کے لیے قبرستان بن جاتا ہے جو اس کے نمکین پانی کو اپنے سینے کے اندر داخل ہونے کی اجازت دے بیٹھتی ہیں !

اپنے دل کو واپس حاصل کرو

Take Back Your Heart

ٹھوکر کھا کر گرنا کسی کو بھی پسند نہیں ہوتا۔ اور شاید ہی کوئی انسان ایسا ہو جو اپنی مرضی سے سمندر کی لہروں میں ڈوبنا پسند کرے۔ لیکن اس دنیاوی زندگی کے طوفانی بحر میں تگ و دو کرتے ہوئے، بعض اوقات اس فانی دنیا کو اپنے دل سے باہر رکھنا بے انتہا کٹھن ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار سمندر کا پانی واقعی ہمارے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ یہ دنیا واقعی رِس رِس کر ہمارے دل کے نہاں خانوں میں اتر جاتی ہے۔

اور بالکل اس پانی کی مانند جو کشتی کے تختے توڑ ڈالتا ہے، جب دنیا اندر داخل ہو جاتی ہے تو وہ ہمارے دل کو پاش پاش کر کے رکھ دیتی ہے۔ وہ روح کی کشتی کو چکنا چور کر دیتی ہے۔ حال ہی میں مجھے ایک بار پھر یہ تلخ منظر دیکھنے کو ملا کہ ایک شکستہ اور ٹوٹی ہوئی کشتی کیسی دکھائی دیتی ہے، اور اس وقت کیا قیامت گزرتی ہے جب انسان دنیا کے ہر گند کو اپنے دل میں داخل ہونے کی اجازت دے بیٹھتا ہے۔ مجھے یہ حقیقت اس لیے یاد آئی کیونکہ مَیں نے اپنے ہی جیسے ایک جیتے جاگتے انسان کو دیکھا جو اس فانی زندگی کی محبت میں حد سے زیادہ گرفتار ہو چکا تھا اور اللہ کے بجائے مخلوق کے سہاروں سے اپنے اندرونی خلا کو بھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چنانچہ اس دنیا کے طوفانی سمندر نے اس کی کشتی کو اسی طرح توڑ ڈالا جس طرح اس نے کبھی میری کشتی کو توڑ ڈالا تھا، اور وہ کشتی سے باہر چھلک کر گہرے پانی میں جا گری۔ لیکن وہ اتنی دیر تک پانی کے نیچے ڈوبی رہی، اور اسے اوپر تیر کر واپس آنے کا راستہ نہ ملا اور نہ ہی وہ جان سکی کہ بچنے کے لیے کس سہارے کو تھامنا چاہیے۔

چنانچہ وہ غرق ہو گئی!

اگر آپ دنیا کو یہ اختیار دے دیں کہ وہ آپ کے دل کی مالک بن جائے، تو بالکل اس سمندر کی طرح جو ڈوبتی کشتی پر قابض ہو جاتا ہے، دنیا آپ کے پورے وجود کو نگل لے گی۔ آپ ڈوبتے ڈوبتے سمندر کی تاریک گہرائیوں میں اترتے چلے جائیں گے۔ آپ سمندر کی تاریک ترین تہہ کو جا چھوئیں گے۔ اور آپ کو یوں محسوس ہوگا گویا

آپ اپنی زندگی کے ادنیٰ ترین اور ذلیل ترین مقام پر گر چکے ہیں۔ اپنے گناہوں کے جال اور اس فانی زندگی کی محبت کے ہاتھوں جکڑے ہوئے، آپ خود کو اندھیروں میں گھرا ہوا اور ریزہ ریزہ محسوس کریں گے۔ سمندر کی تہہ کی یہی تو خوفناک ترین صفت ہے: کہ وہاں روشنی کی ایک ادنیٰ سی کرن بھی نہیں پہنچ پاتی!

تاہم یاد رکھیے، یہ تاریک اور خوفناک گہرائی آپ کا انجامِ زیست نہیں ہے۔ ہمیشہ یاد رکھیے کہ رات کی گہری ترین سیاہی کے پیٹ ہی سے پو پھوٹتی ہے اور صبحِ نو کا اجالا جنم لیتا ہے! اور جب تک آپ کے سینے میں دل دھڑک رہا ہے، تب تک یہ دل کی موت نہیں ہے۔ آپ کو اس اندھیری تہہ میں گھٹ کر مر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بعض اوقات سمندر کی تہہ تک جانا سفر کا اختتام نہیں بلکہ سفر کا محض ایک عارضی پڑاؤ ہوتا ہے۔ اور یہی وہ پاتال اور قعرِ مذلت ہے جہاں پہنچ کر آپ کے سامنے دو راستے کھلتے ہیں اور آپ کو ایک فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ آپ چاہیں تو اسی دلدل میں ہاتھ پاؤں چھوڑ کر پڑے رہیں یہاں تک کہ ہمیشہ کے لیے ڈوب مریں؛ یا پھر آپ آگے بڑھ کر سمندر کی تہہ سے نایاب موتی چن لیں اور تیر کر دوبارہ سطحِ آب پر ابھر آئیں—اس تیراکی کی بدولت پہلے سے زیادہ طاقتور ہو کر، اور ان انمول موتیوں اور جواہرات کی بدولت پہلے سے کہیں زیادہ مالامال اور غنی بن کر!

اگر تم سچے دل سے اسی کی طرف رجوع کرو، تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس قعرِ مذلت سے اٹھا کر عزت کی بلندیوں پر پہنچا سکتا ہے، اور وہ سمندر کی اس گھٹن اور تاریکی کو اپنے خورشیدِ رحمت کے نور سے بدل سکتا ہے! وہ پروردگار تمہاری اس سابقہ سب سے بڑی کمزوری کو تمہاری سب سے عظیم روحانی طاقت میں بدلنے پر قادر ہے، اور اسے تمہاری باطنی نمو، تطہیرِ قلب، اور مغفرت و نجات کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔ خوب جان لیجیے کہ باطنی انقلاب اور حیاتِ نو کا آغاز بسا اوقات ایک بار زمین پر گرنے ہی سے ہوتا ہے! اس لیے اپنی اس ٹھوکر اور گرنے پر کبھی لعنت مت بھیجیے۔ یہ خاک اور زمین ہی وہ جگہ ہے جہاں عاجزی، انکساری اور خاکساری پروان چڑھتی ہے۔ اس عاجزی کو گلے لگائیے۔ اس سے سبق سیکھیے۔ اسے اپنی سانسوں میں جذب کیجیے۔ اور پھر پلٹ کر اپنے رب کے دربار میں پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط، پہلے سے کہیں زیادہ خاکسار، اور اس کی ذات کی محتاجی کے عمیق ترین شعور کے ساتھ واپس آئیے! اپنے ہیچ ہونے اور اس کے سب کچھ ہونے، اپنی بے مائیگی اور اس کی عظمت و کبریائی کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کر کے لوٹیے۔ جان لیجیے کہ اگر آپ نے اپنی اس اصل

حقیقت کا مشاہدہ کر لیا ہے، تو آپ نے بہت بڑی بصیرت پا لی ہے۔ کیونکہ سب سے بڑا فریب خوردہ اور اندھا انسان تو وہ ہے جو صرف اپنی خودی اور اپنی ذات کو دیکھتا ہے—مگر اپنے رب کو نہیں دیکھتا ! اور سب سے زیادہ محروم و بدبخت وہ ہے جس نے کبھی اپنے پروردگار کے حضور اپنی بے پایاں محتاجی اور کسمپرسی کا مشاہدہ ہی نہ کیا ہو۔ جو شخص اپنے ہی ظاہری اسباب کے گھمنڈ میں جیتا ہے، وہ بھول جاتا ہے کہ یہ تمام اسباب، اس کی اپنی روح، اور کائنات کا ذرہ ذرہ خود اسی ربِ کریم کی تخلیق کردہ ہیں !

اپنے رب کے دربار میں گڑگڑائیے کہ وہ آپ کو اس دلدل سے نکال کر دوبارہ کھڑا کر دے، کیونکہ جب وہ آپ کو سنبھالے گا، تو وہ آپ کی ٹوٹی ہوئی کشتی کو ازسرِ نو تعمیر فرما دے گا ! وہ دل جس کے بارے میں آپ کا خیال تھا کہ اب یہ ہمیشہ کے لیے تباہ ہو چکا ہے اور کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا، وہ پروردگار اسے پھر سے جوڑ کر نندرست فرما دے گا۔ جو کچھ ریزہ ریزہ ہو چکا تھا، وہ دوبارہ کامل ہو جائے گا۔ خوب جان لیجیے کہ یہ معجزہ صرف اور صرف وہی ایک ذات کر سکتی ہے۔ پس اسی کی بارگاہ میں رجوع کیجیے !

اور جب وہ آپ کو اس بھنور سے نکال کر نجات عطا فرما دے، تو اپنی اس لغزش اور گرنے پر اپنے رب کے حضور سچے دل سے استغفار کیجیے، اپنے گناہ پر ندامت کے آنسو بہائیے—مگر خبردار، کبھی اس کی رحمت سے مایوس نہ ہوئیے گا ! جیسا کہ امام ابن قیم الجوزیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کتنا بصیرت افروز کلام فرمایا ہے: ”جب سیدنا آدم علیہ السلام جنت سے زمین پر اتارے گئے تو ابلیس مارے خوشی کے ناچنے لگا؛ مگر وہ نادان یہ نہ جان سکا کہ جب کوئی غوطہ خور سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ لگاتا ہے، تو وہ تہہ سے انمول موتی چن کر ہی دوبارہ سطح پر ابھرا کرتا ہے !“

توبہ اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی چوکھٹ کی طرف سچے دل سے پلٹ آنے میں ایک بے پناہ اعجاز اور حیرت انگیز تاثر پنہاں ہے۔ ہمیں احادیثِ مبارکہ میں بتایا گیا ہے کہ توبہ دراصل دلوں کا زنگ اتارنے والی صیقل (polish) ہے۔ اور صیقل کی سب سے حیرت انگیز خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ برتن کو محض صاف ہی نہیں کرتی، بلکہ جس شے کو پالش کیا جائے، وہ گندا ہونے سے پہلے جتنی چمکدار تھی، صیقل کے بعد اس سے بھی کہیں زیادہ دمکنے اور چمکنے لگتی ہے ! اگر آپ اپنے رب کی طرف سچے دل سے لوٹ آئیں، اس سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگیں، اور اپنی زندگی اور اپنے دل کا قبلہ دوبارہ اسی کی طرف درست کر لیں، تو آپ کے اندر یہ صلاحیت پیدا

ہو جاتی ہے کہ آپ کی روح اس سے بھی کہیں زیادہ مالامال اور منور ہو جائے جتنی کہ وہ شاید اس وقت ہوتی جب آپ کبھی گناہ کے گڑھے میں گرے ہی نہ ہوتے! بعض اوقات زندگی میں ٹھوکر کھا کر گرنا اور پھر توبہ کے ذریعے سنبھل کر کھڑا ہونا انسان کو وہ دانائی، حکمت، اور بے نفس عاجزی عطا کر دیتا ہے جو شاید اسے کبھی کسی اور راستے سے نصیب نہ ہو سکتی تھی۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"سلفِ صالحین میں سے ایک بزرگ کا ارشاد ہے: 'بے شک ایک بندہ کوئی گناہ کر بیٹھتا ہے اور اسی گناہ کے طفیل وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے؛ جب کہ دوسرا شخص کوئی نیکی کرتا ہے اور اسی نیکی کے وبال سے وہ جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے!' ان سے عرض کیا گیا: یہ کیونکر ممکن ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: 'جس شخص سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے، وہ ہر گھڑی اسی گناہ کے تصور میں مبتلا رہتا ہے؛ چنانچہ وہ مسلسل اس پر خوفزدہ رہتا ہے، ندامت کے آنسو بہاتا ہے، تڑپتا ہے اور اپنے ربِ برتر کے حضور شرمساری سے پانی پانی ہوتا رہتا ہے۔ وہ شکستہ دل کے ساتھ اور عاجزی و انکساری سے اپنا سر جھکائے اللہ کی بارگاہ میں کھڑا رہتا ہے۔ پس اس بندے کے حق میں یہ گناہ کثرت سے کی جانے والی نفلی عبادات سے بھی کہیں زیادہ نافع اور بابرکت ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اس گناہ نے اس کے اندر وہ سچی عاجزی، مسکینی اور للہیت پیدا کر دی جو بندے کی ابدی فلاح اور کامیابی کا زینہ ہے—یہاں تک کہ یہی ندامت اس کے جنت میں داخلے کا سبب بن جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس، نیکی کرنے والا شخص اس نیکی کو اپنے رب کا احسان نہیں سمجھتا، بلکہ وہ خود پسندی، تکبر اور غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اتراتا پھرتا ہے کہ: مَیں نے فلاں فلاں کارنامہ انجام دیا ہے اور فلاں نیکی کی ہے! چنانچہ یہ غرور اس کے اندر خود ستائی اور کبر کو مزید بڑھا دیتا ہے—یہاں تک کہ یہی خود پسندی اس کی ابدی ہلاکت اور بربادی کا باعث بن جاتی ہے!'"

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ہمیں تاکیدی حکم فرمایا ہے کہ ہم کسی حال میں بھی اس کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴾ "آپ فرما دیجیے: اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی اور ظلم کیا ہے! اللہ کی رحمت سے ہرگز ناامید نہ ہونا۔ بے شک اللہ تمام گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے۔ یقیناً وہ بڑا ہی بخشنے والا، نہایت رحم فرمانے والا ہے!" (سورۃ الزمر: 53)

اور چنانچہ، یہ ان تمام روحوں کے نام ایک بیداری کی پکار ہے جو اپنی خودی اور انا کے جبر کی اسیر ہو چکی ہیں، جو اپنے نفس اور خواہشات کے تاریک زندان میں قید ہیں۔ یہ ان تمام مسافروں کے نام ایک دعوتِ عام ہے جو دنیا کے بے رحم سمندر میں اتر گئے، جو اس کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق ہو گئے، اور جو اس کی وحشی لہروں کے نرغے میں پھنس چکے ہیں۔ اٹھو! اوپر کھلی ہوا کی طرف ابھرو، سمندر کی اس تنگ قید سے نکل کر اوپر کی اصل اور حقیقی دنیا کی طرف پرواز کرو! اپنی آزادی کی طرف اٹھو! اٹھو اور حیاتِ نو کی طرف پلٹ آؤ! اپنی روح کی موت کو اپنے پیچھے چھوڑ دو۔ تمہارا دل اب بھی جی سکتا ہے، اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور، شفاف اور پاکیزہ بن سکتا ہے۔ کیا توبہ کی صیقل دل کو پہلے سے بھی زیادہ روشن اور حسین نہیں بنا دیتی؟ گناہوں کے جن پردوں کو تم نے اپنے ہاتھوں سے سیا ہے، ان حجابات کو پھاڑ ڈالو! اس پردے کو چاک کر دو جو تمہارے اور حقیقی زندگی کے درمیان، تمہارے اور آزادی کے درمیان، تمہارے اور نور کے درمیان— تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان حائل ہو چکا ہے! اس نقاب کو الٹ دو اور بلند ہو جاؤ! اپنی اصل کی طرف لوٹ آؤ۔ وہیں پلٹ چلو جہاں سے تمہارا سفر شروع ہوا تھا۔ اپنے اصل گھر واپس آجاؤ! خوب جان لو کہ جب دنیا کے تمام دروازے تمہارے منہ پر بند ہو جائیں، تب بھی ایک دروازہ ایسا ہے جو سدا کھلا رہتا ہے۔ ہمیشہ کھلا رہتا ہے! اس در کو تلاش کرو۔ اس رحیم پروردگار کی بارگاہ میں دوڑو، اور وہ بے رحم سمندر کی خوفناک لہروں کے درمیان سے نکال کر تمہیں اپنی رحمت کے ضیا بار آفتاب کے سائے میں بحفاظت پہنچا دے گا!

یہ فانی دنیا آپ کو کبھی توڑ نہیں سکتی—جب تک کہ آپ خود اسے اپنے دل کو توڑنے کی اجازت نہ دیں! اور یہ دنیا کبھی آپ کی مالک نہیں بن سکتی جب تک کہ آپ خود اس کے ہاتھ میں اپنے دل کی چابیاں نہ تھما دیں— جب تک کہ آپ اپنا دل اٹھا کر اس کے قدموں میں نہ رکھ دیں! چنانچہ اگر آپ نے نادانی میں چند لمحوں کے لیے وہ چابیاں اس دنیا کے حوالے کر بھی دی تھیں—تو اب آگے بڑھیے اور ان چابیوں کو اس کے ہاتھ سے واپس چھین لیجیے! یہ آپ کی زندگی کا اختتام نہیں ہے۔ آپ کو اس تاریک تہہ میں گھٹ کر مرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے دل کو اس غاصب دنیا کے پنجے سے آزاد کرائیے اور اسے اس کے حقیقی اور ازلی مالک کے سپرد کر دیجیے:

اور وہ حقیقی مالک صرف اور صرف اللہ ہے!

topqna.com

SECTION 2 • حصہ دوم

محبت

LOVE



topqna.com

بدترین قید سے نجات

Escaping the Worst Prison

جب سارہ کی ملاقات احمد سے ہوئی، تو اُسے پل بھر میں احساس ہو گیا؛ وہ اَن دیکھے خوابوں کی تعبیر تھا، بالکل ویسا ہی جیسا اُس نے ہمیشہ چاہا تھا۔ اُس سے ملنا ایسا تھا جیسے برف کے کسی ہولناک طوفان کے بیچ اچانک سورج طلوع ہو گیا ہو، جس کی پُرتپش کرنوں نے جماتی سردی کو پگھلا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ، یہ وارفتگی اور ستائش پوجا میں بدلتی چلی گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ سمجھ پاتی کہ اُس کے ساتھ کیا بیت چکی ہے، سارہ قیدی بن چکی تھی۔ وہ اپنی ہی خواہشات کی اسیر اور اپنے محبوب کی طلب میں زنجیر ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ جہاں دیکھتی، اُسے احمد کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا۔ زندگی میں اُس کا سب سے بڑا خوف اُس کی ناراضگی بن چکا تھا۔ وہ بس اسی کے وجود کو محسوس کر پاتی تھی، اور اُس کے بغیر خوشی کا کوئی مفہوم باقی نہ بچا تھا۔ اُس سے دور ہونا ایسا لگتا تھا گویا روح کو کھینچ کر جسم سے جدا کیا جا رہا ہو۔ اُس کے دل کے پردے پر صرف اسی کا چہرہ نقش تھا، اور کائنات میں اُسے اپنے آپ سے بھی زیادہ وہی قریب محسوس ہوتا تھا۔ وہ اُس کی رگوں میں دوڑتے لہو کی مانند بن چکا تھا۔ اُس کے بنا جینا ایک ناقابلِ برداشت اذیت تھی، کیونکہ اُس کی رفاقت کے دائرے سے باہر مسرت کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

سارہ کا گمان تھا کہ وہ محبت میں گرفتار ہے۔

سارہ نے اپنی زندگی میں بڑے کڑے دن دیکھے تھے۔ نو عمری ہی میں اُس کا باپ اُسے چھوڑ کر چلا گیا تھا؛ سولہ برس کی عمر میں وہ گھر سے بھاگ نکلی تھی، اور پھر منشیات و شراب کی جان لیوا لت سے پنجہ آزمائی کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اُس نے جیل کی تاریک کوٹھڑیوں میں بھی دن گزارے۔ مگر ان تمام دُکھوں اور تکالیف کو یکجا کر کے بھی دیکھا جائے، تو وہ اُس اذیت کے پاسنگ بھی نہ تھیں جو اُسے اپنے ہی ہاتھوں تراشے ہوئے اس نئے قید خانے میں جھیلنا پڑی تھیں۔ سارہ اپنی ہی خواہشات کے جال میں اسیر ہو چکی تھی۔ اور یہ وہی اسیری ہے جس کے بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا تھا: "حقیقی قیدی وہ ہے جس کا دل

اللہ سے دور ہو کر قید ہو جائے، اور اصل اسیر وہ ہے جسے اُس کی خواہشاتِ نفس نے اپنا غلام بنا لیا ہو۔"
(ابن القیم، الوابل الصیب، ص 69)

احمد کو معبود کا درجہ دینے سے جنم لینے والی سارہ کی یہ ذہنی اور قلبی اذیت، اُس کی زندگی کے ماضی کے تمام دکھوں سے کہیں زیادہ جانگسل تھی۔ اس آگ نے اُسے جلا کر بھسم تو کر دیا، مگر اُس کے اندر کے خالی پن کو کبھی نہ بھر سکی۔ صحرا کی تپتی ریت پر پیاس سے تڑپتے انسان کی مانند، سارہ پاگلوں کی طرح ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ روح فرسا وہ اذیت ناک انجام تھا، جو کسی فانی شے کو اُس مسند پر بٹھانے سے رونما ہوتا ہے جو صرف اور صرف باری تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔

سارہ کی یہ داستان اس قدر گہری اس لیے ہے کہ یہ ہمارے وجود کی ایک نہایت بنیادی اور ابدی سچائی کو آشکار کرتی ہے۔ بحیثیتِ انسان، ہماری تخلیق ایک مخصوص فطرت پر ہوئی ہے۔ اور وہ فطرت ہے: یکتا و یگانہ خدا کی پہچان اور اپنی عملی زندگی میں اس سچائی کو مجسم کرنا۔ چنانچہ، کائنات میں کوئی ایسی مصیبت، کوئی ایسا نقصان، اور کوئی ایسی شے نہیں جو انسان کو اس سے بڑھ کر تڑپا سکے کہ وہ اپنی زندگی یا اپنے دل میں کسی کو خدا کے برابر لا کھڑا کرے۔ شرک—خواہ وہ کسی بھی سطح پر ہو—انسانی روح کو اس طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے جیسا دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا سانحہ بھی نہیں کر سکتا۔ جب آپ اپنی روح کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ کسی مخلوق سے ویسی محبت کرے، ویسی تعظیم برتے یا اس کے آگے یوں سرنگوں ہو جائے جیسا صرف اللہ کے لیے سزاوار ہے، تو درحقیقت آپ روح کو ایک ایسے شکنجے میں جکڑ رہے ہوتے ہیں جس کے لیے وہ فطرتاً پیدا ہی نہیں کی گئی تھی۔ اس حقیقت کی ہولناکی کو دیکھنا ہو تو بس یہ دیکھ لیجیے کہ جب کسی شخص سے اُس کا وہ معبود چھن جاتا ہے، تو اُس کا کیا حشر ہوتا ہے۔

22 جولائی 2010 کو روزنامہ 'ٹائمز آف انڈیا' نے ایک دلدوز خبر شائع کی کہ ایک چالیس سالہ خاتون نے اپنے گھر میں خود پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا لی اور خودکشی کر لی۔ پولیس کے مطابق، یہ خودکشی بظاہر ایک "انتہائی قدم تھا کیونکہ وہ شادی کے 19 سال گزر جانے کے باوجود اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔"

اس واقعے سے محض چند دن قبل 16 جولائی کو، پولیس نے رپورٹ دی کہ ایک بائیس سالہ نوجوان نے "اپنی محبوبہ کے چھوڑ جانے کے غم میں خودکشی کر لی تھی۔"

اکثر لوگ ان بدنصیبوں کے درد کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کریں گے، اور اگر خود اس جگہ ہوتے تو شاید اُن کے دل بھی پاش پاش ہو جاتے۔ لیکن اگر زندگی میں اولاد کا ہونا یا کسی مخصوص انسان کا مل جانا ہی ہمارے جینے کا کل مقصد بن جائے، تو سمجھ لیجیے کہ بنیاد ہی میں کوئی ہولناک خرابی واقع ہو چکی ہے۔ اگر کوئی فانی، عارضی اور زوال پذیر شے ہماری زندگی کا محور و مرکز اور ہمارے وجود کا واحد جواز بن جائے، تو ہمارا ٹوٹ کر بکھر جانا یقینی ہے۔ وہ ناقص سہارے جنہیں ہم اپنے دل کا مرکز بنا لیتے ہیں، اپنی فطرت کے اعتبار سے لازماً زوال پذیر ہوں گے، ہمیں مایوس کریں گے یا مٹ جائیں گے۔ اور جیسے ہی وہ زائل ہوں گے، ہم بھی اندر سے ٹوٹ جائیں گے۔ ذرا سوچیے، اگر آپ کسی پہاڑ کی بلندی پر چڑھتے ہوئے اپنا سارا وزن ایک نازک سی ٹہنی پر ڈال دیں تو کیا ہوگا؟ طبیعیات کے قوانین بتاتے ہیں کہ وہ ٹہنی، جو اتنا بوجھ اٹھانے کے لیے بنائی ہی نہیں گئی تھی، چٹخ کر ٹوٹ جائے گی۔ اور ثقل کا قانون بتاتا ہے کہ پھر آپ کا پاتال میں گرنا یقینی ہے۔ یہ کوئی محض خیالی نظریہ نہیں، بلکہ مادی دنیا کی ایک اٹل سچائی ہے۔ اور یہی حقیقت روحانی کائنات کی بھی ایک لاتبدیل سچائی ہے، جس سے قرآنِ مجید نے ہمیں آگاہ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

"اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے، ذرا کان لگا کر سنو! اللہ کو چھوڑ کر جنہیں تم پکارتے ہو، وہ سب مل کر بھی ایک مکھی پیدا نہیں کر سکتے، اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے اس سے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مانگنے والے بھی کتنے کمزور ہیں اور جن سے مانگا جاتا ہے وہ بھی کتنے بے بس ہیں!"
(القرآن، سورۃ الحج: 73)

اس آیتِ مبارکہ کا پیغام کس قدر عمیق اور جھنجھوڑ دینے والا ہے۔ جب کبھی آپ کسی کمزور، بے بس اور عاجز شے کے پیچھے بھاگتے ہیں، اُس کی تمنا کرتے ہیں یا اُس کے آگے دستِ سوال دراز کرتے ہیں (اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کائنات کی ہر شے بذاتِ خود بے بس اور کمزور ہے)، تو آپ خود بھی کمزور اور بے بس ہو جاتے ہیں۔ اور اگر بالفرض آپ کو وہ مطلوبہ شے مل بھی جائے، تب بھی وہ آپ کے دل کو کبھی سیراب نہیں کر پائے گی۔ آپ کو بہت جلد کسی اور چیز کی تلاش میں نکلنا پڑے گا۔ آپ حقیقی سکون، قناعت اور طمانیت کو کبھی چھو بھی نہیں پائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اشیاء کے تبادلے اور نت نئے ماڈلز کے

جنون میں مبتلا معاشرے میں جی رہے ہیں؛ آپ کا فون، آپ کی گاڑی، آپ کا کمپیوٹر، یہاں تک کہ آپ کی شریکِ حیات یا آپ کا مرد—ہر چیز کو ایک نئے اور بظاہر بہتر ماڈل سے بدلا جا سکتا ہے۔

لیکن اس غلامی کے طوق سے آزادی کا ایک راستہ موجود ہے۔ جب وہ سہارا جس پر آپ اپنا سارا بوجھ ڈالتے ہیں لرزش سے پاک، ناقابلِ شکست اور لازوال ہو، تو پھر آپ کبھی گر نہیں سکتے۔ آپ کبھی ٹوٹ نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں اس ابدی سچائی کو یوں بیان فرماتا ہے:

"دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے بالکل الگ واضح ہو چکی ہے۔ پس جو کوئی باطل معبودوں کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، اُس نے ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔" (القرآن، سورۃ البقرۃ: 256)

جب آپ کا تھاما ہوا سہارا غیر متزلزل ہو، تو آپ خود بھی فولاد بن جاتے ہیں؛ اور اس طاقت کے بطن سے حقیقی آزادی جنم لیتی ہے۔ یہ وہی آزادی ہے جس کے بارے میں ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا تھا: "میرے دشمن میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ میری جنت اور میرا گلستان تو میرے سینے کے اندر ہے۔ میں جہاں بھی جاؤں، وہ میرے ساتھ ہیں، مجھ سے کبھی جدا نہیں ہوتے۔ میرے لیے قید تنہائی اپنے رب سے راز و نیاز کی خلوت ہے، میرا قتل ہو جانا شہادت ہے، اور مجھے اپنے وطن سے نکال دینا ایک روحانی سیاحت ہے!" (ابن القیم، الوابل الصیب، ص 69)

صرف اسی پاک ذات کو اپنی بندگی کا مرکز بنا کر، جو ہر عیب، زوال اور کمزوری سے پاک ہے، ابن تیمیہ نے اس دنیاوی قید خانے سے رہائی کا راستہ واضح کیا۔ انہوں نے ایک ایسے مومن کی تصویر کشی کی جس کا دل ہر قید سے آزاد ہے۔ یہ وہ دل ہے جو اس فانی دنیا اور اس کے اندر موجود ہر شے کی بندگی کی زنجیروں سے یکسر پاک ہے۔ یہ وہ دل ہے جو جانتا ہے کہ کائنات کا واحد حقیقی المیہ صرف توحید پر آنچ آنا ہے؛ وہ جانتا ہے کہ سب سے بڑی اور ناقابلِ تلافی مصیبت صرف یہ ہے کہ عبادت کے لائق ہستی کے سوا کسی اور کی بندگی کی جائے۔ یہ وہ دل ہے جو جانتا ہے کہ اصل قید خانہ صرف یہ ہے کہ دل کے تخت پر خدا کی جگہ کسی اور کو بٹھا دیا جائے۔ چاہے وہ شے انسان کی ذاتی خواہشات ہوں، اُس کا نفس ہو، دولت ہو، عہدہ ہو، شریکِ حیات ہو، اولاد ہو یا زندگی بھر کی نام نہاد محبت—اگر آپ نے اسے کل قرار دے دیا، تو وہ جھوٹا معبود آپ کو پھانس لے گا اور اپنا

غلام بنا لے گا۔ اور اس غلامی کی تپش اور اذیت، دنیا کے تمام مصائب و آلام کی مجموعی تکلیف سے کہیں زیادہ جان لیوا، عمیق اور دیرپا ہوگی۔

حضرت یونس علیہ السلام کے واقعے کو اپنے قلب و روح میں اتارنا کس قدر ناگزیر ہے۔ جب وہ مچھلی کے پیٹ کی گھٹن اور تاریکیوں میں محصور ہو گئے تھے، تو اُن کے پاس نجات کی صرف ایک ہی راہ باقی تھی: یکسو ہو کر اللہ کی طرف پلٹ آنا، اللہ کی توحید و بے نیازی کا اقرار کرنا، اور اپنی انسانی عاجزی و درماندگی کا اعتراف کرنا۔ اُن کی دعا اس ابدی سچائی کو کتنے والہانہ اور اثر انگیز پیرائے میں سموئے ہوئے ہے: "تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، بے شک میں ہی قصوروار تھا!" (القرآن، سورۃ الانبیاء: 87)

ہم میں سے بے شمار لوگ اپنی ہی خواہشات اور من پسند معبودوں کی مچھلی کے پیٹ میں پھنسے تڑپ رہے ہیں۔ یہ ہمارا اپنا ہی نفس ہے جس کے ہم غلام بن بیٹھے ہیں۔ اور یہ اسیری اس جرم کی پاداش ہے کہ ہم نے اپنے دل میں اس مقام پر کسی اور کو بٹھا دیا جو صرف اور صرف خدا کا حق تھا۔ ایسا کر کے ہم خود اپنے لیے بدترین اور سب سے زیادہ اذیت ناک قید خانہ تیار کرتے ہیں؛ کیونکہ دنیا کی کوئی جیل تو ہم سے صرف وہی کچھ چھین سکتی ہے جو عارضی، فانی اور فطرتاً ناقص ہے، لیکن یہ روحانی قید ہم سے وہ کچھ چھین لیتی ہے جو ازلی، ابدی اور کامل ترین ہے: یعنی خود ذاتِ باری تعالیٰ اور اُس کے ساتھ ہمارا تعلقِ بندگی۔

topqna.com

کیا یہ وہی محبت ہے جو میں محسوس کر رہی ہوں؟

Is this Love that I'm Feeling?

"محبت ایک سنگین ذہنی بیماری ہے۔" کم از کم افلاطون نے تو یہی کہا تھا۔ اور اگرچہ ہر وہ شخص جو کبھی نام نہاد 'محبت' کے دام میں گرفتار رہا ہو اس قول میں سچائی کی جھلک دیکھ سکتا ہے، لیکن درحقیقت یہاں ایک بنیادی اور فاش غلطی ہوئی ہے۔ محبت کوئی ذہنی بیماری نہیں ہے۔ یہ بیماری دراصل 'ہوس اور نفسانی خواہش' ہے۔

اگر 'محبت میں مبتلا ہونے' کا مفہوم یہ ہے کہ ہماری زندگیاں بکھر کر رہ جائیں، ہم اندر سے بالکل ٹوٹ پھوٹ جائیں، مستقل بے چینی اور کرب میں جلتے رہیں، معمولاتِ زندگی چلانے سے معذور ہو جائیں اور اس جنون کی خاطر سب کچھ قربان کرنے پر تل جائیں، تو پھر غالب امکان یہی ہے کہ یہ سرے سے محبت ہے ہی نہیں۔ ہماری مروجہ ثقافت ہمیں کچھ بھی سکھاتی رہے، مگر سچی اور پاکیزہ محبت انسان کو منشیات کے عادی کسی نشئی جیسا نہیں بنایا کرتی۔

چنانچہ، اُن فلموں کے بالکل برعکس جنہیں دیکھتے ہوئے ہم پروان چڑھے ہیں، وہ خود کو جلا کر راکھ کر دینے والا جنون دراصل محبت نہیں ہے۔ اس کا نام کچھ اور ہے۔ یہ 'ہویٰ' ہے—وہ لفظ جو قرآنِ مجید میں انسان کی سفلی خواہشات، بے لگام نفسانی ترنگوں اور شہوات کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اندھوں کی طرح اپنی خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں، سب سے زیادہ گمراہ قرار دیتا ہے: "پھر اگر وہ آپ کی بات نہ مانیں تو جان لیجیے کہ وہ محض اپنی خواہشات (ہویٰ) کی پیروی کر رہے ہیں۔ اور اُس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو سکتا ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے بغیر اپنی ہی خواہشات کے پیچھے چل پڑے؟" (القرآن، سورۃ القصص: 50)

اللہ کی ہدایت کے مقابلے میں اپنی نفسانی خواہش (ہویٰ) کے آگے سر جھکانا دراصل ان خواہشات کو پوجنے کا نام ہے۔ جب کسی شے کی پیاس اور چاہت ہمارے دل میں اللہ کی محبت سے زیادہ طاقتور ہو جائے،

تو گویا ہم نے اپنی اسی چاہت کو اپنا رب بنا لیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اُس کا شریک ٹھہراتے ہیں، اور اُن سے ویسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے ہونی چاہیے۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ اللہ کی محبت میں سب سے زیادہ شدید (اور والہانہ) ہیں۔" (القرآن، سورۃ البقرۃ: 165)

اگر کسی کے لیے ہماری نام نہاد 'محبت' ہمیں اس بات پر آمادہ کر دے کہ ہم اپنے خاندان، اپنی عزت و وقار، اپنی خودداری، اپنے جسم، اپنی عقل و ہوش، اپنے دل کا سکون، اپنے دین، اور یہاں تک کہ اپنے اُس رب کو بھی قربان کرنے پر تیار ہو جائیں جس نے ہمیں عدم سے وجود بخشا، تو جان لیجیے کہ ہم 'محبت' میں نہیں ہیں۔ ہم محض بدترین غلام بن چکے ہیں۔

ایسے ہی شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "کیا آپ نے اُس شخص کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش (ہویٰ) کو اپنا معبود بنا لیا؟ اور اللہ نے (اُس کے باطن کو) جانتے ہوئے اُسے گمراہی میں چھوڑ دیا، اور اُس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی، اور اُس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔" (القرآن، سورۃ الجاثیۃ: 23)

ذرا اس عذاب کی سنگینی کا تصور تو کیجیے۔ انسان کی بینائی، سماعت اور دل—سب کے سب مہر بند ہو جائیں! نفس کی یہ خواہش (ہویٰ) کوئی لذت نہیں ہے۔ یہ ایک قید خانہ ہے۔ یہ عقل، جسم اور روح کی بدترین غلامی ہے۔ یہ ایک نشہ اور ایک بت پرستی ہے۔ اس تلخ حقیقت کی جھلکیاں ہمیں ادب کے شاہکاروں میں جا بجا ملتی ہیں۔ چارلس ڈکنز کے ناول 'گریٹ ایکسپیکٹیشنز' (Great Expectations) میں پِپ (Pip) کا کردار اسی کیفیت کی واضح مثال ہے۔ ایسٹیلا (Estella) کے لیے اپنے بیمار جنون کو بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے: "میں انتہائی دلی رنج کے ساتھ، بار بار، بلکہ ہمیشہ یہ جانتا تھا کہ میں اُس سے عقل کے خلاف، ہر وعدے کے خلاف، دلی سکون کے خلاف، ہر امید کے خلاف، خوشی کے خلاف اور ہر ممکنہ مایوس کن رکاوٹ کے خلاف محبت کر رہا ہوں۔"

ڈکنز ہی کے ناول کا کردار مس ہیوشم (Miss Havisham) اس کیفیت کی یوں وضاحت کرتی ہے: "میں تمہیں بتاتی ہوں کہ اصل محبت کیا ہوتی ہے... یہ اندھی عقیدت ہے، بلا چوں و چرا اپنی تذلیل کروانا ہے، مکمل وارفتگی و سر تسلیم خم کرنا ہے، اپنے آپ اور ساری دنیا کے خلاف جا کر یقین و اعتبار کرنا ہے، اور اپنا دل و

جان اُس کے حوالے کر دینا ہے جو آپ پر وار کر کے آپ کو گھائل کرتا ہے—بالکل ویسے ہی جیسے میں نے کیا تھا!"

مس ہیوشم نے یہاں جس کیفیت کی تصویر کشی کی ہے، وہ بلاشبہ وجود تو رکھتی ہے، مگر وہ حقیقی محبت ہرگز نہیں ہے۔ وہ 'ہویٰ' (نفس کا اندھا جنون) ہے۔ حقیقی محبت، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ارادہ فرمایا ہے، کوئی بیماری یا نشہ نہیں ہے۔ وہ تو دلی الفت اور باہمی رحمت کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کتابِ مبین میں ارشاد فرماتا ہے: "اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم اُن کے پاس سکون حاصل کرو، اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ بے شک اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔" (القرآن، سورۃ الروم: 21)

حقیقی محبت اپنے جلو میں سکون اور طمانیت لے کر آتی ہے—کوئی اندرونی عذاب یا ذہنی کرب نہیں۔ سچی محبت آپ کو اپنے نفس اور اپنے رب کے ساتھ صلح اور آشتی کے عالم میں رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے فرمایا: "تاکہ تم اُن سے سکون پا سکو۔" اس کے برعکس، نفسانی خواہش (ہویٰ) اس کی ضد ہے۔ ہویٰ آپ کو بے چین اور بدحال بنا کر چھوڑتی ہے۔ اور کسی نشے کی طرح، آپ ہر دم اس کے لیے تڑپتے رہیں گے، مگر کبھی سیر نہیں ہو پائیں گے۔ آپ اپنے ہی وجود کا زیاں کر کے اس کے پیچھے دوڑیں گے، مگر اسے پا نہ سکیں گے۔ اور چاہے آپ اپنا تن، من اور دھن سب کچھ اس کے قدموں میں نچھاور کر دیں، یہ آپ کی جھولی میں سچی خوشی کا ایک پل بھی نہیں ڈال سکتی۔

پس چونکہ حقیقی مسرت اور طمانیت ہر انسان کا مطلوب و مقصود ہے، لیکن دھوکے اور فریب کے پردوں کو چیر کر سچی محبت اور نفسانی خواہش (ہویٰ) کے درمیان فرق کرنا اکثر دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک ایسا آزمودہ اور یقینی پیمانہ ہے جو کبھی خطا نہیں کھاتا، اور وہ یہ ہے کہ آپ اپنے آپ سے یہ سوال پوچھیں: کیا اُس شخص سے قربت جس سے میں نام نہاد 'محبت' کرتا ہوں، مجھے اللہ کے قریب لا رہی ہے یا اُس سے دور دھکیل رہی ہے؟ دوسرے لفظوں میں، کیا اس انسان نے میرے دل میں اللہ کی جگہ تو نہیں چھین لی؟

سچی اور پاکیزہ محبت کو اللہ کی محبت سے کبھی متصادم یا حریف نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اسے تو اللہ کی محبت کو مزید جلا بخشنی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ سچی محبت کا تصور صرف اور صرف انہی حدود کے اندر ممکن ہے

جنہیں اللہ نے حلال اور جائز ٹھہرایا ہے۔ ان حدود سے باہر، یہ نفسانی خواہش (ہویٰ) کے سوا کچھ نہیں، جس کے آگے یا تو ہم ہتھیار ڈال دیتے ہیں یا پھر اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ ہم یا تو اللہ کے بندے ہو سکتے ہیں، یا پھر اپنی خواہشاتِ نفس کے غلام۔بیک وقت دونوں کا بندہ ہونا ممکن نہیں۔

جھوٹی اور سراب نما لذتوں کے خلاف جہاد کر کے ہی ہم حقیقی اور دائمی سرور حاصل کر سکتے ہیں؛ کیونکہ یہ دونوں اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں،بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں۔یہی وجہ ہے کہ اپنی نفسانی خواہشات کے خلاف مجاہدہ جنت کے حصول کی پہلی اور بنیادی شرط ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اور جو شخص اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا اور اپنے نفس کو (حرام) خواہشات سے روکے رکھا، تو بے شک جنت ہی اُس کا ٹھکانا ہوگی۔" (القرآن، سورۃ النازعات: 40-41)

topqna.com

محبت فضاؤں میں ہے

Love is in the Air

محبت فضاؤں میں رچی بسی ہے !

...یا کم از کم اشتہار بازی کرنے والی کمپنیاں فروری کے مہینے میں آپ سے یہی سوچوانا چاہتی ہیں۔ اگرچہ اپنوں سے محبت کا اظہار بار بار کرنا ایک خوشگوار بات ہے، مگر ویلنٹائن ڈے سال میں صرف ایک بار آتا ہے اور آپ کو مجبور کر دیتا ہے کہ آپ ہر صورت اظہار کریں، ورنہ آپ پر سنگ دل اور بے حس ہونے کا ٹھپہ لگنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ پھولوں اور چاکلیٹ کی دکانوں کے مالکان کے لیے تو گویا عید فروری ہی میں آجاتی ہے۔

تاہم، تجارتی رنگ میں رنگے ان مصنوعی جذبات کے طوفان میں بھی، انسان اُن ہستیوں کے خیال سے شاید ہی اپنا دامن بچا پائے جن سے وہ سچی محبت کرتا ہے۔ اور جب ہم ایسا سوچتے ہیں، تو لازمی طور پر کچھ بنیادی اور فیصلہ کن سوالات ہمارے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔

مجھے ان سوالات کی یاد اس وقت آئی جب میں نے اپنی ایک سہیلی کی کہی ہوئی بات پر گہرے غور و خوض کیا۔ وہ بیان کر رہی تھی کہ اپنے محبوب کے ساتھ ہونا کیسا محسوس ہوتا ہے۔ اُس کے الفاظ میں: "جب ہم ساتھ ہوتے ہیں، تو یوں لگتا ہے جیسے ساری دنیا غائب ہو گئی ہو۔" جوں جوں میں اُس کے اس جملے پر غور کرتی گئی، اُس کا اثر میرے دل پر گہرا ہوتا چلا گیا، اور اس نے مجھے ایک گہری سوچ میں مبتلا کر دیا۔

بحیثیتِ انسان، ہمارے خمیر میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ ہم دوسروں کے لیے محبت اور قلبی وابستگی محسوس کریں۔ یہ ہماری انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ لیکن اگر ہم ایک فانی انسان کے لیے ایسا عالم محسوس کر سکتے ہیں، تو ذرا سوچیے کہ دن میں پانچ مرتبہ ہم اپنے رب اور خالق کے روبرو پیشی اور ملاقات کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ میں سوچنے لگی کہ اُس کے دربارِ عالی میں کھڑے ہو کر ہمارے ساتھ کتنی بار ایسا ہوا ہے کہ

ہمارے سامنے سے یہ ساری دنیا غائب ہو گئی ہو؟ کیا ہم واقعی یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ہماری اللہ سے محبت کسی بھی انسان اور کسی بھی دوسری شے سے بڑھ کر ہے؟

اکثر ہمارا یہ گمان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف مصائب اور تنگیوں ہی کے ذریعے ہماری آزمائش کرتا ہے، مگر یہ سچ نہیں ہے۔ اللہ تو آسائشوں اور فراخی کے ذریعے بھی آزماتا ہے۔ وہ ہمیں اپنی نعمتوں اور ہماری پسندیدہ چیزوں کے ذریعے پرکھتا ہے، اور کڑوی حقیقت یہ ہے کہ انہی آزمائشوں میں ہم میں سے اکثر لوگ بری طرح ناکام ہو جاتے ہیں۔ ہم اس لیے ناکام ہوتے ہیں کیونکہ جب اللہ ہمیں یہ نعمتیں عطا فرماتا ہے، تو ہم نادانستہ طور پر انہیں اپنے دل کے جھوٹے بت بنا بیٹھتے ہیں۔

جب اللہ ہمیں مال و دولت کی نعمت سے نوازتا ہے، تو ہم اللہ کے بجائے اُس پیسے پر تکیہ کرنے لگتے ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے رزق کا منبع یہ پیسہ نہ کبھی تھا اور نہ ہو سکتا ہے، بلکہ اصل رازق تو وہ ذات ہے جس نے یہ دولت عطا کی۔ اچانک ہم اپنے کاروبار کو نقصان سے بچانے کے لیے شراب بیچنے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں، یا مالی تحفظ کے جھوٹے احساس کی خاطر سود پر قرض لینے لگتے ہیں۔ اور یوں ہم کس قدر حماقت اور ستم ظریفی سے، محض رزق کو بچانے کی خاطر، خود 'رازق' کی نافرمانی کے مرتکب ہو رہے ہوتے ہیں۔

اور جب اللہ ہمیں کسی ایسے شخص کی محبت کا تحفہ دیتا ہے جس سے ہم دل لگاتے ہیں، تو ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اس نعمت کا اصل سرچشمہ اللہ کی ذات ہے؛ اور ہم اس انسان سے ویسی محبت کرنے لگتے ہیں جیسی صرف اللہ سے ہونی چاہیے۔ وہ شخص ہماری کائنات کا محور بن جاتا ہے—ہماری تمام تر فکریں، سوچیں، منصوبے، خوف اور امیدیں بس اسی کی ذات کے گرد گھومنے لگتے ہیں۔ اگر وہ ہمارا شریکِ حیات نہ ہو، تو محض اس کے ساتھ رہنے کے لیے ہم بسا اوقات حرام میں مبتلا ہونے پر بھی تل جاتے ہیں۔ اور اگر وہ ہمیں چھوڑ کر چلا جائے، تو ہماری پوری دنیا ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اب ہم نے اپنی پرستش کا رخ نعمت کے اصل عطا کرنے والے سے موڑ کر خود اس فانی نعمت کی طرف کر دیا ہے۔

ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اُس کے ہمسر بناتے ہیں۔ وہ اُن سے ویسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیے۔ مگر جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ اللہ کی محبت میں سب سے زیادہ پختہ اور شدید ہیں۔" (القرآن، سورۃ البقرۃ: 165)

نعمتیں مل جانے کے بعد انسان کے بصیرت کھو بیٹھنے کے اسی فطری میلان کے پیشِ نظر، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں ہمیں یوں خبردار فرمایا ہے: "(اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا کنبہ، وہ مال جو تم نے کمایا ہے، وہ تجارت جس کے ماند پڑنے کا تمہیں دھڑکا لگا رہتا ہے، اور وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں—تمہیں اللہ، اُس کے رسول اور اُس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں، تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرما دے۔ اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔" (القرآن، سورۃ التوبۃ: 24)

یہ نکتہ نہایت غور طلب ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں جن تمام چیزوں کا ذکر آیا ہے، اُن سے محبت کرنا فی نفسہٖ حلال اور جائز ہے، بلکہ وہ بذاتِ خود اللہ کی بخشی ہوئی نعمتیں ہیں۔ درحقیقت، ان میں سے بعض نعمتیں تو اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔ ایک طرف اللہ فرماتا ہے: "اور اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اُس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم اُن سے سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان الفت اور رحمت پیدا کر دی۔ بے شک اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔" (القرآن، سورۃ الروم: 21)

لیکن دوسری طرف اللہ تعالیٰ یہ تنبیہ بھی فرماتا ہے: "اے ایمان والو! بے شک تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں، لہٰذا اُن سے ہوشیار رہو۔" (القرآن، سورۃ التغابن: 14)

اس آیتِ مبارکہ میں دی گئی تنبیہ غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ ہماری شریکِ حیات اور ہماری اولاد کا ذکر یہاں خاص طور پر اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ وہ ان تمام نعمتوں میں شامل ہیں جن سے ہم سب سے زیادہ ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ اور یاد رکھیے، جس چیز سے آپ سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں، وہیں آپ کی زندگی کی سب سے کڑی آزمائش چھپی ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر اس آزمائش پر فتح پانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم محبت بھرے کارڈز اور گلاب کے پھولوں کی چکاچوند سے پرے اُس عظیم تر اور دائمی محبت کو دیکھ سکیں جو ہماری منتظر ہے، تو پھر ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اور بھلا اس حقیقت کا ادراک کرنے کے لیے موجودہ دور سے زیادہ موزوں وقت اور کون سا ہو سکتا ہے؟

کیونکہ آخرکار، محبت فضاؤں میں جو رچی بسی ہے۔

topqna.com

حقیقی محبت یہ ہے

This is Love

اور دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی تمام تر زندگی تلاش میں گزار دیتے ہیں۔ کبھی دیتے ہیں تو کبھی لیتے ہیں۔ کبھی کسی کے تعاقب میں بھاگتے ہیں، لیکن اکثر و بیشتر بس انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اُن کا یہ ماننا ہوتا ہے کہ محبت کوئی ایسا مقام ہے جہاں پہنچا جاتا ہے: کسی طویل شاہراہ کے اختتام پر واقع ایک منزلِ مقصود۔ اور وہ اس لمحے کے لیے بے تاب رہتے ہیں جب وہ سفر ختم ہو اور وہ منزل آ جائے۔ یہ وہ دل ہوتے ہیں جو دوسروں کے دلوں کی جنبش سے مچل اٹھتے ہیں؛ وہ ناقابلِ علاج حد تک رومان پرور لوگ، جو کسی بھی پریم کہانی یا سچی عقیدت کے مخلصانہ اظہار پر فوراً اپنا دل ہار بیٹھتے ہیں۔ اُن کے لیے یہ تلاش دراصل عمر بھر کا ایک ایسا جنون بن جاتی ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔

مگر اس الم ناک 'تلاش' کے جہاں کچھ نقصانات ہیں، وہیں اس کے کچھ تحائف اور انعامات بھی ہیں۔ امیدوں کا یہ راستہ اور 'محبت کی محبت میں مبتلا ہو جانے' کا یہ سفر انتہائی دردناک ہوتا ہے، لیکن یہ اپنے دامن میں انمول اسباق بھی لیے ہوتا ہے۔ محبت کی فطرت، اس فانی دنیا کی حقیقت، انسانوں کی اصلیت اور خود اپنے دل کے بھیدوں سے متعلق اسباق اس پرخار راستے کے سنگِ میل بنتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ، یہ راستہ محبت کے اصل خالق کی معرفت کے اسباق عطا کرتا ہے۔

جو لوگ اس راستے پر چلتے ہیں، وہ بالآخر اکثر اس معرفت تک پہنچ جاتے ہیں کہ جس انسانی محبت کی انہیں تلاش تھی، وہ اصل منزل تھی ہی نہیں۔ انسانی محبت کی کوئی صورت ایک عطیہ ضرور ہو سکتی ہے؛ وہ ایک ذریعہ اور وسیلہ تو بن سکتی ہے، مگر جس لمحے آپ نے اسے ہی اپنی اصل منزل اور انتہا بنا لیا، آپ اوندھے منہ گر پڑیں گے۔ اور پھر آپ کی ساری زندگی ایک غلط سمت اور غلط مرکز کے گرد گھومتی رہے گی۔ آپ محض وسیلے کی خاطر اپنے اصل مقصد کو قربان کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ آپ دنیاوی کمال اور بے عیب پن

لی ایک ایسی نام نہاد 'منزل' تک پہنچنے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دیں گے، جس کا اس کائنات میں کوئی سرے سے وجود ہی نہیں۔

اور جو شخص سراب کے پیچھے دوڑتا ہے، وہ کبھی پانی تک نہیں پہنچ پاتا، مگر پھر بھی دوڑتا ہی چلا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح آپ بھی مسلسل بھاگتے رہیں گے، اپنی راتوں کی نیندیں لٹائیں گے، آنسو بہائیں گے، خون جگر جلائیں گے اور اپنے وجود کے قیمتی ترین حصوں کو—یہاں تک کہ بعض اوقات اپنی خودداری اور عزتِ نفس کو بھی—قربان کرتے رہیں گے۔ آپ اس زندگی میں وہ چیز کبھی حاصل نہ کر پائیں گے جس کے آپ متلاشی ہیں، کیونکہ جو کمال آپ ڈھونڈ رہے ہیں وہ کوئی دنیاوی منزل ہے ہی نہیں۔ جس بے داغ اور کامل خوبصورتی کی تلاش میں آپ بھٹک رہے ہیں، وہ اس مادی کائنات میں مل ہی نہیں سکتی۔ وہ تو صرف اور صرف ذاتِ الٰہی میں پائی جاتی ہے۔

انسانی محبت کا وہ عکس جس کی آپ کو طلب ہے، زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں ایک سراب کے سوا کچھ نہیں۔ لہٰذا اگر آپ کا مطلوب وہی ہے، تو آپ ساری عمر تعاقب ہی کرتے رہ جائیں گے۔ لیکن آپ سراب کے چاہے کتنے ہی قریب کیوں نہ پہنچ جائیں، آپ اسے کبھی چھو نہیں سکتے۔ آپ کسی عکس کے مالک نہیں بن سکتے۔ آپ اپنے ہی ذہن کے تراشے ہوئے ایک خیالی ہیولے کو اپنی گرفت میں نہیں لا سکتے۔

اس کے باوجود، آپ اس خیالی 'مقام' تک پہنچنے کے لیے اپنی پوری زندگی لٹا دیتے ہیں۔ آپ ایسا اس لیے کرتے ہیں کیونکہ پریوں کی کہانیوں میں داستان وہیں آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ وہ محبوب کے مل جانے، ملن کی گھڑی اور شادی کے بندھن پر تمام ہوتی ہے۔ وہ دو روحوں کے یکجا ہو جانے پر منتج ہوتی ہے۔ اور آپ کے ارد گرد موجود ہر شخص آپ کو یہی باور کرواتا ہے کہ آپ کا سفر بس وہیں ختم ہو جاتا ہے: اُس موڑ پر جہاں آپ کو اپنا ہم نفس اور اپنا گمشدہ ادھورا حصہ مل جائے—یعنی اُس مقام پر جہاں آپ کا نکاح ہو جائے۔ وہ آپ کو بتاتے ہیں کہ تب، اور صرف تب ہی آپ کا ادھورا پن دور ہوگا اور آپ مکمل انسان بن پائیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک کھلا فریب ہے؛ کیونکہ ذات کی تکمیل خدا کے سوا کائنات کی کسی شے میں ممکن ہی نہیں۔

مگر آپ کو تو بچپن ہی سے یہی سبق پڑھایا گیا ہے—ہر کہانی، ہر گیت، ہر فلم، ہر اشتہار اور خلوص نیت سے نصیحت کرنے والی ہر آنٹی کی طرف سے—کہ اس رشتے کے بغیر آپ کا وجود ادھورا اور نامکمل ہے۔ اور اگر

خدانخواستہ آپ کا شمار اُن 'محروموں' میں ہوتا ہے جن کی شادی نہیں ہو سکی، یا جن کی طلاق ہو چکی ہے، تو معاشرہ آپ کو کسی نہ کسی طور ناقص اور نامکمل گردانتا ہے۔

آپ کو یہی سکھایا جاتا ہے کہ شادی کے منڈپ پر کہانی ختم ہو جاتی ہے، اور وہیں سے گویا جنت کا آغاز ہوتا ہے۔ وہیں آپ کو نجات مل جائے گی، آپ کا وجود کامل ہو جائے گا، اور ماضی کا ہر ٹوٹا ہوا شیشہ جڑ جائے گا۔ بس ایک ہی مصیبت ہے، اور وہ یہ کہ کہانی وہاں ختم نہیں ہوتی! بلکہ کہانی تو وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ وہاں سے اصل تعمیر کا آغاز ہوتا ہے: زندگی کی تعمیر، کردار کی تعمیر، صبر، استقامت، قربانی اور ایثار کی تعمیر۔ بے غرضی کی تعمیر۔ اور حقیقی محبت کی تعمیر۔

اور اپنے رب کی طرف پلٹنے والے راستے کی تعمیر۔

لیکن اگر وہ انسان جس سے آپ نے شادی کی ہے آپ کی زندگی کا کل مرکز و محور بن جائے، تو سمجھ لیجیے کہ آپ کی اصل آزمائش ابھی شروع ہوئی ہے۔ اب آپ کا شریکِ حیات آپ کی زندگی کا سب سے بڑا امتحان بن جائے گا۔ جب تک آپ اُس انسان کو اپنے دل کے اُس تخت سے نہیں اتار پھینکتے جو صرف اللہ کا حق ہے، یہ زخم مسلسل دکھتا رہے گا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس تکلیف دہ جراحی اور دل سے اُس بت کو نکالنے کے عمل میں آپ کا شریکِ حیات ہی وہ آلہ کار بنے گا جو آپ کو دکھ دے گا، تاآنکہ آپ یہ ابدی سبق سیکھ لیں کہ انسانی دل میں کچھ گوشے ایسے ہوتے ہیں جنہیں صرف خدا نے بنایا ہے اور وہ صرف اور صرف خدا ہی کے لیے ہیں۔

اس راستے پر نقصانات، فائدوں، ناکامیوں، کامیابیوں اور بے شمار خطاؤں کے طویل سفر کے بعد جو دیگر اسباق آپ سیکھ سکتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ محبت کی کم از کم دو اقسام ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ وہ ہوں گے جن سے آپ اس لیے محبت کرتے ہیں کیونکہ آپ کو ان سے کچھ حاصل ہوتا ہے: جو کچھ وہ آپ کو دیتے ہیں، یا جس طرح کا خوشگوار احساس وہ آپ کے اندر بیدار کرتے ہیں۔ دنیا میں محبت کی غالب اکثریت شاید اسی نوعیت کی ہوتی ہے—اور یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی محبت میں اتنا تذبذب اور عدم استحکام پایا جاتا ہے۔ کسی انسان کے عطا کرنے کی صلاحیت غیر مستقل اور بدلتی رہتی ہے۔ اور جو کچھ آپ کو دیا جاتا ہے اُس پر آپ کا اپنا ردعمل بھی متغیر اور تغیر پذیر ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ محض کسی جذبے اور احساس کے پیچھے بھاگ

رہے ہیں، تو آپ عمر بھر بھاگتے ہی رہ جائیں گے۔ کوئی بھی احساس ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔ اگر محبت کا دارومدار اس پر ہو، تو وہ بھی غیر مستقل اور زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ اور اس دنیا کی ہر چیز کی مانند، جتنا آپ اس کے پیچھے بھا گیں گے، وہ اتنا ہی آپ سے دور بھاگے گی۔

لیکن کبھی کبھار، آپ کی زندگی میں ایسے لوگ بھی تشریف لاتے ہیں جن سے آپ محبت کرتے ہیں—اس لیے نہیں کہ وہ آپ کو کیا دیتے ہیں—بلکہ اس لیے کہ وہ خود کیا ہیں۔ آپ اُن کے اندر جو حسن و خیر دیکھتے ہیں وہ درحقیقت خالقِ کائنات کے حسن کا ایک پرتو ہوتا ہے، اس لیے آپ اُن سے محبت کرتے ہیں۔ اب یکلخت یہ معاملہ اس کا نہیں رہتا کہ آپ کو کیا مل رہا ہے، بلکہ یہ بن جاتا ہے کہ آپ کیا دے سکتے ہیں۔ یہ بے غرض اور پاکیزہ محبت ہے۔ یہ دوسری قسم کی محبت نایاب ترین ہے۔ اور اگر اس کی بنیاد اللہ کی محبت پر ہو، اور وہ اللہ کی محبت کی حریف بن کر نہ کھڑی ہو، تو یہ انسان کی جھولی میں بے پناہ مسرت اور روحانی سرور ڈال دیتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور طریقے سے محبت کرنا دراصل احتیاج، محتاجی اور توقعات وابستہ کرنے کا نام ہے— اور یہی وہ اجزاء ہیں جو انسان کو بدحالی، مایوسی اور کرب کے سوا کچھ نہیں دیتے۔

چنانچہ اُن تمام لوگوں کے لیے جنہوں نے اپنی عمریں تلاش میں گنوا دیں، یہ جان لینا لازم ہے کہ ہر شے کا اصل نکھار اور پاکیزگی اُس کے منبع اور چشمے ہی پر ملتی ہے۔ اگر آپ کو محبت کی طلب ہے، تو اسے اللہ کے واسطے سے تلاش کیجیے۔ ہر وہ ندی جس کی بنیاد اللہ کی محبت پر نہ ہو، اپنے پیاسے کو زہر کے سوا کچھ نہیں پلاتی۔ اور وہ پیاسا اس ندی سے پیتا ہی چلا جائے گا، تاآنکہ وہ زہر اُسے موت کی دہلیز پر نہ پہنچا دے۔ وہ اندر ہی اندر لمحہ بہ لمحہ مرتا رہے گا، یہاں تک کہ وہ رُک جائے اور آبِ حیات کے اصل، شفاف اور پاکیزہ چشمے کو تلاش کر لے۔

جب آپ ہر خوبصورت شے کو محض ذاتِ باری تعالیٰ کے حسن کا ایک عکس جان کر دیکھنے لگیں گے، تو آپ محبت کا صحیح اور سچا سلیقہ سیکھ جائیں گے: یعنی اللہ کی رضا کی خاطر محبت کرنا۔ پھر آپ جس کسی سے اور جس چیز سے بھی محبت کریں گے، وہ اللہ کے لیے، اللہ کے ذریعے اور اللہ ہی کے سبب ہوگی۔ ایسی محبت کی بنیاد خود ذاتِ الٰہی ہے۔ چنانچہ جس سہارے کو آپ تھامیں گے وہ اب کوئی متزلزل احساس یا عارضی جذبہ نہیں رہے گا۔ اور جس کے پیچھے آپ چلیں گے وہ کوئی وقتی سرور نہیں ہوگا۔ جسے آپ تھامیں گے، جس کی آپ جستجو کریں گے، اور جس سے آپ محبت کریں گے، وہ ذاتِ باری تعالیٰ ہوگی: کائنات کی واحد غیر

متزلزل، لاتبدیل اور دائمی حقیقت ! اس کے بعد، ہر شے کا رشتہ اُسی کے واسطے سے جڑے گا۔ آپ جو کچھ دیں گے یا لیں گے، جس سے محبت کریں گے یا کنارہ کشی اختیار کریں گے، وہ سب اللہ ہی کے لیے ہوگا؛ آپ کے نفس کی خاطر نہیں۔ وہ صرف اُس کی رضا کے لیے ہوگا؛ آپ کی انا کے لیے نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اسی سے محبت کریں گے جس سے اللہ محبت کرتا ہے، اور اُس سے محبت نہیں کریں گے جس سے وہ محبت نہیں کرتا۔ اور جب آپ محبت کریں گے، تو مخلوق کو عطا کریں گے—اس غرض سے نہیں کہ بدلے میں آپ کو اُن سے کچھ ملے گا۔ آپ محبت نچھاور کریں گے اور سخاوت برتیں گے، لیکن آپ کے لیے صرف آپ کا رب کافی ہوگا۔ اور جس کے لیے اللہ کافی ہو جائے، وہ تمام محبت کرنے والوں میں سب سے زیادہ غنی اور سب سے زیادہ سخی ہوتا ہے۔ آپ کی محبت اللہ کی توفیق سے ہوگی، اللہ کے لیے ہوگی، اور اللہ ہی کے سبب ہوگی۔ یہ نفس کی وہ معراج ہے جہاں وہ کسی بھی مخلوق کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور یہی حقیقی آزادی ہے۔ یہی سچی خوشی ہے۔

حقیقی محبت یہ ہے !

topqna.com

حقیقت سے دل لگاؤ

Fall in Love with the Real Thing

کسی چیز کو دل سے رخصت کر دینا کبھی آسان نہیں ہوتا۔ یا کیا یہ واقعی آسان ہو سکتا ہے؟ ہم میں سے بیشتر لوگ اس بات پر متفق ہوں گے کہ اپنے محبوب سے دستبردار ہو جانے سے زیادہ کٹھن کام شاید ہی کوئی ہو۔ اور اس کے باوجود، بعض اوقات ہمیں بالکل یہی کرنا پڑتا ہے۔ کبھی ہم ان چیزوں سے دل لگا بیٹھتے ہیں جنہیں ہم پا نہیں سکتے۔ کبھی ہم وہ سب کچھ چاہتے ہیں جو ہمارے حق میں زہرِ قاتل ہے۔ اور کبھی ہم اُس شے سے محبت کرنے لگتے ہیں جسے اللہ پسند نہیں فرماتا۔ ان چیزوں سے دامن چھڑانا بڑا ہی جانگسل کام ہے۔ جس شے پر دل فریفتہ ہو، اُسے چھوڑ دینا ان کڑی ترین جنگوں میں سے ایک ہے جو انسان کو اپنی زندگی میں لڑنا پڑتی ہیں۔

لیکن کیا ہی اچھا ہو اگر یہ اتنی بڑی جنگ نہ بننی پڑے؟ کیا ایسا ممکن ہے کہ یہ عمل اتنا جاں گسل نہ رہے؟ کیا کسی قلبی وابستگی اور بندھن سے آزاد ہونے کا کوئی آسان راستہ بھی ہو سکتا ہے؟ جی ہاں! بالکل ہے۔

کسی برتر اور بہتر شے کو تلاش کر لیجیے۔

سیانوں کا قول ہے کہ انسان کسی کی یاد سے اس وقت تک پیچھا نہیں چھڑا سکتا جب تک کہ اُسے کوئی اس سے بہتر انسان یا اس سے برتر شے نہ مل جائے۔ بحیثیتِ انسان، ہم دل کے خالی پن اور خلا کو برداشت کرنے کی تاب نہیں رکھتے۔ ہر خالی جگہ کو پر ہونا ہی ہوتا ہے؛ اور وہ بھی فوراً! اس خلا کی کسک اور درد اس قدر شدید ہوتا ہے کہ وہ انسان کو اُس جگہ کو بھرنے پر مجبور کر کے دم لیتا ہے۔ دل کے کسی کونے میں خلا کا ایک لمحہ بھی ناقابلِ برداشت اذیت کا باعث بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دل کو بہلانے کے لیے ایک مشغلے سے دوسرے مشغلے، اور ایک تعلق سے دوسرے تعلق کی طرف دیوانہ وار بھاگتے پھرتے ہیں۔

دل کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں، ہم جھوٹے سہاروں اور باطل انحصار کی زنجیروں کو توڑنے پر بڑی لمبی چوڑی گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن پھر ہمیشہ یہ سوال آکھڑا ہوتا ہے کہ 'آخر کیسے؟' جب کسی فانی شے سے جھوٹا قلبی لگاؤ پیدا ہو جائے، تو اس کے جال سے کیسے نکلیں؟ بظاہر یہ کام ناممکن حد تک مشکل دکھائی دیتا ہے۔

ہم چیزوں کے عادی اور نشئی بن جاتے ہیں، اور ایسا لگتا ہے کہ ہم انہیں چھوڑنے کے قابل ہی نہیں رہے۔ اگرچہ وہ ہمیں گہرے گھاؤ دے رہی ہوں۔ اگرچہ وہ ہماری زندگیوں اور اللہ کے ساتھ ہمارے تعلق کو برباد کر رہی ہوں۔ اگرچہ وہ ہمارے حق میں حد درجہ زہریلی اور نقصان دہ ہی کیوں نہ ہوں۔ ہم بس انہیں چھوڑ نہیں پاتے۔ ہم ان پر حد سے زیادہ انحصار کر بیٹھتے ہیں۔ ہم ان سے حد سے زیادہ اور ایک غلط انداز میں محبت کرتے ہیں۔ وہ ہمارے اندر کے کسی ایسے خلا کو پر کرتی ہیں جس کے بارے میں ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری ناگزیر ضرورت ہے... جس کے بغیر ہم جی ہی نہیں سکتے۔ اور چنانچہ، جب ہم انہیں چھوڑنے کی جدوجہد کرتے بھی ہیں، تو اکثر ہمت ہار کر اس جدوجہد کو ادھورا چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ یہ راستہ بہت کٹھن محسوس ہوتا ہے۔

آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہمیں اپنی پسندیدہ چیزوں کو اللہ کی پسند پر قربان کرنے میں اتنی شدید دشواری کیوں پیش آتی ہے؟ ہم آخر چیزوں کو دل سے کیوں نہیں نکال پاتے؟ میرے خیال میں، اپنی محبوب چیزوں کو چھوڑنے میں ہمیں اتنی شدید مشقت اس لیے جھیلنا پڑتی ہے کیونکہ ہمیں دل کے اس تخت پر بٹھانے کے لیے کوئی ایسی ذات ملی ہی نہیں جس سے ہم اس سے بھی کہیں زیادہ ٹوٹ کر محبت کر سکیں۔

جب کوئی معصوم بچہ کھلونا گاڑی پر فریفتہ ہو جاتا ہے، تو وہ اس کی محبت میں ہمہ تن ڈوب جاتا ہے۔ لیکن کیا ہو اگر وہ گاڑی اُسے نہ مل سکے؟ کیا ہو اگر اُسے ہر روز اُس دکان کے سامنے سے گزرنا پڑے اور شیشے کے پیچھے وہ کھلونا دیکھنا پڑے جسے وہ خرید نہیں سکتا؟ ہر بار گزرتے ہوئے اُس کا دل کڑھے گا اور تکلیف محسوس کرے گا۔ اور شاید اُسے اس وسوسے سے بھی لڑنا پڑے کہ کہیں وہ اُسے چرا نہ لے۔ لیکن ذرا سوچیے، کیا ہو اگر وہ بچہ دکان کی کھڑکی سے ذرا پرے نگاہ دوڑائے اور اُسے سڑک پر کھڑی ایک 'حقیقی گاڑی' نظر آجائے؟ کیا ہو اگر وہ سامنے چمکتی ہوئی ایک اصلی فراری (Ferrari) دیکھ لے؟ کیا تب بھی وہ اُس پلاسٹک کے کھلونے کی حسرت میں تڑپتا رہے گا؟ کیا تب بھی اُسے کھلونا چرانے کے وسوسے سے جنگ لڑنا پڑے گی؟ یا وہ اُس

کھلونے کے پاس سے یوں ہی بے نیازی سے گزر جائے گا—جہاں عظمت کے اس لامتناہی فرق نے اُس کی تمام تر اندرونی کشمکش کو پل بھر میں فنا کر دیا ہو؟

ہم محبت چاہتے ہیں۔ ہم دولت چاہتے ہیں۔ ہم جاہ و منصب چاہتے ہیں۔ ہم اس دنیاوی زندگی کے متلاشی ہیں۔ اور اُس بچے کی طرح، ہم بھی ان محبتوں کے اندھے نشے میں سرشار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب ہمیں یہ چیزیں میسر نہیں آتیں، تو ہماری حالت دکان کے سامنے کھڑے اُس بچے جیسی ہوتی ہے جو کھلونا چرانے سے بچنے کے لیے اپنے اندر جنگ لڑ رہا ہوتا ہے۔ ہم اپنے محبوب کی خاطر حرام کا ارتکاب کرنے سے بچنے کے لیے اندرونی کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہم حرام تعلقات، ناجائز کاروباری لین دین، ممنوعہ افعال اور خلافِ شرع لباس کو چھوڑنے کے لیے تڑپتے ہیں۔ ہم اس فانی دنیا کی محبت سے گلوخلاصی پانے کے لیے دست و گریباں ہیں۔ ہم وہ لڑکھڑاتے ہوئے بندے ہیں جو اس کھلونے کو چھوڑنے کے لیے اس لیے جھنجھلا رہے ہیں... کیونکہ ہماری نگاہوں کے سامنے اس کھلونے کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

یہ ساری دنیاوی زندگی اور جو کچھ بھی اس کے اندر ہے، وہ سب اس کھلونا گاڑی کی مانند ہے۔ ہم اس سے دامن اس لیے نہیں چھڑا پاتے کیونکہ ہمیں ابھی تک اس سے کوئی عظیم تر حقیقت نہیں ملی۔ ہم اصل شے کو دیکھ ہی نہیں پا رہے؛ وہ اصلی حقیقت، وہ ابدی ماڈل!

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اور یہ دنیاوی زندگی تو کھیل کود اور تماشے کے سوا کچھ نہیں، اور حقیقت میں آخرت کا گھر ہی اصل اور سچی زندگی ہے، کاش یہ لوگ جانتے ہوتے!" (القرآن، سورۃ العنکبوت: 64)

اس دنیاوی زندگی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے زندگی کا عام عربی لفظ 'حَیَاۃ' استعمال فرمایا ہے۔ لیکن جب اگلی زندگی کا ذکر فرمایا، تو وہاں زندگی کے لیے نہایت بلیغ، مبالغہ آمیز اور کامل ترین لفظ 'الْحَیَوَان' استعمال کیا۔ اگلی زندگی ہی دراصل 'حقیقی زندگی' ہے۔ وہی اصلِ حیات ہے۔ وہی اصلی نسخہ ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کا اختتام ان الفاظ پر فرمایا: "کاش یہ لوگ جانتے ہوتے!" اگر ہم اس حقیقی زندگی کی جھلک دیکھ پاتے، تو ہم اس ادنیٰ، کھوکھلے اور نقلی ماڈل کے شدید عشق کے سحر سے پل بھر میں آزاد ہو جاتے۔

ایک اور آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "بلکہ تم دنیاوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت کہیں زیادہ بہتر اور زیادہ پائیدار ہے۔" (القرآن، سورۃ الاعلیٰ: 16-17)

وہ حقیقی زندگی کیفیت اور معیار کے اعتبار سے بھی برتر ہے (خَيْرٌ)، اور کمیت، مقدار اور دوام کے اعتبار سے بھی لاانتہا ہے (وَأَبْقَىٰ)۔ اس دنیا میں ہماری محبوب شے چاہے بظاہر کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہو، اس کے اندر نقص لازماً رہے گا؛ معیار کے اعتبار سے بھی (عیب اور کمزوریاں) اور مدت کے اعتبار سے بھی (عارضی اور فانی ہونا)۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم دنیاوی چیزیں رکھ نہیں سکتے یا ان سے محبت نہیں کر سکتے۔ بحیثیتِ مومن، ہمیں سکھایا گیا ہے کہ ہم اس دنیا میں بھی بھلائی مانگیں اور آخرت میں بھی۔ لیکن اس کی مثال کھلونا گاڑی اور اصلی گاڑی جیسی ہے۔ اگرچہ ہم کھلونا گاڑی رکھ بھی سکتے ہیں اور اس سے دل بھی بہلا سکتے ہیں، مگر ہم دونوں کے فرق کو خوب پہچانتے ہیں۔ ہم بخوبی سمجھتے ہیں کہ ایک ادنیٰ اور کمتر ماڈل ہے (لفظ 'دنیا' کا مادہ 'دَنِيَّة' ہے جس کے معنی ہی پست اور کمتر کے ہیں) اور دوسری طرف وہ اصلی، کامل اور حقیقی ماڈل ہے (یعنی آخرت)۔

مگر اس شعور اور ادراک سے ہمیں اس عملی زندگی میں کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ حلال کی پیروی کرنے اور حرام سے باز رہنے کی 'جدوجہد' ہمارے لیے آسان ہو جاتی ہے۔ جتنا زیادہ ہم اصل اور حقیقی شے کو نگاہوں کے سامنے رکھیں گے، بوقتِ ضرورت اس 'نقلی اور فانی' شے کو چھوڑ دینا اتنا ہی سہل ہو جائے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں اس دنیاوی شے کو کلی طور پر یا ہر وقت کے لیے تیاگ دینا ہے۔ بلکہ اس سے کمتر ماڈل (دنیا) کے ساتھ ہمارا تعلق ایسا بن جاتا ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں ہمیں کسی حقیقی شے کی خاطر اس فانی شے کو چھوڑنے کا حکم دیا جائے، تو یہ سودا ہمارے لیے ذرا بھی گراں نہیں گزرتا۔ اگر ہمیں اپنی کسی من پسند ناجائز شے سے رکنے کا حکم ہو، تو رکنا آسان ہو جاتا ہے۔ اگر ہمیں نفس پر گراں گزرنے والے کسی حکم پر جم جانے کو کہا جائے، تو ثابت قدم رہنا آسان ہو جاتا ہے۔ ہم اُس سمجھدار بچے کی مانند بن جاتے ہیں جو کھلونا پاس رکھنا تو پسند کرتا ہے، لیکن اگر کبھی کھلونے اور اصلی گاڑی میں سے کسی ایک کو چننے کا موقع آ جائے، تو وہ بغیر کسی تردد کے اصلی گاڑی کا انتخاب کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، نبی کریم ﷺ کے

متعدد صحابہ کرام کے پاس وافر دولت تھی، لیکن جب گھڑی آئی، تو انہوں نے پلک جھپکائے بغیر اپنا آدھا یا سارا مال اللہ کی راہ میں ہنسی خوشی قربان کر دیا۔

یہ طرزِ فکر اس بات کو بھی یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے کہ ہم مدد یا توثیق کے لیے کس کے آگے دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔ اگر ہمیں کسی شے کی شدید ضرورت ہو، تو ہم غلام کے آگے گڑگڑاتے ہیں—مگر صرف اسی وقت جب ہم بادشاہ کو نہ دیکھتے ہوں یا اُس کی قدرت سے ناواقف ہوں۔ لیکن اگر ہم خود اُس شہنشاہ سے ملنے جا رہے ہوں اور راستے میں اُس کا کوئی غلام مل جائے، تو ہم اُس غلام کو سلام بھی کریں گے، اُس کے ساتھ شفقت و احسان بھی برتیں گے، یہاں تک کہ اُس سے محبت بھی کریں گے۔ لیکن ہم اُس غلام کو متاثر کرنے کی تگ و دو میں اپنا وقت کبھی ضائع نہیں کریں گے، جب کہ ہمارے سامنے وہ بادشاہ موجود ہے جس کی رضا ہمیں درکار ہے! ہم غلام کے آگے اپنی جھولی پھیلانے پر اپنی توانائیاں کبھی ضائع نہیں کریں گے، جب کہ ہم جانتے ہیں کہ اصل مختارِ کل تو وہ بادشاہ ہے۔ چاہے بادشاہ نے اُس غلام کو کوئی اختیارات سونپ بھی رکھے ہوں، تب بھی ہم بخوبی جانتے ہیں کہ بخشنے اور چھین لینے کا حتمی اور مطلق اختیار صرف اور صرف اُس شہنشاہِ کائنات کے پاس ہے—اور صرف اسی کے پاس!

یہ بصیرت صرف اسی وقت نصیب ہوتی ہے جب انسان بادشاہ کی معرفت پا لے اور اُس کے جلال کو دیکھ لے۔ اور یہ بصیرت غلاموں کے ساتھ ہمارے برتاؤ اور تعلق کو یکسر بدل کر رکھ دیتی ہے۔

حقیقت کا مشاہدہ کر لینا ہمارے محبت کرنے کے انداز کو بدل دیتا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس نکتے کو واضح کرتے ہوئے فرمایا تھا: "اگر تمہارا دل کسی ایسے شخص کی محبت کا اسیر ہو جائے جو اُس کے لیے حرام ہے، تو اس دلدوز کیفیت کا ایک بڑا سبب اللہ سے رُوگردانی ہے۔ کیونکہ جب دل ایک بار اللہ کی عبادت اور اُس کے لیے اخلاص کی چاشنی چکھ لیتا ہے، تو پھر اُس کے نزدیک اس سے زیادہ میٹھی، اس سے زیادہ پرلطف اور اس سے زیادہ قیمتی کوئی شے باقی نہیں رہتی۔ کوئی انسان اپنے محبوب کو صرف اسی صورت چھوڑتا ہے جب اُسے کوئی ایسا مل جائے جس سے وہ اس سے بھی زیادہ محبت کرتا ہو، یا پھر وہ کسی بڑی آفت سے ڈر جائے۔ دل کسی فاسد اور ناپاک محبت کو صرف پاکیزہ اور سچی محبت کے پانے پر، یا کسی بڑے نقصان کے خوف ہی سے ترک کرتا ہے۔"

بحیثیتِ امت ہمارا سب سے بڑا المیہ وہی ہے جس کی خبر رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیثِ مبارکہ میں دی تھی: یعنی 'وَہن' (دنیا کی محبت اور موت سے کراہت)۔ ہم اس فانی دنیا کے عشق میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ اور جب بھی آپ کسی کے عشق میں گرفتار ہوتے ہیں، تو اُس محبت سے پیچھا چھڑانا یا اس سے الگ ہونا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔جب تک کہ آپ کو کسی اس سے برتر اور عظیم تر ہستی سے محبت نہ ہو جائے۔ ہمارے دلوں سے دنیا کی اس تباہ کن محبت کو کھرچ کر نکالنا اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک کہ ہم دل کے اس خلا کو بھرنے کے لیے اس سے کوئی عظیم تر محبت نہ پا لیں۔ اور جب انسان کو ایک برتر و اعلیٰ محبت نصیب ہو جائے، تو ادنیٰ محبت کو خیرباد کہنا آسان ہو جاتا ہے۔ جب انسان کے باطن کی آنکھیں اللہ کی محبت، اُس کے رسول ﷺ کی محبت اور اُس کے پاس موجود دائمی گھر کے حسن کا مشاہدہ کر لیتی ہیں، تو یہ محبت دل کے اندر موجود ہر دوسری چاہت پر غالب آ جاتی ہے اور اُسے دبا دیتی ہے۔ اس محبت کی جھلک جتنی زیادہ دکھائی دیتی ہے، وہ دل کے افق پر اتنی ہی حکمران بنتی چلی جاتی ہے۔ اور یوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس اعلان کو اپنے باطن میں سچ کر دکھانا اتنا ہی سہل ہو جاتا ہے: "آپ فرما دیجیے: بے شک میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا، سب اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے!" (القرآن، سورۃ الانعام: 162)

پس دل سے فانی چیزوں کو رخصت کرنے کا راز محبت ہی میں پنہاں ہے۔ دل لگائیے! کسی عظیم تر اور برتر ذات سے دل لگائیے۔ اصل اور ابدی حقیقت سے دل لگائیے! اُس لافانی اور عالیشان محل کو دیکھیے۔

صرف تبھی ہم گڑیوں کے اس کچے گھروندے میں مٹی کے کھلونوں سے کھیلنا بند کریں گے۔

ایک کامیاب ازدواجی رشتہ: گمشدہ کڑی

A Successful Marriage: The Missing Link

"وضاحتی نوٹ: یہ تحریر میاں بیوی کے درمیان باہمی احترام کی کم از کم بنیادی سطح کی موجودگی کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ احترام کے تصور کا ہرگز یہ مطلب نہیں لیا جانا چاہیے کہ کسی بھی قسم کے ظلم، زیادتی یا تشدد (خواہ وہ جسمانی ہو، جذباتی ہو یا نفسیاتی) کو برداشت کیا جائے یا جائز سمجھا جائے۔ اپنے آپ پر یا اپنے اہلِ خانہ پر ظلم و زیادتی کو خاموشی سے سہتے رہنا 'صبر' نہیں کہلاتا۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ وہ ظلم کو پسند نہیں فرماتا؛ اور ہمیں بھی ہرگز ظلم پر راضی نہیں ہونا چاہیے۔"

"اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے بنائے تاکہ تم اُن کے پاس سکون حاصل کرو، اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ بے شک اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔" (القرآن، سورۃ الروم: 21)

ہم سب نے شادی کے ان گنت کارڈز اور دعوت ناموں پر یہ آیت بار بار پڑھی ہے۔ لیکن ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جنہوں نے اس قرآنی سچائی کو اپنی عملی زندگی میں مجسم کیا ہے؟ ہمارے ازدواجی رشتوں میں سے کتنے ایسے ہیں جو واقعی اللہ کی بیان کردہ اس الفت اور رحمت کا عملی نمونہ بنے ہوئے ہیں؟ آخر خرابی کہاں واقع ہو رہی ہے کہ ہمارے معاشرے میں اتنی کثرت سے شادیاں طلاق کے دردناک موڑ پر انجام پذیر ہو رہی ہیں؟

شہرہ آفاق کتاب 'لو اینڈ ریسپیکٹ' (Love & Respect: محبت اور احترام) کے مصنف ڈاکٹر ایمرسن ایگریچس کے نزدیک اس سوال کا جواب نہایت سادہ ہے۔ ایگریچس اپنی کتاب میں بیان کرتے ہیں کہ وسیع سائنسی اور نفسیاتی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ مرد کی سب سے بنیادی اور اولین جذباتی ضرورت 'احترام' ہے، جبکہ عورت کی سب سے بنیادی ضرورت 'محبت' ہے۔ وہ اس تلخ صورتحال کو ایک 'پاگل پن کے چکر' (Crazy Cycle) کا نام دیتے ہیں—یعنی تلخ کلامی اور جھگڑے کا وہ تسلسل جو اس وقت جنم لیتا ہے

جب بیوی احترام کا اظہار نہیں کرتی اور شوہر محبت کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح یہ دونوں رویے ایک دوسرے کو ہوا دیتے ہیں اور ایک دوسرے کا سبب بنتے ہیں۔ باالفاظِ دیگر، جب بیوی یہ محسوس کرتی ہے کہ اُس کے شوہر کا رویہ بے رخی اور بے مروتی پر مبنی ہے، تو وہ عموماً ردعمل کے طور پر بے احترامی کا مظاہرہ کرتی ہے، جس کے نتیجے میں شوہر اور بھی زیادہ سرد مہر اور محبت سے عاری ہو جاتا ہے۔

ایگریچس کا استدلال ہے کہ اس 'پاگل پن کے چکر' کا واحد حل یہ ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے لیے غیر مشروط احترام کا مظاہرہ کرے، اور شوہر اپنی بیوی کے لیے غیر مشروط محبت کا ثبوت پیش کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیوی کو یہ ضد نہیں لگانی چاہیے کہ پہلے شوہر محبت کا اظہار کرے تبھی وہ اُس کی عزت کرے گی؛ کیونکہ ایسا کرنے سے شوہر کے رویے میں مزید بے رخی ہی پیدا ہوگی۔ اور اسی طرح شوہر کو بھی یہ شرط نہیں رکھنی چاہیے کہ پہلے بیوی احترام سے پیش آئے تبھی وہ اُس پر پیار نچھاور کرے گا؛ کیونکہ اس کے نتیجے میں بیوی کی جانب سے مزید بے احترامی ہی سامنے آئے گی۔ ان دونوں جذبوں کا غیر مشروط ہونا ناگزیر ہے۔

جب میں نے اس نظریے پر گہرائی سے غور کیا، تو مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اگر ہم قرآنِ حکیم اور حکمتِ نبوی ﷺ کے سرچشموں کا مطالعہ کریں، تو ازدواجی رشتے کے حوالے سے ان دو تصورات (محبت اور احترام) سے زیادہ کسی اور چیز پر زور دیا ہی نہیں گیا۔

مردوں کو مخاطب کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے وصیت فرمائی: "عورتوں کے ساتھ بھلائی اور خیر خواہی کا برتاؤ کرو، کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں، اور پسلی کا سب سے ٹیڑھا حصہ اُس کا بالائی سرا ہوتا ہے؛ اگر تم اُسے بالکل سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو اُسے توڑ ڈالو گے، اور اگر اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دو گے تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی، لہٰذا عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور خیر خواہی کی وصیت قبول کرو۔" (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

آپ ﷺ نے مزید تاکید فرمائی: "ایمان کے اعتبار سے مومنوں میں سب سے کامل ترین وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں؛ اور تم میں سب سے بہترین انسان وہ ہے جو اپنی بیوی کے حق میں سب سے بہتر ہو۔" (جامع ترمذی)

اور رسول اللہ ﷺ کا یہ بھی ارشادِ گرامی ہے: "کوئی صاحبِ ایمان مرد کسی باایمان عورت (اپنی بیوی) سے بغض اور نفرت نہ رکھے؛ اگر اُسے اُس کی کوئی ایک عادت ناپسند ہوگی، تو دوسری عادت ضرور پسند آجائے گی۔" (صحیح مسلم)

اور باری تعالیٰ کا فرمانِ عالیشان ہے: "...اور اُن (بیویوں) کے ساتھ اچھے اور شائستہ طریقے سے زندگی بسر کرو۔ پھر اگر وہ تمہیں ناپسند بھی ہوں تو عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اُس کے اندر تمہارے لیے بہت سی بھلائی رکھ دے۔" (القرآن، سورۃ النساء: 19)

حکمت کے ان درخشندہ موتیوں میں مردوں کو سختی کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنی ازواج کے ساتھ سراپا شفقت، محبت اور حسنِ سلوک کا پیکر بنیں۔ مزید برآں، اُن پر زور دیا گیا ہے کہ وہ اس مہر و محبت کے اظہار میں اپنی بیویوں کی لغزشوں اور خامیوں سے چشم پوشی اور درگزر سے کام لیں۔

دوسری جانب، جب بیوی کو مخاطب کیا جاتا ہے تو رُخ بدل جاتا ہے۔ آخر عورتوں کو بار بار یہ کیوں نہیں کہا گیا کہ وہ اپنے شوہروں پر محبت نچھاور کریں اور مہربان رہیں؟ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر مشروط محبت کا جذبہ تو عورت کی فطرت میں پہلے ہی سے ودیعت کر دیا گیا ہے۔ بہت کم مرد یہ شکوہ کرتے ہیں کہ اُن کی بیویاں اُن سے پیار نہیں کرتیں۔ لیکن بے شمار مرد اس بات کا رونا روتے ہیں کہ اُن کی بیویاں اُن کا احترام نہیں کرتیں، اُن کی قدر نہیں کرتیں۔ اور یہی وہ جذبہ ہے جس پر قرآن و سنت میں بیویوں کے حوالے سے سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔

احترام کا اظہار کئی طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ احترام کے اظہار کی اہم ترین صورتوں میں سے ایک کسی کی خواہشات اور فیصلوں کی قدر کرنا ہے۔ جب کوئی کہتا ہے کہ "میں آپ کے مشورے کا احترام کرتا ہوں"، تو اس کا اصل مفہوم یہ ہوتا ہے کہ "میں آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا۔" کسی قائد اور رہنما کا احترام کرنے کا مطلب اُس کے حکم کی اطاعت کرنا ہے۔ والدین کا احترام کرنے کا مطلب اُن کی مرضی اور خواہشات کے خلاف نہ چلنا ہے۔ اور شوہر کا احترام کرنے کا مطلب اُس کی خواہشات اور فیصلوں کو عزت دینا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جب کوئی عورت اپنی پانچوں نمازیں وقت پر ادا کرے، اپنے (رمضان

کے) مہینے کے روزے رکھے، اپنی عفت و عصمت کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی اطاعت کرے، تو اُس سے کہا جائے گا: 'جنت کے جس دروازے سے تمہارا جی چاہے داخل ہو جاؤ!'" (جامع ترمذی)

بحیثیتِ خواتین، آخر ہمیں اپنے شوہروں کے احترام اور اُن کی بات ماننے کی تلقین کیوں کی گئی ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مردوں کو ذمہ داری کا ایک اضافی اور بھاری بوجھ سونپا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "مرد عورتوں پر نگہبان اور محافظ (قوّام) ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے اُن میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال میں سے خرچ کرتے ہیں..." (القرآن، سورۃ النساء: 34)

لیکن کیا شوہر کے لیے یہ غیر مشروط احترام ہمیں، بحیثیتِ خواتین، ایک کمزور اور بے بس پوزیشن میں لا کھڑا نہیں کر دے گا؟ کیا ہم خود کو اس خطرے میں نہیں ڈال دیں گی کہ ہمارا استحصال کیا جائے اور ہم پر ظلم ڈھایا جائے؟ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ قرآنِ مجید، اسوۂ نبوی ﷺ اور دورِ حاضر کی جدید ترین تحقیقات نے بھی اس کے بالکل الٹ ثابت کیا ہے۔ ایک عورت اپنے شوہر کا جتنا زیادہ احترام کرتی ہے، شوہر اُس کے لیے اتنا ہی زیادہ سراپا محبت، فداکاری اور مروت بن جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بیوی جتنا زیادہ بے احترامی کا مظاہرہ کرتی ہے، شوہر اتنا ہی زیادہ سخت گیر، تلخ اور محبت سے تہی دامن ہوتا چلا جاتا ہے۔

اسی طرح کوئی مرد یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ وہ ایک بدتمیز یا بے مروت بیوی کے ساتھ کیوں محبت اور نرمی کا برتاؤ کرے؟ اس سوال کا جواب پانے کے لیے انسان کو سیدنا فاروقِ اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے اسوۂ مبارکہ کو دیکھنا ہی کافی ہے۔ ایک مرتبہ ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ (جو اُس وقت تمام عالمِ اسلام کے خلیفہ اور امیر المومنین تھے) کے پاس اپنی بیوی کی تند خوئی کی شکایت لے کر حاضر ہوا۔ جب وہ دروازے پر پہنچا تو اُس نے سنا کہ خود امیر المومنین کی اہلیہ محترمہ اُن پر اونچی آواز میں بول رہی ہیں اور غصہ کر رہی ہیں۔ وہ شخص یہ دیکھ کر الٹے پاؤں لوٹنے لگا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُسے دیکھ کر آواز دی اور واپس بلایا۔ اُس شخص نے عرض کیا کہ امیر المومنین! میں تو آپ کے پاس اپنے گھر کے اسی جھگڑے کا رونا رونے آیا تھا جو آپ کے اپنے گھر میں درپیش ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "میری بیوی میرے مزاج کو برداشت کرتی ہے، میرے کپڑے دھوتی ہے، میرا گھر صاف رکھتی ہے، مجھے

آرام و سکون فراہم کرتی ہے، اور میرے بچوں کی پرورش کرتی ہے۔ جب وہ میرے لیے یہ سب کچھ کرتی ہے، تو اگر کبھی وہ غصے میں مجھ پر آواز بلند کر لے تو کیا میں اتنی سی بات پر بھی اُس کا لحاظ اور صبر نہ کروں؟"

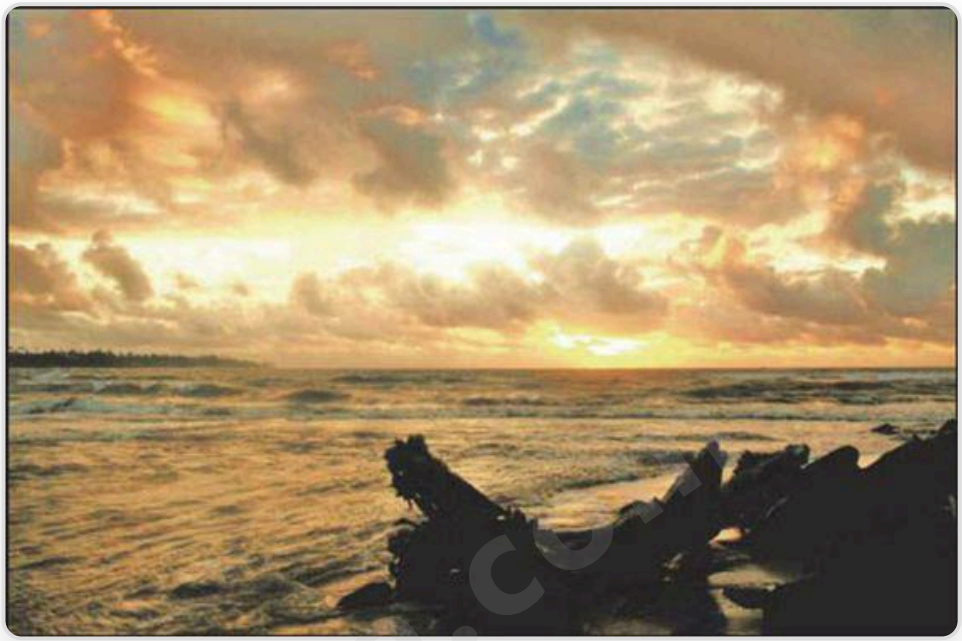
یہ ایمان افروز واقعہ ہم سب کے لیے—نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں کے لیے بھی—ایک نہایت خوبصورت مشعلِ راہ ہے۔ یہ واقعہ صبر، درگزر اور چشم پوشی کا ایک بے مثال اور انمول سبق ہے، جو کسی بھی ازدواجی رشتے کو کامیاب بنانے کے لیے روح کی مانند لازم ہے۔ مزید برآں، ذرا صبر کا دامن تھامے رکھنے والوں کے لیے آخرت میں ملنے والے اجرِ عظیم پر بھی غور فرمائیے؛ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "بے شک صبر کرنے والوں ہی کو اُن کا اجر بغیر کسی حساب کے پورا پورا دیا جائے گا۔" (القرآن، سورۃ الزمر: 10)

topqna.com

SECTION 3 • حصہ سوم

آزمائشیں اور مشکلات

HARDSHIPS



topqna.com

طوفان میں واحد پناہ گاہ

The Only Shelter in the Storm

طوفان جب دستک دیتا ہے تو اپنے قدموں پر جمے رہنا کبھی آسان نہیں ہوتا۔ بارش کی پہلی بوند کے ساتھ ہی بجلی چمکنے لگتی ہے۔ سیاہ بادل سورج کو نگل لیتے ہیں اور نگاہ جہاں تک جاتی ہے، وہی سمندر جو کبھی پُرسکون تھا، اب طوفانی موجوں کا روپ دھار کر آپ کا محاصرہ کر چکا ہوتا ہے۔ جب راستہ سجھائی نہیں دیتا، تو آپ مدد کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگتے ہیں۔

آپ ساحلی محافظوں (کوسٹ گارڈ) کو پکارنے سے شروعات کرتے ہیں۔ کوئی جواب نہیں ملتا۔ آپ کشتی کا رخ موڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب بے سود! آپ کی نگاہیں لائف بوٹ (بچاؤ کی کشتی) کو تلاش کرتی ہیں، مگر وہ غائب ہے۔ آپ لائف جیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی پھٹی ہوئی ہے۔ بالآخر، جب آپ تمام مادی وسائل آزما کر تھک ہار جاتے ہیں، تو اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں۔

اور خدا سے التجا کرتے ہیں۔

مگر اس لمحے میں ایک بالکل منفرد اور بے نظیر کیفیت پنہاں ہوتی ہے۔ اس خاص آن، آپ اس حقیقت کا عملی مشاہدہ اور تجربہ کرتے ہیں جسے عام حالات میں صرف نظریاتی طور پر ہی جانا جا سکتا ہے: یعنی حقیقی توحید۔ وحدانیت۔ دیکھیے، ساحل پر رہتے ہوئے بھی شاید آپ نے خدا کو پکارا ہوگا، مگر تب آپ نے اُسے پکارنے کے ساتھ ساتھ نجانے کتنے دیگر سہاروں کو بھی آواز دی تھی۔ شاید آپ نے خدا پر بھی بھروسا کیا تھا، لیکن اس بھروسے میں درجنوں دیگر آسکرے اور سہارے بھی شریک تھے۔ لیکن اس ایک یگانہ لمحے میں، باقی ہر راستہ مسدود ہو چکا ہے۔ ہر چیز ختم ہو چکی ہے۔ اب پکارنے کے لیے کوئی باقی نہیں رہا، تکیہ کرنے کے لیے کوئی سہارا نہیں بچا۔ سوائے اُس کی ذات کے۔ اور اصل نکتہ بھی یہی ہے!

کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ جب آپ کو شدید ترین ضرورت ہوتی ہے، تو مخلوق کا ہر وہ دروازہ جس پر آپ دستک دیتے ہیں، بند ہی کیوں ملتا ہے؟ آپ ایک دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں تو وہ زور سے بند کر دیا جاتا ہے۔ آپ دوسرے کا رخ کرتے ہیں، وہ بھی مقفل ملتا ہے۔ آپ ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک بھاگتے ہیں، ہر در پر دستک دیتے ہیں، سر پٹختے ہیں، مگر کوئی چوکھٹ وا نہیں ہوتی۔ اور تو اور، وہ دروازے بھی جن پر کبھی آپ کو مکمل تکیہ تھا، اچانک بند ہو جاتے ہیں۔ آخر کیوں؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

دراصل، ہم انسانوں میں چند ایسی فطری خصلتیں ہیں جن سے ہمارا پروردگار خوب واقف ہے۔ ہم ہر لمحہ محتاجی اور احتیاج کی حالت میں رہتے ہیں۔ ہم کمزور اور ناتواں ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ، ہم جلد باز اور بے صبرے بھی ہیں۔ جب ہم کسی مصیبت میں گھرتے ہیں، تو ہمیں مدد کی تلاش پر مجبور کر دیا جاتا ہے، اور کائنات کا یہی تکوینی نظام ہے۔ اگر ہر طرف دھوپ کھلی ہو اور موسم خوشگوار ہو تو بھلا ہم پناہ کی تلاش میں کیوں نکلیں گے؟ انسان پناہ گاہ کا رخ کب کرتا ہے؟ صرف تب جب طوفان سر پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ پس اللہ سبحانہ و تعالیٰ طوفان بھیجتا ہے؛ وہ حالات کے ردوبدل کے ذریعے احتیاج پیدا کرتا ہے، تاکہ ہم بے چین ہو کر پناہ گاہ ڈھونڈنے پر مجبور ہو جائیں۔

لیکن جب ہم مدد کی تلاش میں نکلتے ہیں، تو اپنی بے صبری کی بنا پر، ہم ان چیزوں کا رخ کرتے ہیں جو قریب تر اور بظاہر آسان دکھائی دیتی ہیں۔ ہم اس میں پناہ ڈھونڈتے ہیں جسے ہم دیکھ سکتے ہیں، سن سکتے ہیں، اور چھو سکتے ہیں۔ ہم مختصر راستوں (شارٹ کٹس) کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ہم مخلوق سے مدد مانگتے ہیں، حتیٰ کہ اپنے نفس کے بل بوتے پر بھروسا کرنے لگتے ہیں۔ ہم اس کی طرف لپکتے ہیں جو سب سے زیادہ نزدیک معلوم ہوتا ہے۔ اور کیا دنیا (مادی زندگی) درحقیقت یہی نہیں ہے؟ یعنی وہ جو بظاہر قریب ترین معلوم ہو۔ خود لفظ 'دنیا' کے لغوی معنی ہی 'ادنیٰ' اور 'قریب تر' کے ہیں۔ دنیا وہ ہے جو ظاہری نگاہ میں قریب ترین نظر آتی ہے، مگر حقیقت میں یہ محض ایک فریبِ نظر ہے۔

کیونکہ ایک ہستی ایسی ہے جو اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔

ایک لمحے کے لیے سوچیے کہ آپ کے سب سے زیادہ قریب کیا ہے؟ اگر یہ سوال پوچھا جائے تو اکثر لوگ کہیں گے کہ انسان کے سب سے قریب اس کا دل اور اس کا نفس ہے۔ لیکن، اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ "اور بلاشبہ ہم ہی نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم جانتے ہیں جو وسوسے اس کا نفس اس کے دل میں ڈالتا ہے، اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔" [سورۃ ق: 16]

اس آیتِ مبارکہ میں، اللہ سبحانہ و تعالیٰ پہلے یہ واضح فرماتا ہے کہ وہ ہماری کشمکش اور باطنی جنگ سے باخبر ہے۔ یہ جان کر ہی دل کو کتنی تسلی ملتی ہے کہ کوئی ہے جو ہماری جدوجہد اور کرب کو دیکھ رہا ہے! وہ خوب جانتا ہے کہ ہمارا نفس ہمیں کس چیز کی طرف مائل کرتا ہے۔ لیکن وہ اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔ وہ ہمارے اپنے نفس اور اس کے تمام تقاضوں سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ آخر شہ رگ ہی کی مثال کیوں دی گئی؟ ہمارے وجود کے اس حصے میں ایسی کیا خاص بات ہے؟ شہ رگ وہ بنیادی اور اہم ترین رگ ہے جو دل تک خون پہنچاتی ہے۔ اگر یہ کٹ جائے تو انسان فوری طور پر دم توڑ دیتا ہے۔ یہ لفظی معنوں میں ہماری رگِ جاں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہماری اپنی زندگی سے، ہماری اپنی انا سے، اور ہمارے اپنے نفس سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔ اور وہ ہمارے دل تک پہنچنے والے اس اہم ترین راستے سے بھی زیادہ قریب تر ہے۔

ایک اور آیت میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ "اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہو جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائیں جو تمہیں زندگی بخشتی ہے، اور جان لو کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ کہ اسی کے حضور تم سب اکٹھے کیے جاؤ گے۔" [سورۃ الأنفال: 24]

اللہ سبحانہ و تعالیٰ جانتا ہے کہ ہمارے اندر ایک نفس ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ ہمارے پاس ایک دل ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ یہی چیزیں ہماری رہنمائی کرتی ہیں اور ہمیں متحرک رکھتی ہیں۔ اس سب کے باوجود، اللہ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ ان تمام چیزوں سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہے۔ لہٰذا، جب ہم اُس کے سوا کسی اور کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں، تو ہم نہ صرف کسی کمزور اور بے بس چیز کا سہارا ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں، بلکہ ہم اس

ہستی کو نظر انداز کر کے جو سب سے زیادہ قریب ہے، دور افتادہ اور فاصلوں پر موجود چیزوں کی طرف لپک رہے ہوتے ہیں۔ سبحان اللہ !

پس چونکہ یہ ہماری کمزور فطرت ہے، جس سے اللہ تبارک و تعالیٰ بخوبی واقف ہے، اس لیے وہ طوفان کی حالت میں پناہ کے تمام دیگر باطل دروازوں کو بند رکھ کر ہماری حفاظت فرماتا ہے اور ہمارا رخ اپنی طرف موڑ دیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر جھوٹے اور فریب دہ دروازے کے پیچھے ایک گہری کھائی ہے، اور اگر ہم اس میں داخل ہو گئے تو منہ کے بل گر پڑیں گے۔ لہٰذا یہ اُس کی رحمتِ خاص ہے کہ وہ ان باطل دروازوں کو مقفل ہی رکھتا ہے۔

یہ اُس کی بے پایاں رحمت ہی تھی کہ اُس نے طوفان بھیجا تاکہ ہم التجا کریں اور مدد طلب کریں۔ اور پھر یہ جانتے ہوئے کہ ہم غلط جواب منتخب کرنے کی شدید خامی رکھتے ہیں، اُس نے ہمارے سامنے ایک ایسا کثیر الانتخابی امتحان (معروضی پرچہ) رکھ دیا جس میں منتخب کرنے کے لیے صرف ایک ہی آپشن موجود تھا: اور وہ تھا درست ترین جواب ! پس وہ تنگیِ بذاتِ خود ایک آسانی بن گئی۔ تمام دیگر جھوٹے سہاروں اور کثیر الانتخابی غلط راستوں کو مٹا کر، اُس نے اس کٹھن امتحان کو کتنا آسان بنا دیا !

طوفان جب ٹکراتا ہے تو اپنے بل بوتے پر کھڑے رہنا کبھی آسان نہیں ہوتا۔ اور اصل حقیقت بھی بالکل یہی ہے۔ تند و تیز آندھی بھیج کر وہ ہمارے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتا ہے: اور یہی وہ کامل ترین حالت ہے جس میں سجدہ ریز ہو کر دعا مانگی جاتی ہے !

جنت میں اپنا گھر دیکھنا: الٰہی مدد کی طلب

Seeing Your Home in Jennah: On Seeking Divine Help

میں ایک ایسی کہانی سے واقف ہوں جو محض کوئی قصہ یا کہانی نہیں ہے۔ اس کا آغاز ایک ایسی خاتون سے ہوتا ہے جسے اس فانی زندگی کی تمام تر چمک دمک سے بڑھ کر کسی اور شے سے محبت تھی۔ وہ ایک ایسی عظیم عورت تھیں جنہوں نے اپنے دردناک اور کٹھن حالات کو کبھی اپنی پہچان نہیں بننے دیا اور نہ ہی ان حالات کے سامنے اپنے حوصلے کو محدود ہونے دیا؛ ان کے سینے میں ایسا پختہ اور عمیق ایمان موجزن تھا کہ وہ اس پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے بھی بخوشی تیار تھیں۔ وہ ایک ملکہ تھیں، مگر انہوں نے اس دنیا کے تمام محلات اور تخت و تاج کی بے ثباتی کو دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے اس دنیا میں اپنے عالیشان محل سے نظریں چرا لیں اور اس کے بدلے اگلی زندگی میں اپنے ابدی محل پر نگاہیں جما دیں۔ لیکن آسیہؑ، فرعون کی زوجہ، کے لیے یہ محض دل کی کوئی تمثیلی جھلک یا تخیلاتی بصیرت نہ تھی؛ بلکہ آسیہؑ نے اس کا مشاہدہ اپنی ظاہری آنکھوں سے کیا تھا۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے: وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتَ فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِندَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِن فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ "اور اللہ نے ایمان والوں کے لیے فرعون کی بیوی کی مثال بیان فرمائی، جب اس نے التجا کی: اے میرے پروردگار! میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا دے، اور مجھے فرعون اور اس کے (برے) عمل سے نجات عطا فرما، اور مجھے ظالم قوم سے چھٹکارا بخش دے۔" [سورۃ التحریم: 11]

میں نے حضرت آسیہؑ کا یہ ایمان افروز واقعہ ان گنت بار سن رکھا تھا، اور ہر بار یہ میرے دل کو جھنجھوڑ دیتا تھا۔ لیکن ابھی کچھ عرصہ قبل ہی ان کی یہ داستان ایک بالکل ہی انوکھے زاویے سے میرے دل پر اثر انداز ہوئی۔ چند ماہ پہلے مجھے ایک کڑی آزمائش اور کٹھن امتحان کا سامنا تھا۔ اور نیک، فرشتہ صفت نفوس کی صحبت اور رفاقت کا میسر ہونا واقعی ایک انمول ترین نعمت ہے۔ جب آپ کسی مشکل میں گھرے ہوں، تو

صرف ایک ٹیکسٹ میسج، فیس بک کا ایک اسٹیٹس اپ ڈیٹ، یا صُہیب ویب کی لسٹ سرو پر محض ایک ای میل درکار ہوتی ہے، اور آپ کے سامنے خوبصورت، پاکیزہ روحوں کی ایک پوری فوج دعاؤں کے لیے صف آرا ہو جاتی ہے۔ سبحان اللہ!

چنانچہ میں نے بھی یہی درخواست کی۔ میں نے اس عظیم ترین تحفے کی التجا کی جو ایک انسان دوسرے کو دے سکتا ہے؛ یعنی خلوصِ دل سے مانگی گئی دعا۔ اس کے جواب میں جو محبت اور دعائیں مجھے ملیں اس نے مجھے مسحور اور آبدیدہ کر دیا۔ اللہ کا یہ احسان میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ لوگ رات کے قیام (تہجد) میں میرے لیے دعائیں مانگ رہے تھے، کچھ کعبۃ اللہ کے سامنے دست بدعا تھے، کچھ سفر کی حالت میں اور کچھ تو زچگی کے کٹھن ترین لمحوں میں بھی میرے لیے التجا کر رہے تھے۔ مجھے بے شمار دعائیں موصول ہوئیں، مگر ان میں ایک ایسی دعا تھی جس نے میرے دل کی گہرائیوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ ایک مختصر سا میسج تھا، جس میں لکھا تھا: "اللہ کرے کہ آپ کو جنت میں آپ کا گھر دکھا دیا جائے، تاکہ ہر مصیبت آپ کے لیے آسان ہو جائے۔" میں نے یہ پڑھا اور یہ بات سیدھی میرے دل میں اتر گئی۔ واقعی اس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

اور پھر مجھے حضرت آسیہؑ کا واقعہ یاد آیا، اور دفعتاً مجھ پر ایک حیرت انگیز حقیقت منکشف ہوئی۔ حضرت آسیہؑ اس وقت ایسی ہولناک اور شدید ترین اذیتوں کا سامنا کر رہی تھیں جس کا کوئی انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ فرعون اس روئے زمین پر چلنے والا تاریخ کا بدترین اور ظالم ترین سرکش تھا۔ وہ صرف ان کا حاکم ہی نہیں تھا، بلکہ ان کا شوہر بھی تھا۔ اور ان کے آخری لمحات میں فرعون نے ان پر سفاکانہ ظلم و تشدد کی انتہا کر دی۔ لیکن تب ایک نہایت عجیب اور محیر العقول واقعہ پیش آیا: حضرت آسیہؑ مسکرا دیں! وہ ایک ایسے دردناک عذاب اور مصیبت سے گزر رہی تھیں جو کوئی انسان جھیل سکتا ہے، مگر اس عالم میں بھی ان کے لبوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی۔

آخر یہ کیسے ممکن ہوا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی کو بدترین اذیتیں دی جا رہی ہوں اور وہ مسکرا رہا ہو، جبکہ ہمارا یہ حال ہے کہ ٹریفک میں ذرا سی تاخیر ہو جائے یا کوئی ہمیں ترچھی نگاہ سے دیکھ لے، تو ہم آپے سے باہر ہو جاتے ہیں؟ یہ کیسے ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تاریخ کی سب سے ہولناک مصیبت کا سامنا تھا، پھر بھی دہکتی ہوئی آگ ان کے لیے ٹھنڈی اور سلامتی والی بن گئی؟ ایسا کیوں ہے کہ جن کے پاس دنیا کی کوئی

آسائش نہیں، وہ شکوے کا کوئی جواز نہیں ڈھونڈتے، جبکہ جن کے پاس 'سب کچھ' موجود ہے، انہیں شکوے شکایات کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیتا؟ اور ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کبھی کبھار ہم زندگی کے بڑے بڑے صدمات پر تو غیر معمولی صبر کا مظاہرہ کر جاتے ہیں، لیکن روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی الجھنوں پر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے ہیں؟

میرا گمان تھا کہ مصائب اس لیے ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں کیونکہ بعض چیزیں بذاتِ خود فطری طور پر جھیلنا مشکل ہوتی ہیں۔ میں سوچتی تھی کہ تکالیف کی ایک معیاری فہرست اور پیمانہ مقرر ہے؛ مثلاً کسی پیارے کی موت کو برداشت کرنا ٹریفک کے چالان کے مقابلے میں ہمیشہ کہیں زیادہ کٹھن ہوتا ہے۔ یہ بات بظاہر نہایت واضح اور کھلی معلوم ہوتی ہے۔ بالکل بدیہی لگتی ہے۔ لیکن، درحقیقت یہ سوچ سراسر غلط ہے۔

کسی بھی مصیبت کو برداشت کرنا اس لیے مشکل نہیں ہوتا کہ وہ مصیبت بذاتِ خود کٹھن ہے۔ کسی آزمائش میں آسانی یا تنگی کا پیمانہ کسی دوسرے ہی ترازو پر تولا جاتا ہے—ایک ایسا ترازو جو غیب کا پیمانہ ہے۔ زندگی میں مجھے جس بھی صورتحال کا سامنا کرنا پڑے، وہ اس لیے آسان یا مشکل نہیں ہوگی کہ وہ اپنی فطرت میں آسان یا مشکل ہے۔ بلکہ آسانی اور مشکل کا دارومدار صرف اور صرف "الٰہی مدد اور توفیق" کی سطح پر ہوتا ہے۔ کوئی بھی چیز، جی ہاں مطلقاً کوئی چیز آسان نہیں ہوتی، الا یہ کہ میرا رب اسے میرے لیے آسان بنا دے۔ نہ ٹریفک کا جام ہونا، نہ کاغذ سے انگلی پر لگنے والا ایک معمولی سا کٹ۔ اور کوئی بھی شے مشکل نہیں رہتی اگر اللہ تعالیٰ اسے میرے لیے آسان فرما دے؛ نہ کوئی مہلک بیماری، نہ موت کی سختی، نہ آگ کے دہکتے الاؤ میں جھونکا جانا، اور نہ ہی کسی جابر و ظالم کے ہاتھوں دی جانے والی اذیتیں!

حضرت ابنِ عطاء اللہ السکندریؒ نے کیا ہی خوبصورت بات کہی ہے: مَا عَسُرَ مَطْلَبٌ أَنْتَ طَالِبُهُ بِرَبِّكَ، وَلَا تَيَسَّرَ مَطْلَبٌ أَنْتَ طَالِبُهُ بِنَفْسِكَ "کوئی مقصد مشکل نہیں رہتا اگر تم اسے اپنے رب کے سہارے طلب کرو، اور کوئی کام آسان نہیں رہتا اگر تم اسے اپنے نفس کے بل بوتے پر حاصل کرنا چاہو۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دہکتی ہوئی آگ میں پھینکا گیا۔ ان شاء اللہ ہم میں سے کسی کو اس دنیا میں ایسی آزمائش کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جسے اپنی زندگی میں کسی نہ کسی قسم کی جذباتی، نفسیاتی، یا سماجی آگ کے الاؤ میں نہ جھونکا جاتا ہو۔ اور ایک پل کے لیے بھی یہ مت سوچیے

کہ خدا ان آگ کے شعلوں کو ہمارے لیے ٹھنڈا اور گلزار نہیں بنا سکتا ! حضرت آسیہؑ کو بدترین جسمانی اذیتیں دی جا رہی تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی نگاہوں کے سامنے جنت میں ان کا محل آشکار کر دیا۔ چنانچہ وہ مسکرا پڑیں۔ ہماری یہ ظاہری آنکھیں اس دنیا میں شاید جنت کا دیدار نہ کر سکیں، لیکن اگر اللہ چاہے تو ہمارے دل کی بصیرت کو اپنے پاس موجود وہ ابدی گھر دکھایا جا سکتا ہے، جس کے بعد ہر مصیبت آسان ہو جاتی ہے۔ اور شاید ہم بھی، ایسے کٹھن لمحات میں مسکرانے کے قابل ہو جائیں۔

پس اصل مسئلہ آزمائش بذاتِ خود نہیں ہے۔ اصل مسئلہ بھوک یا خون جما دینے والی سردی کا آنا نہیں ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ جب وہ بھوک اور سردی آئے گی تو کیا ہمارے پاس درکار زادِ راہ اور سامانِ زیست موجود ہے یا نہیں؟ اگر ہمارے پاس وہ توشہ موجود ہو، تو نہ بھوک ہمیں ستا سکتی ہے اور نہ سردی ہمیں گزند پہنچا سکتی ہے؛ وہ تکلیف دہ نہیں رہتی۔ مصیبت تو صرف تب جنم لیتی ہے جب بھوک دستک دے اور ہمارے پاس اناج نہ ہو۔ آفت تو تب ٹوٹتی ہے جب برفانی طوفان امڈ آئے اور ہمارے سر پر کوئی پناہ گاہ نہ ہو۔

بے شک اللہ ہی آزمائشیں بھیجتا ہے، تاکہ ہمارا تزکیہ ہو سکے، ہم مضبوط اور کندن بن سکیں، اور لوٹ کر اُسی کی بارگاہ میں آ جائیں۔ لیکن یہ بات پورے یقین سے جان لیجیے کہ اس بھوک، پیاس، اور کڑاکے کی سردی کے ساتھ، اللہ ہی کھانا، پانی اور پناہ گاہ بھی عطا فرماتا ہے۔ اللہ امتحان بھیجتا ہے، تو اس کے ساتھ ہی وہ جھیلنے کے لیے صبر، اور یہاں تک کہ رضا بالقضاء کی دولت بھی نازل فرماتا ہے۔ ہاں، اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اس دار الامتحان میں اتارا جہاں انہیں مشقت اٹھانا تھی اور آزمائشوں کا سامنا کرنا تھا، لیکن ساتھ ہی اُس نے اپنی الٰہی نصرت اور رہنمائی کا وعدہ بھی فرمایا۔ قرآنِ حکیم ہمیں بتاتا ہے: قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ "فرمایا: تم دونوں یہاں سے اکٹھے اتر جاؤ، تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہوں گے۔ پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے، تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ (دنیا میں) گمراہ ہوگا اور نہ (آخرت میں) بدبخت و تکلیف زدہ ہوگا۔" [سورۃ طہ: 123]

شاید میری پسندیدہ ترین دعاؤں میں سے ایک وہ دعا ہے جو حضور نبی اکرم ﷺ نے طائف کے میدان میں مانگی تھی۔ جب آپ لہولہان تھے اور جسمِ اطہر زخموں سے چور تھا، اس وقت آپ ﷺ نے اپنے

رب کے حضور پکارا تھا: «أَعُوذُ بِنُورِ وَجْهِكَ الَّذِي أَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ، وَصَلُحَ عَلَيْهِ أَمْرُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ» "میں تیری ذات کے اس نور کی پناہ مانگتا ہوں جس سے تمام اندھیرے چھٹ جاتے ہیں اور جس کی بدولت دنیا اور آخرت کے تمام معاملات سنور جاتے ہیں۔"

یقیناً اللہ ان ہی کو آزماتا ہے جن سے وہ محبت فرماتا ہے، اور آزمائش بھی انسان کے ایمان کے درجے کے مطابق ہی آتی ہے۔ لیکن اسی طرح اللہ اپنی ایسی غیبی اور الٰہی مدد بھی نازل فرماتا ہے جس سے ہر امتحان آسان اور ہر آگ گلزار بن سکتی ہے۔ اسی طرح اللہ اپنی ایسی تائید و نصرت بھیج سکتا ہے جس میں اُس کے نور کی ایک جھلک اور اُس کی بارگاہ میں تیار ابدی گھر کا ایک نظارہ ہمیں مسکرانے پر آمادہ کر دے—خواہ ہم آزمائش کے دہکتے ہوئے شعلوں ہی کے درمیان کیوں نہ کھڑے ہوں!

topqna.com

لوگوں سے ملنے والے زخم: سامنا کیسے کریں اور شفا کیسے پائیں

Hurt by Others: How to Cope and Heal

جب میں ہوش سنبھال رہی تھی تو میرے نزدیک یہ دنیا ایک بے عیب اور پرفیکٹ جگہ تھی۔ بس ایک ہی خرابی تھی اور وہ یہ کہ حقیقت میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ میرا پختہ یقین تھا کہ سب کچھ ہمیشہ 'انصاف اور برابری' پر مبنی ہونا چاہیے۔ میری نظر میں اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی کے ساتھ کبھی کوئی زیادتی نہ ہو، اور اگر کسی کے ساتھ ناانصافی ہو تو فوراً انصاف کا بول بالا ہونا چاہیے۔ میں نے زندگی کو اپنے تصورات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے سخت جدوجہد کی۔ لیکن اس کشمکش کے دوران، مجھ سے اس مادی زندگی کی ایک بنیادی ترین حقیقت اوجھل رہی۔ اپنی طفلانہ مثالیت پسندی (چائلڈش آئیڈیلزم) میں میں یہ سمجھنے سے قاصر رہی کہ یہ دنیا اپنی سرشت اور فطرت میں ہی ناقص اور نامکمل ہے۔ ہم انسان اپنی ساخت میں ہی خطا کے پتلے اور نامکمل ہیں۔ چنانچہ ہم سے ہمیشہ غلطیاں سرزد ہوتی رہیں گی۔ اور ان لغزشوں کے نتیجے میں ہم ناگزیر طور پر دوسروں کو دکھ پہنچائیں گے۔ کبھی جان بوجھ کر اور کبھی انجانے میں، کبھی دانستہ اور کبھی غیر ارادی طور پر۔ یہ دنیا ہمیشہ منصفانہ نہیں ہو سکتی۔

کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم ناانصافی اور ظلم کے خلاف جدوجہد کرنا چھوڑ دیں، یا حق کی تلاش اور پاسداری سے دستبردار ہو جائیں؟ ہرگز نہیں! بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہمیں اس فانی دنیا اور انسانوں کو کسی غیر حقیقی اور ناپید معیار پر نہیں پرکھنا چاہیے۔ لیکن ایسا کرنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا۔ ہم ایک ایسی عیب دار اور شکستہ دنیا میں کیسے جیئں جہاں اپنے بھروسا توڑ دیتے ہیں، اور جہاں ہمارے اپنے اہل خانہ اور قریبی ترین لوگ ہمارا دل پاش پاش کر دیتے ہیں؟ اور شاید سب سے کٹھن سوال یہ ہے کہ جب ہمارے ساتھ ناانصافی اور زیادتی کی گئی ہو، تو ہم معاف کرنا کیسے سیکھیں؟ ہم دل کو سخت کیے بغیر مضبوط کیسے بنیں، اور کمزور پڑے بغیر دل کی نرمی اور لطافت کو کیسے برقرار رکھیں؟ ہم کب تک کسی چیز کو تھامے رکھیں اور کس موڑ پر اسے

رخصت کر دیں؟ کسی کا حد سے زیادہ خیال رکھنا کب جان لیوا بوجھ بن جاتا ہے؟ اور کیا ضرورت سے زیادہ محبت کرنا بھی کوئی جرم ہو سکتا ہے؟

ان سوالات کے جوابات پانے کے لیے، ہمیں سب سے پہلے اپنی ذات کے تنگ دائرے سے ایک قدم باہر نکالنا ہوگا۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا ہم اس روئے زمین پر درد سہنے یا زیادتی کا شکار ہونے والے پہلے یا آخری انسان ہیں؟ ہمیں ان عظیم ہستیوں پر نگاہ ڈالنی ہوگی جو ہم سے پہلے گزری ہیں، تاکہ ہم ان کی جدوجہد، ان کے دکھوں، اور ان کی فتح مندیوں کا مطالعہ کر سکیں۔ اور ہمیں یہ ادراک حاصل کرنا ہوگا کہ روحانی اور باطنی بالیدگی کبھی درد اور کسک کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، اور حقیقی کامیابی مسلسل تگ و دو اور مشقت کا ہی ثمر ہوتی ہے۔ اور اس جدوجہد میں تقریباً ہمیشہ ہی دوسروں کی طرف سے پہنچائی جانے والی تکالیف کو جھیلنا اور ان پر فتح پانا شامل ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی درخشندہ اور روشن مثالوں کو یاد کرنا ہمیں یہ احساس دلائے گا کہ ہمارا درد کوئی اکیلا یا انوکھا نہیں ہے۔ یاد رکھیے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی اپنی قوم نے ساڑھے نو سو سال تک بدترین تمسخر، اذیتوں اور تضحیک کا نشانہ بنایا۔ قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے: كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَازْدُجِرَ "ان سے پہلے قومِ نوح نے بھی جھٹلایا، انہوں نے ہمارے بندے کی تکذیب کی اور کہا: یہ تو دیوانہ ہے! اور انہیں بری طرح جھڑک دیا گیا۔" [سورۃ القمر: 9] حضرت نوحؑ کو اس قدر شدید ستایا گیا کہ بالآخر انہوں نے اپنے رب کے حضور فریاد کی: فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ "پس انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ میں بے بس اور مغلوب ہو چکا ہوں، لہٰذا تو ہی میرا بدلہ لے (اور میری مدد فرما)!" [سورۃ القمر: 10]

یا ہم اس منظر کو اپنے ذہن میں تازہ کر سکتے ہیں کہ جب ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ پر سنگ باری کی گئی یہاں تک کہ آپ کا مبارک جسم لہولہان ہو گیا، اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو کس طرح بے دردی سے مارا پیٹا گیا اور بھوکا پیاسا تپتی ریت پر رکھا گیا۔ یہ تمام مظالم اور تکالیف انسانوں ہی کے ہاتھوں انسانوں کو پہنچائی گئی تھیں۔ حتیٰ کہ فرشتوں کو بھی انسانی فطرت کے اس تاریک پہلو کا ادراک تھا—اس سے قبل کہ ہمارا وجود معرضِ وجود میں آتا۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو خبر دی کہ وہ نوعِ انسانی کی تخلیق فرمانے والا ہے، تو فرشتوں کا پہلا استفسار انسان کے اسی شرانگیز رجحان کے متعلق تھا۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہمیں بتاتا

ہے: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ "اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، تو انہوں نے عرض کیا: کیا تو اس میں ایسے کو پیدا کرے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا؟" [سورۃ البقرۃ: 30]

ایک دوسرے کے خلاف ہولناک اور سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے کی انسانی صلاحیت اس دنیوی زندگی کی ایک تلخ اور افسوسناک حقیقت ہے۔ اس کے باوجود ہم میں سے بے شمار لوگ اللہ کے فضل و کرم سے نوازے گئے ہیں۔ ہم میں سے اکثریت کو کبھی ان ہولناک آفات و مصائب کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو تاریخ میں دیگر انسانوں پر گزری ہیں۔ ہم میں سے بیشتر کو شاید کبھی اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے خاندانوں کو تشدد کا نشانہ بنتے یا قتل ہوتے نہیں دیکھنا پڑے گا۔ تاہم، ہم میں سے شاذ و نادر ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اسے کسی دوسرے انسان کے ہاتھوں کبھی کوئی دکھ یا صدمہ نہیں پہنچا۔ لہٰذا، اگرچہ ہم میں سے اکثر کو بھوک سے مرنے کا ہولناک احساس یا اپنے گھروں کو اجڑتے دیکھ کر بے بس کھڑے رہنے کی اذیت شاید نہ سہنی پڑے، لیکن ہم میں سے ہر شخص یہ ضرور جانتا ہے کہ زخمی اور شکستہ دل کے ساتھ آنسو بہانے کا کرب کیا ہوتا ہے۔

کیا اس باطنی کرب سے بچنا ممکن ہے؟ ایک حد تک، میرا ماننا ہے کہ یہ ممکن ہے۔ ہم زندگی کے تمام تر درد سے تو کبھی دامن نہیں چھڑا سکتے، لیکن اپنی توقعات، اپنے ردعمل اور اپنی توجہ کے رخ کو درست کر کے، ہم بہت سی باطنی تباہ کاریوں سے خود کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، کسی دوسرے انسان پر اپنی تمام تر امیدیں وابستہ کر لینا، اس پر مکمل بھروسا اور تکیہ کر بیٹھنا سراسر غیر حقیقت پسندانہ اور کھلی حماقت ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ انسان خطا کا پتلا اور زوال پذیر ہے، چنانچہ ہمارا حتمی و آخری اعتماد، تکیہ اور امید صرف اور صرف اللہ ہی کی ذات پر ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ "...پس جو کوئی طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، تو یقیناً اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ خوب سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔" [سورۃ البقرۃ: 256] یہ یقین رکھنا کہ صرف اللہ ہی وہ واحد مضبوط کڑا اور سہارا ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتا، ہمیں بے شمار غیر ضروری مایوسیوں اور حسرتوں سے بچا لے گا۔

تاہم، اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہمیں محبت نہیں کرنی چاہیے یا ہمیں کم محبت کرنی چاہیے۔ اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ ہم محبت کس انداز میں کرتے ہیں! سوائے اللہ کے، کوئی بھی چیز یا ہستی ہماری محبت کا حتمی و آخری مرکز و محور نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارے دل میں اللہ سے آگے کسی کی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ اور ہمیں زندگی میں کبھی اس مقام پر نہیں پہنچنا چاہیے جہاں ہم اللہ کے سوا کسی دوسری چیز سے اس شدت کے ساتھ محبت کرنے لگیں کہ اس کے بغیر زندہ رہنا ہمیں ناممکن لگنے لگے۔ اس قسم کا نام نہاد 'عشق' دراصل محبت نہیں ہوتا بلکہ پرستش بن جاتا ہے، اور یہ سراسر دکھ اور عذاب کے سوا کچھ پیدا نہیں کرتا۔

لیکن تب کیا ہو جب ہم نے یہ سب کچھ کر لیا ہو، اور پھر بھی ہمیں دوسروں کے ہاتھوں دکھ، ناانصافی یا دھوکے کا سامنا کرنا پڑے—جیسا کہ انسانی زندگی میں ناگزیر طور پر پیش آتا ہی ہے؟ ہم وہ کام کیسے کریں جو سب سے زیادہ کٹھن ہے؟ ہم معاف کرنا کیسے سیکھیں؟ ہم اپنے دل کے ناسوروں کو کیسے بھریں اور ان زخموں پر مرہم رکھ کر لوگوں کے ساتھ بھلائی کا رویہ کیسے جاری رکھیں، جبکہ وہ ہمارے ساتھ بھلائی سے پیش نہ آتے ہوں؟

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے واقعے میں اس طرزِ عمل کی ایک بے مثال اور خوبصورت ترین جھلک ملتی ہے۔ جب ان کی لختِ جگر، ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بدترین تہمت اور بہتان باندھا گیا، تو حضرت ابوبکرؓ کو معلوم ہوا کہ اس افواہ اور بہتان تراشی میں مِسْطَح بھی شریک تھا، جو کہ ان کا قرابت دار (خالہ زاد بھائی) تھا اور جس کی حضرت ابوبکرؓ خود مالی کفالت کیا کرتے تھے۔ فطری طور پر حضرت ابوبکرؓ نے اس تہمت لگانے والے کی مالی امداد روک دی۔ اس واقعے کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ "اور تم میں سے جو فضیلت اور وسعت والے ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ قرابت داروں، مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو کچھ نہیں دیں گے۔ انہیں چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہیں معاف فرما دے؟ اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم فرمانے والا ہے۔" [سورۃ النور: 22] اس آیت کے سنتے ہی

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بیک وقت پکار اٹھا کہ ہاں، بخدا میں اللہ کی بخشش و مغفرت کا طلب گار ہوں! چنانچہ انہوں نے مسطح کی مالی امداد نہ صرف بحال کر دی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ عطا فرمانے لگے۔

اس درجے کا عفو و درگزر ہی ایک سچے مومن کی اصل روح اور باطنی پہچان ہے۔ ایسے مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے: وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ "اور وہ جو کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں، اور جب غصہ آئے تو فوراً معاف کر دیتے ہیں۔" [سورۃ الشوریٰ: 37]

کسی کو بآسانی معاف کر دینے کی یہ صلاحیت ہمارے اندر اپنے ذاتی عیوب اور دوسروں کے حق میں اپنی کوتاہیوں کے شعور سے پیدا ہونی چاہیے۔ لیکن سب سے بڑھ کر، ہمارے اندر یہ عاجزی و انکسار اس حقیقت کے ادراک سے جنم لینی چاہیے کہ جب ہم گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں تو اپنی زندگی کے ہر دن اپنے رب کے حضور کیسی ناانصافی اور نافرمانی کے مرتکب ہوتے ہیں! اللہ کی عظمت و کبریائی کے سامنے ہماری حیثیت ہی کیا ہے؟ اس سب کے باوجود، تمام جہانوں کا مالک، دن رات اپنے گناہ گار بندوں کو معاف فرماتا رہتا ہے۔ پھر ہم کون ہوتے ہیں جو دوسروں کے لیے عفو و درگزر کا دروازہ بند کر لیں؟ اگر ہم خود اللہ کی بخشش و رحمت کے امیدوار ہیں، تو بھلا ہم دوسروں کو معاف کیوں نہ کریں؟ اسی لیے تو حضور نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہ سنہری درس دیا ہے: «مَنْ لَا يَرْحَمِ النَّاسَ لَا يَرْحَمْهُ اللَّهُ» "جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اللہ اس پر رحم نہیں فرماتا۔" [صحیح مسلم]

اللہ کی بے پایاں رحمت کی یہی امید ہمارے اندر دوسروں کو معاف کر دینے کا ولولہ بیدار کرے، تاکہ ہم ایک دن اس ابدی اور حقیقی جہان میں داخل ہو سکیں جو واقعی ہر عیب اور نقص سے پاک اور کامل ہے۔

زندگی کا خواب

The Dream of Life

وہ محض ایک خواب تھا۔ ایک پل کے لیے اس نے مجھ پر غلبہ پا لیا تھا۔ تاہم اپنے اس ڈراؤنے خواب میں جو دکھ اور اذیت میں جھیل رہی تھی، وہ محض ایک التباس، ایک وہم تھا۔ عارضی۔ پلک جھپکنے کی مانند۔ مگر، میں خواب کیوں دیکھتی ہوں؟ مجھے نیند کے عالم میں اس زیاں، خوف اور حزن و ملال کو محسوس کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

اگر وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے، تو یہ وہ سوال ہے جو تاریخ کے ہر دور میں پوچھا جاتا رہا ہے۔ اور بے شمار لوگوں کے حق میں اس سوال کے جواب ہی نے ایمان کی طرف ان کی رہنمائی کی ہے—یا انہیں ایمان سے دور دھکیل دیا ہے۔ خدا پر یقین، زندگی کے مقصد پر بھروسا، کائنات کے اعلیٰ ترین نظام یا آخری منزل پر ایمان کا دارومدار اکثر اسی ایک سوال کے جواب پر رہا ہے۔ چنانچہ، اس سوال کو اٹھانا درحقیقت زندگی کی حتمی ترین حقیقت کے بارے میں دریافت کرنا ہے۔ ہم مصائب کیوں جھیلتے ہیں؟ 'اچھے' لوگوں کے ساتھ 'بری' باتیں کیوں پیش آتی ہیں؟ اگر خدا موجود ہے تو معصوم بچے بھوک سے کیوں بلکتے ہیں اور مجرم دندناتے کیوں پھرتے ہیں؟ ایک ایسی ہستی جو سراپا محبت اور قادرِ مطلق ہو، وہ ان مصائب و آلام کو رونما ہونے کی اجازت کیسے دے سکتی ہے؟

اور اگر خدا واقعی عادل اور سراپا خیر ہے، تو کیا صرف اچھے لوگوں کے ساتھ ہی اچھائی اور برے لوگوں کے ساتھ ہی برائی نہیں ہونی چاہیے تھی؟

تو اس کا دو ٹوک جواب ہے: جی ہاں! بالکل۔ اچھے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ صرف اچھی باتیں ہی پیش آتی ہیں، اور برے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ صرف برا ہی ہوتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے بڑا عادل اور سب سے زیادہ محبت کرنے والا ہے۔ اور اُس کے علم، حکمت اور ادراک میں کسی قسم کا کوئی نقص یا کمی نہیں ہے۔

اصل خرابی یہ ہے کہ علم اور فہم کا نقص ہمارے اپنے اندر موجود ہے۔

دیکھیے، اس جملے کو سمجھنے کے لیے کہ "اچھے لوگوں کے ساتھ صرف اچھا ہوتا ہے اور برے لوگوں کے ساتھ صرف برا"، ہمیں سب سے پہلے 'اچھے' اور 'برے' کی تعریف متعین کرنی ہوگی۔ اور اگرچہ دنیا میں جتنے انسان ہیں اتنی ہی اچھے اور برے کی تعبیریں موجود ہیں، لیکن پھر بھی ایک جامع اور مشترکہ مفہوم پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، بیشتر لوگ اس بات سے متفق ہوں گے کہ کسی معاملے میں اپنے مطلوبہ مقصد یا ہدف کو پا لینا 'اچھا' کہلائے گا۔ جبکہ دوسری طرف، اپنے مطلوبہ مقصد کے حصول میں ناکام رہنا 'برا' ہوگا۔ اگر میرا مقصد اپنا وزن بڑھانا ہے کیونکہ میں خطرناک حد تک کم وزن کی شکار ہوں، تو وزن کا بڑھ جانا اچھا ہوگا۔ لیکن دوسری طرف، اگر میرا مقصد وزن کم کرنا ہے کیونکہ میں نقصان دہ حد تک موٹاپے کا شکار ہوں، تو وزن کا بڑھنا برا ہوگا۔ پس ایک ہی واقعہ میرے مطلوبہ مقصد کے لحاظ سے بیک وقت اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔ چنانچہ میری نگاہ میں 'اچھائی' کا انحصار میرے ذاتی مقصد کے حصول پر ہے۔ اور کائنات میں حتمی و مطلق 'خیر' کا دارومدار انسان کے حتمی ترین مقصد کے حصول پر ہے۔

مگر میرا اصل اور حتمی مقصد کیا ہے؟

یہ سوال ہمیں مقصد کے اس بنیادی نقطے کی طرف لے آتا ہے جس کا تعلق وجود کی کائناتی اور عظیم تر حقیقت سے ہے۔ جب زندگی کے مقصد کی بات آتی ہے، تو بنیادی طور پر دو متضاد اور الگ الگ نقطہ ہائے نظر (جہان بینی) پائے جاتے ہیں۔ پہلا نقطۂ نظر یہ مانتا ہے کہ یہ دنیا ہی کل کائنات اور اصل حقیقت ہے، یہی ہماری کوششوں کی آخری منزل اور حتمی مقصد ہے۔ جبکہ دوسرا نقطۂ نظر یہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ فانی زندگی محض ایک پل اور ایک وسیلہ ہے، جو اللہ تعالیٰ کی لامتناہی حقیقت کے تناظر میں ایک لمحاتی جھلک سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

پہلے گروہ کے نزدیک یہ مادی زندگی ہی سب کچھ ہے۔ یہی وہ آخری منزل ہے جس کے لیے تمام عمل بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ لیکن دوسرے گروہ کے نزدیک، یہ زندگی صفر کی طرف مائل ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ لامحدودیت (انفینٹی) کے مقابلے میں بڑا سے بڑا عدد بھی صفر بن کر رہ جاتا ہے۔ محض کچھ نہیں۔ ایک عارضی اور گزر جانے والے خواب کی مانند!

یہ دونوں جداگانہ نقطہ ہائے نظر براہِ راست مقصد کے سوال پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دیکھیے، اگر کوئی یہ مانتا ہے کہ یہ دنیا ہی اصل حقیقت، آخری منزل اور تمام تر تگ و دو کا مرکز ہے، تو اس کے نزدیک زندگی کا واحد مقصد صرف اس فانی دنیا میں اپنی لذتوں، عیش و عشرت اور نفع کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا ہوگا۔ اس نظریاتی سانچے میں، واقعی ہر لمحہ 'اچھے' لوگوں کے ساتھ 'بری' باتیں پیش آ رہی ہیں۔ اور اسی دائرۂ فکر میں پھنس کر لوگ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دنیا میں کوئی انصاف نہیں، اور اس لیے نعوذ باللہ یا تو خدا کا وجود ہی نہیں ہے یا پھر خدا عادل نہیں ہے (معاذ اللہ، استغفر اللہ)۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص اس لیے خدا کے وجود کا انکار کر دے کیونکہ اس نے ایک برا اور ڈراؤنا خواب دیکھا تھا! لیکن ہم اپنے خوابوں کے مشاہدات اور تجربات کو اتنی زیادہ اہمیت کیوں نہیں دیتے؟ آخر کار بعض خواب جھیلنے میں نہایت ہولناک ہوتے ہیں—اور اکثر وہ خواب 'اچھے' انسانوں کو ہی دکھائی دیتے ہیں۔ کیا ہم خواب میں شدید ترین دہشت یا بے پناہ مسرت کا تجربہ نہیں کرتے؟ یقیناً کرتے ہیں۔ لیکن پھر جاگنے کے بعد اس کی کوئی وقعت کیوں نہیں رہ جاتی؟ اس لیے کہ حقیقی بیداری کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس خواب کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔

دوسرے نقطۂ نظر (یعنی اسلامی فکری سانچے) میں، تخلیق کا مقصد ایک ایسی زندگی میں مادی لذتوں اور مفادات کا حصول ہرگز نہیں ہے جو محض ایک خواب سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس اسلامی جہان بینی میں زندگی کے مقصد کا تعین خود پروردگار نے فرمایا ہے جو ارشاد فرماتا ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ "اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور غرض کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری بندگی و عبادت کریں۔" [سورۃ الذاریات: 56]

اس قرآنی فرمان کی خصوصی نحوی و بلاغی ساخت پر غور کرنا نہایت اہم ہے۔ اس کا آغاز ایک حصر اور نفی سے ہوتا ہے: "اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا سوائے..."۔ یعنی پہلے اللہ سبحانہ و تعالیٰ تمام دیگر اغراض و مقاصد کی قطعی نفی فرماتا ہے، اور اس کے بعد وہ اپنا واحد اور یکتا مقصد بیان فرماتا ہے: "سوائے اس کے کہ وہ میری بندگی کریں"۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بحیثیتِ مومن میں یہ جانتی ہوں کہ میرے وجود کا خدا کی معرفت، اس کی محبت اور اس کے قرب کے سوا کوئی دوسرا مقصد ہو ہی نہیں سکتا۔ میری تخلیق کی واحد اور اکلوتی وجہ یہی ہے۔ اور یہ وہ بنیادی ترین ادراک ہے جو میرے ہر عمل اور ہر عقیدے کی

نئی تعریف متعین کرتا ہے۔ یہ میرے اردگرد کی ہر شے اور زندگی میں پیش آنے والے ہر تجربے کا مفہوم بدل دیتا ہے۔

پس جب ہم 'اچھے' اور 'برے' کے حقیقی مفہوم کی طرف لوٹتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حتمی معنوں میں ہر وہ چیز جو ہمیں ہمارے اصل مقصد (قربِ الٰہی) کے قریب لے آئے وہ 'خیر' ہے، اور ہر وہ چیز جو ہمیں ہمارے اصل مقصد سے دور کر دے وہ 'شر' ہے۔ اگر اضافی اور مادی معنوں میں دیکھا جائے، تو جن لوگوں کی منزل صرف یہ دنیا ہے، ان کے نزدیک دنیاوی چیزیں ہی اچھے اور برے کا فیصلہ کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک دولت، منصب، شہرت یا جائیداد کا مل جانا لازمی طور پر 'اچھا' ہے۔ اور دولت، عہدے، شہرت یا جائیداد کا چھن جانا لازمی طور پر 'برا' ہے۔ لہٰذا اس مادی سانچے میں، جب کوئی معصوم انسان اپنی تمام مادی جمع پونجی سے محروم ہو جاتا ہے، تو اسے ایک 'اچھے' انسان کے ساتھ پیش آنے والا 'برا' واقعہ گردانا جاتا ہے۔ لیکن یہ محض ایک فریبِ نظر ہے جو ایک ناقص اور کج فکر نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے۔ جب عینک کا شیشہ ہی ٹیڑھا اور دھندلا ہو، تو اس میں سے دکھائی دینے والا منظر بھی بگڑا ہوا ہی نظر آتا ہے۔

دوسرے نقطۂ نظر (ایمانی بصیرت) کے حاملین کے نزدیک، ہر وہ چیز جو ہمیں اللہ کی رضا و محبت کے قریب تر کر دے وہ بھلائی اور خیر ہے؛ اور ہر وہ شے جو ہمیں اس مقصد سے دور کر دے وہ نقصان اور شر ہے۔ چنانچہ، ایک ارب ڈالر کی لاٹری جیت جانا میرے حق میں تاریخ کی بدترین مصیبت ثابت ہو سکتا ہے اگر وہ مجھے اللہ سے—جو میرا اصل مقصد ہے—غافل اور دور کر دے۔ دوسری طرف، میری ملازمت کا چھوٹ جانا، میری تمام جمع پونجی کا چھن جانا، اور یہاں تک کہ میرا شدید بیمار پڑ جانا بھی میرے لیے سب سے بڑی نعمت ثابت ہو سکتا ہے اگر وہ مجھے اللہ کے—جو میرا حقیقی مقصد ہے—قریب تر کر دے۔ یہی وہ سچی حقیقت ہے جس کا تذکرہ قرآنِ مجید میں یوں کیا گیا ہے جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتا ہے: وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ "اور عجب نہیں کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو، اور عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔" [سورۃ البقرۃ: 216]

بحیثیتِ مومن، اب میرا پیمانہ مادی معنوں میں نفع و نقصان نہیں رہا۔ میرا معیار اس سے کہیں بلند تر ہے۔ مادی اور دنیاوی لحاظ سے میرے پاس کیا ہے اور کیا نہیں، اس کی اہمیت صرف اسی قدر ہے کہ وہ مجھے میرے اصل ہدف—یعنی اللہ—کے قریب کرتا ہے یا اس سے دور۔ یہ دنیا اس خواب سے بڑھ کر کچھ نہیں رہ جاتی جسے میں ایک لمحے کے لیے دیکھتی ہوں اور پھر میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ خواب میرے حق میں اچھا تھا یا برا، اس کا فیصلہ صرف اس بات پر منحصر ہے کہ بیدار ہونے کے بعد میری باطنی حالت کیا ہے!

اور یوں کائنات کے حتمی ترازو میں کامل ترین اور بے عیب عدل و انصاف قائم ہے۔ اللہ پاک اچھے لوگوں کو صرف بھلائی (اپنا قرب) عطا فرماتا ہے، اور برے لوگوں کو برائی (اپنی ذات سے دوری) کی سزا دیتا ہے۔ سب سے بڑی خیر اور نعمت اس دنیا اور آخرت میں اللہ کا قرب ہے، اور اس نعمت سے صرف 'اچھے' مومن ہی سرفراز کیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: «عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ» "مومن کا معاملہ بھی کتنا عجیب ہے! اس کے ہر معاملے میں سراسر خیر ہی خیر ہے، اور یہ فضیلت مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اگر اسے کوئی خوشحالی و مسرت پہنچتی ہے تو وہ شکر ادا کرتا ہے، پس یہ اس کے لیے بہتر ہو جاتا ہے۔ اور اگر اسے کوئی تکلیف و مصیبت پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے، اور یہ بھی اس کے لیے باعثِ خیر بن جاتا ہے۔" [صحیح مسلم]

جیسا کہ اس حدیثِ مبارکہ سے واضح ہوتا ہے، کسی چیز کا اچھا یا برا ہونا اس کے ظاہری خدوخال سے طے نہیں ہوتا۔ اس حدیث کی رو سے "خیر اور بھلائی" کی پہچان اس پاکیزہ قلبی کیفیت سے ہوتی ہے جو وہ واقعہ انسان کے اندر پیدا کرتا ہے: یعنی صبر اور شکر—اور یہ دونوں کیفیات اللہ کے ساتھ قلبی سکون اور اُس کے قرب کا مظہر ہیں۔ دوسری طرف، سب سے بڑی آفت و مصیبت اس دنیا اور آخرت میں اللہ سے دور ہو جانا ہے۔ اور اس سزا کے مستحق صرف وہ لوگ بنتے ہیں جو برے ہیں۔ ایسے 'خدا سے دور' لوگوں کے پاس دولت، منصب، جائیداد یا شہرت کا ہونا یا نہ ہونا محض ایک دھوکا اور سراب ہے—جس کی حقیقت کسی خوشگوار خواب یا خوفناک ڈراؤنے خواب میں ان چیزوں کے پانے یا کھو دینے سے زیادہ کچھ نہیں۔

انہی فریب دہ دنیاوی رعنائیوں کے بارے میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ "اور اپنی آنکھیں اس دنیاوی زندگی کی چمک دمک کی طرف نہ اٹھاؤ جو ہم نے ان کے مختلف گروہوں کو برتنے کے لیے دی ہے تاکہ ہم اس کے ذریعے ان کی آزمائش کریں، اور تمہارے رب کا عطا کردہ رزق کہیں بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔" [سورۃ طہٰ: 131]

ہمیشہ قائم رہنے والی حقیقی زندگی وہ ہے جس کا آغاز اس وقت ہوگا جب ہم اس دنیا سے بیدار ہوں گے۔ اور اسی بیداری کے بعد ہم پر کھلے گا کہ... وہ تو محض ایک خواب تھا!

topqna.com

بند دروازے اور وہ فریب جو ہمیں اندھا کر دیتے ہیں

Closed Doors and the Illusions that Blind Us

کل کی بات ہے، میرے بائیس ماہ کے معصوم بیٹے نے اپنی خود مختاری کا مظاہرہ کرنا چاہا۔ گاڑی میں اپنی مخصوص نشست سے باہر نکلنے کے بعد، وہ کسی بڑے بچے کی طرح خود گاڑی کا دروازہ بند کرنا چاہتا تھا، اس لیے میں وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ اگر میں نے اسے دروازہ بند کرنے دیا تو اس کا ننھا سا سر دروازے کے بیچ آکر بری طرح کچل جائے گا، چنانچہ میں نے فوراً لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا اور دروازہ خود بند کر دیا۔ اس بات نے اسے سخت صدمے سے دوچار کر دیا اور وہ زار و قطار رونے لگا۔ بھلا میں نے اسے اس کام سے کیوں روک دیا جسے کرنے کی اس کے دل میں اتنی شدید تمنا تھی؟

اس واقعے کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں ایک عجیب خیال کوندا۔ مجھے وہ تمام مواقع یاد آگئے جب زندگی میں ہمارے ساتھ بھی ہو بہو یہی معاملہ پیش آیا تھا—جب ہم کسی چیز کو پانے کی بے تابانہ اور شدید آرزو کرتے ہیں، لیکن اللہ ہمیں وہ حاصل نہیں کرنے دیتا۔ مجھے وہ تمام گھڑیاں یاد آگئیں جب ہم نے ایک بالغ انسان ہوتے ہوئے بھی بالکل ویسی ہی گھٹن اور فرسٹریشن محسوس کی جب معاملات اس طرح نہیں سنورے جس کی ہم نے رات دن دعائیں مانگی تھیں۔ اور پھر اچانک مجھ پر حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی۔ میں نے اپنے لختِ جگر کو گاڑی کے دروازے سے صرف اس کی حفاظت کی خاطر دور ہٹایا تھا، لیکن وہ اس حقیقت سے یکسر بے خبر تھا۔ اپنی اس دل گرفتگی اور چیخ و پکار میں اسے ذرہ برابر اندازہ نہیں تھا کہ میں نے دراصل اسے ایک ہولناک چوٹ سے بچایا تھا۔ اور جس طرح میرا بیٹا اپنی نادانی اور معصومیت میں بلک بلک کر رو رہا تھا، بالکل اسی طرح ہم بھی اکثر ان ہی واقعات پر آنسو بہاتے اور ماتم کرتے ہیں جنہوں نے درحقیقت ہمیں کسی بڑی تباہی سے بچایا ہوتا ہے!

جب ہماری فلائٹ چھوٹ جاتی ہے، ملازمت چلی جاتی ہے، یا ہم اپنی پسند کے شخص سے شادی کرنے میں ناکام رہتے ہیں، تو کیا ہم نے کبھی ایک لمحے کے لیے ٹھہر کر اس امکان پر غور کیا ہے کہ شاید اسی میں

ہماری بہتری پنہاں تھی؟ اللہ سبحانہ و تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ "...اور عجب نہیں کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو، اور عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔" [سورۃ البقرۃ: 216]

لیکن ظاہری پردوں کے پار جھانکنا کتنا کٹھن ہوتا ہے! سرابوں اور فریبوں سے آگے نکل کر اس گہری حقیقت کو دیکھ پانے کے لیے بے پناہ باطنی قوت درکار ہوتی ہے—وہ حقیقت جسے ہم شاید سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں۔ جس طرح میرا معصوم بیٹا یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس لمحے اس کی سب سے محبوب خواہش سے اسے محروم کر دینا درحقیقت اس کے حق میں میری محبت اور خیر خواہی تھی، بعینہٖ ہم بھی اکثر و بیشتر اتنے ہی اندھے اور بے بصیرت ہو جاتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم زندگی بھر اپنے بند ہو جانے والے دروازوں کو ٹکٹکی باندھ کر حسرت سے تکتے رہتے ہیں، اور ان دروازوں کی طرف متوجہ ہونا بھول جاتے ہیں جو ہمارے لیے کھول دیے گئے ہیں۔ جب ہماری شادی اس شخص سے نہیں ہو پاتی جسے ہم نے اپنے دل میں بسایا تھا، تو ظاہری پردوں کے پار نہ دیکھ پانے کا یہ عیب ہمیں اس انسان کو دیکھنے سے بھی محروم کر دیتا ہے جو حقیقت میں ہمارے حق میں کہیں زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ جب ہمیں نوکری نہیں ملتی، یا ہماری کوئی محبوب ترین شے چھن جاتی ہے، تو ہمارے لیے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کائنات کے اس وسیع تر کینوس پر غور کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اکثر و بیشتر اللہ تعالیٰ ہم سے کوئی چیز صرف اس لیے چھینتا ہے تاکہ وہ ہمیں اس سے کہیں زیادہ عظیم الشان اور بہتر نعمت عطا فرما سکے!

حتیٰ کہ بڑے بڑے صدمات و سانحات کے پیچھے بھی یہی حکمت کارفرما ہو سکتی ہے۔ اولاد کا داغ مفارقت جھیلنے سے بڑھ کر دردناک صدمے کا تصور شاید ہی کیا جا سکے۔ اس کے باوجود، یہ المناک زیاں بھی درحقیقت ہمیں کسی بڑی تباہی سے بچانے اور ہمیں اس سے کہیں زیادہ بلند تر نعمت عطا کرنے کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے: «إِذَا مَاتَ وَلَدُ العَبْدِ قَالَ اللَّهُ لِمَلَائِكَتِهِ: قَبَضْتُمْ وَلَدَ عَبْدِي؟ فَيَقُولُونَ: نَعَمْ. فَيَقُولُ: قَبَضْتُمْ ثَمَرَةَ فُؤَادِهِ؟ فَيَقُولُونَ: نَعَمْ. فَيَقُولُ: مَاذَا قَالَ عَبْدِي؟ فَيَقُولُونَ: حَمِدَكَ وَاسْتَرْجَعَ. فَيَقُولُ اللَّهُ:

ابْنُوا لِعَبْدِي بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ، وَسَمُّوهُ بَيْتَ الْحَمْدِ» "جب کسی بندے کا بچہ فوت ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے: کیا تم نے میرے بندے کے لختِ جگر کی روح قبض کر لی؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: جی ہاں۔ اللہ فرماتا ہے: کیا تم نے اس کے دل کا پھل توڑ لیا؟ وہ عرض کرتے ہیں: جی ہاں۔ پھر اللہ فرماتا ہے: میرے بندے نے کیا کہا؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: اس نے تیری حمدبیان کی اور 'إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ' پڑھا۔ تب اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے: میرے اس بندے کے لیے جنت میں ایک محل تعمیر کرو اور اس کا نام 'بیتُ الحمد' (تعریف کا گھر) رکھو۔" [جامع ترمذی]

جب اللہ تعالیٰ ہم سے اولاد جیسی محبوب ترین ہستی واپس لے لیتا ہے، تو ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ نعمت اس لیے واپس لی ہو تاکہ وہ ہمیں اس سے بھی زیادہ عظیم اور دائمی چیز عطا فرمائے۔ بعید نہیں کہ اس صدمے اور صبر کے بدلے ہمیں جنت کی ابدی زندگی کا پروانہ مل جائے—ایک ایسی ابدی حیات جہاں ہم اپنے بچے کے ساتھ ہمیشہ رہیں گے۔ اور اس فانی دنیا کے برعکس، وہ ایک ایسا دائمی جہان ہوگا جہاں ہمارے بچے کو نہ کبھی کوئی تکلیف چھو سکے گی، نہ کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ ہی بیماری کا شائبہ ہوگا۔

اور اس دنیاوی زندگی میں تو خود ہماری بیماریاں بھی ویسی نہیں ہوتیں جیسی وہ بظاہر نظر آتی ہیں۔ ان بیماریوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ درحقیقت ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا فرما کر ہمیں پاک صاف کر رہا ہوتا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ شدید بخار کی تپش میں مبتلا تھے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُصِيبُهُ أَذًى مِنْ مَرَضٍ فَمَا سِوَاهُ إِلَّا حَطَّ اللَّهُ بِهِ سَيِّئَاتِهِ، كَمَا تَحُطُّ الشَّجَرَةُ وَرَقَهَا» "جس مسلمان کو بھی بیماری یا کوئی اور تکلیف پہنچتی ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے سبب اس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے جیسے درخت اپنے پتے گراتا ہے۔" [صحیح بخاری]

ایک اور حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے واضح فرمایا کہ یہ فضیلت انسان کے غم اور فکر و اضطراب کو بھی شامل ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «مَا يُصِيبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ وَلَا وَصَبٍ وَلَا هَمٍّ وَلَا حُزْنٍ وَلَا أَذًى وَلَا غَمٍّ، حَتَّى الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا، إِلَّا كَفَّرَ اللَّهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ» "کسی مسلمان کو جو بھی تھکن، بیماری، فکر، رنج، تکلیف یا ملال پہنچتا ہے، یہاں تک کہ وہ کانٹا بھی جو اس کے پاؤں میں چبھ جائے، اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس کے گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے۔" [صحیح بخاری]

یا پھر مفلسی اور ناداری کی مثال لے لیجیے۔ جو لوگ دولت سے محروم ہیں وہ عام طور پر غربت کو کبھی نعمت تصور نہیں کریں گے۔ لیکن قارون کے اردگرد رہنے والے لوگوں کے حق میں یہ مفلسی ایک بہت بڑی نعمت ثابت ہوئی۔ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا ایک ایسا شخص تھا جسے اللہ تعالیٰ نے اس قدر بے پناہ خزانے عطا کیے تھے کہ جن کے خزانوں کی کنجیاں اٹھانا بھی طاقتور لوگوں کی ایک جماعت کے لیے دوبھر تھا۔ قرآنِ حکیم فرماتا ہے: فَخَرَجَ عَلَىٰ قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ ۖ قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا يَا لَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ "پھر وہ اپنی قوم کے سامنے اپنے پورے ٹھاٹھ باٹھ اور زینت کے ساتھ نکلا، تو جو لوگ دنیاوی زندگی کے متلاشی تھے وہ کہنے لگے: کاش! ہمارے پاس بھی ویسا ہی مال و جاہ ہوتا جیسا قارون کو دیا گیا ہے، بلاشبہ وہ تو بڑے نصیب والا ہے!" [سورۃ القصص: 79]

لیکن قارون کی اس بے پایاں دولت نے اسے متکبر، ناشکرا اور اللہ کے خلاف سرکش بنا دیا تھا۔ چنانچہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتا ہے: فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ فَمَا كَانَ لَهُ مِن فِئَةٍ يَنصُرُونَهُ مِن دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنتَصِرِينَ ۝ وَأَصْبَحَ الَّذِينَ تَمَنَّوْا مَكَانَهُ بِالْأَمْسِ يَقُولُونَ وَيْكَأَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ ۖ لَوْلَا أَن مَّنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۖ وَيْكَأَنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ "پس ہم نے اسے اور اس کے محل کو زمین میں دھنسا دیا، پھر اللہ کے سوا کوئی ایسا گروہ نہ تھا جو اس کی مدد کرتا اور نہ وہ خود اپنا دفاع کر سکا۔ اور وہ لوگ جو کل اس کے منصب کی تمنا کر رہے تھے، صبح ہوتے ہی کہنے لگے: ہائے افسوس! اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ اگر اللہ کا ہم پر احسان نہ ہوتا تو وہ ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ افسوس! ناشکرے کبھی فلاح نہیں پاتے۔" [سورۃ القصص: 81-82] قارون کا عبرتناک انجام اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد، وہی لوگ اللہ کے شکر گزار بن گئے کہ انہیں قارون جیسی دولت کے فتنے سے محفوظ رکھا گیا تھا!

لیکن شاید اس سبق کی اس سے بہتر کوئی مثال نہیں مل سکتی جو حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعے میں سورۃ الکہف میں بیان کی گئی ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضرؑ کے ساتھ سفر کیا، تو انہوں نے سیکھا کہ معاملات اکثر و بیشتر ویسے نہیں ہوتے جیسے وہ سطح پر دکھائی دیتے ہیں،

اور اللہ کی حکمت کو ہمیشہ ظاہری نظر سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ حضرت خضرؑ اور حضرت موسیٰؑ ایک بستی میں پہنچے جہاں حضرت خضرؑ نے غریب ملاحوں کی کشتی میں سوراخ کر کے اسے عیب دار کرنا شروع کر دیا۔

ظاہری نگاہ میں یہ قدم کشتی کے ان غریب مالکان کے حق میں سراسر ظلم اور نقصان دہ معلوم ہوتا تھا۔ تاہم بعد میں حضرت خضرؑ نے وضاحت فرمائی کہ وہ درحقیقت ان غریبوں کا تحفظ کر رہے تھے اور ان کی کشتی کو بچا رہے تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ قرآنِ مجید میں فرماتا ہے: قَالَ هَٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ ۚ سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِع عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝ أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدتُّ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُم مَّلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا "انہوں نے کہا: یہ میرے اور آپ کے درمیان جدائی کا وقت ہے۔ اب میں آپ کو ان باتوں کی اصل حقیقت بتائے دیتا ہوں جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔ وہ جو کشتی تھی، وہ چند مسکینوں کی تھی جو سمندر میں محنت مزدوری کرتے تھے، تو میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں کیونکہ آگے ایک ظالم بادشاہ تھا جو ہر بے عیب کشتی کو زبردستی چھین رہا تھا۔" [سورۃ الکہف: 78-79]

کشتی کو عیب دار کر کے، حضرت خضرؑ درحقیقت ان غریبوں کی حفاظت فرما رہے تھے تاکہ وہ کشتی اس ظالم غاصب بادشاہ کی نظر میں بے کار ٹھہرے جو ہر صحیح اور سالم کشتی زبردستی چھین رہا تھا۔ اور زندگی میں بسا اوقات ہو بہو یہی معاملہ پیش آتا ہے۔ ہمیں کسی بڑی مصیبت سے بچانے کے لیے ہم سے کوئی محبوب چیز چھین لی جاتی ہے، یا ہمیں کوئی شے ایسے انداز میں دی جاتی ہے جسے ہم پسند نہیں کرتے۔ اور اس کے باوجود ہماری نادان نگاہوں کو—بالکل اس بائیس ماہ کے معصوم بچے کی طرح—وہ صرف ایک بند دروازہ ہی دکھائی دیتا ہے!

درد، نقصان اور اللہ کا راستہ

Pain, Loss and the Path to God

مجھے اب بھی وہ بے کلی اور تڑپ یاد ہے۔ اپنے باطن کے احتساب کے بعد اکثر جو گہری مایوسی اور شرمندگی انسان کو گھیر لیتی ہے، اسی عالم میں، میں اپنے خالق کے حضور گڑگڑانے کے لیے جھک گئی۔ میں فریاد لے کر حاضر ہوئی تھی—مگر ان چیزوں کے لیے نہیں جنہیں ناپا، خریدا، بیچا یا جن کا سودا کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک سچی اور کھری متاع کے لیے دل کی تڑپ تھی۔ جب میری خامیاں اور عیوب یکایک مجھ پر آشکار ہوئے، تو میں اپنے ہی نفس (خواہشاتِ نفسانی) کی استبدادی غلامی سے آزاد ہونے کے لیے بے چین ہو اٹھی۔ میں ایک بہتر انسان بننے کے لیے تڑپ رہی تھی۔

چنانچہ، اپنا دل اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے سپرد کرتے ہوئے، میں نے التجا کی کہ میرا تزکیہ کر دیا جائے اور مجھے پاک صاف بنا دیا جائے۔ اور اگرچہ میرا ہمیشہ سے یہ پختہ ایمان رہا تھا کہ اللہ دعاؤں کو سننے والا ہے، لیکن میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ دعا کب—اور کس انداز میں—شرفِ قبولیت پائے گی۔

اس دعا کے کچھ ہی عرصے بعد، میری زندگی کا ایک کٹھن ترین اور تاریک دور شروع ہوا۔ اس کڑی آزمائش کے دوران، میں نے اپنے ہوش و حواس مجتمع کیے اور ہمت و رہنمائی کے لیے دعائیں کیں۔ مگر مجھے ایک پل کے لیے بھی اپنی اس پہلی دعا اور اس مصیبت کے درمیان کوئی ربط نظر نہ آیا۔ جب وہ دور گزر گیا اور میں نے بعد میں اس پر غور کیا، تو مجھے احساس ہوا کہ میرے اندر کیسی زبردست روحانی بالیدگی اور پختگی آچکی تھی۔ اچانک، مجھے اپنی وہ پرانی دعا یاد آگئی۔ اور یکایک مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ کٹھن اور جان لیوا تنگی درحقیقت اسی دعا کا جواب تھی جو میں نے اس قدر اضطراب اور تڑپ کے ساتھ مانگی تھی!

مولانا رومیؒ کے الفاظ اس حکمت کو کیا ہی دلنشین انداز میں بیان کرتے ہیں: "جب کوئی شخص قالین کو لاٹھی سے پیٹتا ہے، تو وہ قالین کو نہیں مار رہا ہوتا—بلکہ اس کا اصل مقصد اس کی گرد جھاڑنا ہوتا ہے۔ تمہارا باطن 'میں' (خود پسندی اور انا) کے پردے کی گرد سے اٹا پڑا ہے، اور وہ گرد بیک وقت صاف نہیں ہو سکتی۔ ہر

چوٹ، ہر صدمے اور ہر ضرب کے ساتھ، وہ غبار دل کے چہرے سے رفتہ رفتہ جدا ہوتا ہے، کبھی نیند کے عالم میں اور کبھی بیداری میں۔"

ہم زندگی میں کتنے ہی تجربات سے گزرتے ہیں، مگر ان کے درمیان باہمی رشتے اور ربط کو کبھی نہیں دیکھ پاتے۔ جب ہم پر کوئی مصیبت آن پڑتی ہے، یا ہم کسی درد میں مبتلا ہوتے ہیں، تو ہم اکثر یہ سوچنے سے قاصر رہتے ہیں کہ شاید یہ تلخ تجربہ کسی دوسرے عمل کا براہِ راست نتیجہ یا سبب ہو۔ کبھی کبھار ہم اپنی زندگی کے دکھ درد اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کے مابین موجود گہرے ربط کو پہچاننے سے قاصر رہتے ہیں۔

زندگی میں دکھ اور مصیبت بہت سے مقاصد پورے کرتے ہیں۔ کٹھن گھڑیاں ہمارے خالق کے ساتھ ہمارے ٹوٹے ہوئے رشتے کے لیے ایک نشانی کا کام بھی کرتی ہیں اور اس کا علاج بھی بن جاتی ہیں۔ آزمائش کا وقت ہمارے ایمان، ہمارے صبر و استقلال اور ہماری باطنی قوت کا امتحان لیتا ہے۔ انہی لمحات میں ہمارے ایمان کا اصل معیار اور سطح آشکار ہوتی ہے۔ مصیبتیں ہمارے چہروں سے منافقت کے مکھوٹے اتار پھینکتی ہیں، اور محض زبانی دعوائے ایمان کے پیچھے چھپی حقیقت کو بے نقاب کر دیتی ہیں۔ مشکلات ہی ان لوگوں کو الگ کر کے نمایاں کرتی ہیں جن کا دعویٰ سچا ہے اور ان کو الگ کرتی ہیں جو محض جھوٹے ہیں۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۖ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ "کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ صرف اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ 'ہم ایمان لائے' اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی؟ حالانکہ ہم نے ان لوگوں کو بھی آزمایا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں، پس اللہ ضرور معلوم کر کے رہے گا کہ کون سچے ہیں اور وہ جھوٹوں کو بھی لازماً بے نقاب فرما دے گا۔" [سورۃ العنکبوت: 2-3]

مشکلات ہمارا امتحان لیتی ہیں۔ مشکلات ایک نعمت اور اللہ کی محبت کی علامت بھی بن سکتی ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: «مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُصِبْ مِنْهُ» "اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے، اسے کسی نہ کسی آزمائش اور تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے۔" [صحیح بخاری]

اس کے باوجود بیشتر لوگ اس بات کا ادراک کرنے سے قاصر رہتے ہیں کہ مصیبت بھلا کس طرح باعثِ خیر ہو سکتی ہے! بہت سے لوگ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ تنگی اور تکلیف درحقیقت ایک مصفّیٰ (پاک کرنے والا عمل) ہے جو انسانوں کو کھینچ کر ان کے رب کے حضور واپس لے آتی ہے۔ اس متکبر و مغرور انسان پر کیا بیتتی ہے جسے اچانک کسی ایسی صورتحال میں لا کھڑا کیا جائے جس پر اس کا کوئی بس نہ چلتا ہو؟ اس شخص کا کیا بنتا ہے جو طوفان کے تھپیڑوں میں خود کو سمندر کے بیچوں بیچ بے یار و مددگار پاتا ہے؟ کیا ہوتا ہے جب وہ جہاز جسے 'کبھی نہ ڈوبنے والا' کہا گیا تھا، ٹائٹینک کے المناک انجام کی داستان بن جاتا ہے؟

یہ بظاہر نظر آنے والی مصیبتیں دراصل نیند سے جھنجھوڑ دینے والی صدائیں (ویک اپ کالز) ہوتی ہیں۔ یہ انسان کو عاجز بناتی ہیں۔ یہ جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ یہ ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ ہم کتنے حقیر اور بے بس ہیں، اور اللہ کس قدر عظیم و برتر ہے! اور یوں یہ ہمیں اپنے فریبوں، اپنی غفلتوں اور اپنی آوارہ خرامی کی گہری نیند سے بیدار کر کے دوبارہ ہمارے خالق کی طرف لوٹا لاتی ہیں۔ مشکلات و شدائد ہماری آنکھوں سے جھوٹی آسائشوں اور آرام پسندی کا پردہ چاک کر دیتی ہیں، اور ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ ہماری اصل حقیقت کیا ہے اور ہماری آخری منزل کہاں ہے!

اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتا ہے: وَبَلَوْنَاهُم بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ "...اور ہم نے انہیں اچھے اور برے حالات کے ذریعے آزمایا تاکہ وہ رجوع کر لیں۔" [سورۃ الأعراف: 168] ایک اور آیت میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے واضح فرمایا: وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّبِيٍّ إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُونَ "اور ہم نے کسی بستی میں کبھی کوئی نبی نہیں بھیجا مگر یہ کہ ہم نے وہاں کے لوگوں کو سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا تاکہ وہ عاجزی و انکسار اختیار کریں۔" [سورۃ الأعراف: 94]

عاجزی کا یہ سبق انسانی روح کا ایسا کامل تزکیہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود قرآنِ مجید میں اہلِ ایمان کو تسلی دیتا ہے اور انہیں یقین دلاتا ہے کہ جس دکھ اور صدمے سے بھی وہ دوچار ہوتے ہیں، اس کا مقصد دراصل انہیں بلند درجات عطا کرنا اور عزت بخشنا ہے۔ وہ فرماتا ہے: إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ "اگر تمہیں کوئی زخم لگا ہے تو (یاد رکھو کہ) ان لوگوں کو بھی ایسا ہی زخم لگ چکا ہے۔ اور یہ تو وہ دن ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان

بدلتے رہتے ہیں، تاکہ اللہ ایمان والوں کو جانچ لے اور تم میں سے بعض کو شہادت کا رتبہ عطا فرمائے، اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا۔" [سورۃ آل عمران: 140]

نفس کے تزکیے کی یہی مسلسل جنگ دراصل اللہ کی طرف بلند ہونے والے راستے کی اصل روح ہے۔ اس کا آغاز ایثار اور قربانی سے ہوتا ہے، اور یہ راستہ محنت اور جدوجہد کے پسینے سے سینچا جاتا ہے۔ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس کا نقشہ پروردگار نے اپنے اس فرمان میں کھینچا ہے: يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ "اے انسان! بے شک تو اپنے رب کی طرف پہنچنے تک کٹھن مشقتیں جھیلتا ہوا بڑھ رہا ہے، پس بالآخر تو اس سے ملنے والا ہے۔" [سورۃ الانشقاق: 6]

topqna.com

مشکلات پر ایک مومن کا ردعمل

A Believer's Response to Hardship

مسلمانوں کے لیے موجودہ دور شدید ہیجان، اضطراب اور آزمائشوں کا دور ہے۔ بعض اوقات ناامیدی اور یاس کے احساس سے دامن بچانا محال نظر آتا ہے۔ ہم میں سے بیشتر لوگ یہ سوچ کر حیران و پریشان ہیں کہ آخر یہ سب کچھ ہمارے ہی ساتھ کیوں ہو رہا ہے؟ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ ہم نے کوئی غلط کام نہیں کیا؟ ہم ایک ایسے ملک میں، جس کی بنیاد ہی سب کے لیے "آزادی"، "خود مختاری" اور "عدل و انصاف" کے دعووں پر رکھی گئی تھی، اس قدر شدید تعصب، نفرت اور امتیازی سلوک کا شکار کیوں ہو رہے ہیں؟

اگرچہ یہ تمام خیالات و وسوسے انسانی فطرت کے تحت بالکل قدرتی ہیں، مگر ہمیں ان کی حدوں سے آگے جھانکنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک لمحے کے لیے اس ظاہری فریب کے پار دیکھنا ہوگا، اس ابدی حقیقت کی طرف جو پس پردہ کارفرما ہے۔ اگر ہم اس فریبِ نظر (ہولوگرام) سے پرے اصل حق کو دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی نگاہوں کے زاویے کو درست کرنا ہوگا۔ اور وہ حق، قرآنِ مجید اور سیرتِ نبوی کے بار بار دہرائے جانے والے بنیادی ترین اسباق میں سے ایک ہے۔ اور وہ بنیادی حقیقت یہ ہے: اس دنیاوی زندگی میں پیش آنے والی ہر ہر چیز دراصل ایک امتحان ہے!

اللہ سبحانہ و تعالیٰ قرآنِ مجید میں ارشاد فرماتا ہے: الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ "جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے عمل کے اعتبار سے کون زیادہ اچھا ہے، اور وہ زبردست ہے، بڑا بخشنے والا ہے۔" [سورۃ الملک: 2] یہاں ہمیں صاف طور پر بتا دیا گیا کہ موت اور حیات کی تخلیق کی اصل غرض و غایت ہی کیا ہے: یعنی ہمارا امتحان لینا!

ایک لمحے کے لیے ہنگامی حالات والے خطرے کے سائرن (ایمرجنسی سائرن) کے بارے میں سوچیے۔ اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ سائرن ایک نشانی اور پیشگی انتباہ ہوتا ہے کہ کوئی خطرہ یا آفت سر پر آنے والی ہے۔ جب ہم اسے سنتے ہیں تو قدرتی طور پر گھبراہٹ اور خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن کیا ہوتا ہے جب حکام کو

سائرن کے نظام کی جانچ کرنی ہوتی ہے؟ تب کیا ہوتا ہے جب یہ جاننے کے لیے کہ لوگ کیسا رد عمل دیتے ہیں محض ایک آزمائشی مشق (موک ڈرل) کی جاتی ہے؟ اس آزمائشی سائرن کی آواز بھی ہوبہو اصل خطرے کے سائرن جیسی ہی ہوتی ہے، لیکن وہ "صرف ایک مشق" ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ دیکھنے، سننے اور محسوس ہونے میں بالکل حقیقی معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں وہ کوئی خطرہ نہیں ہوتی؛ وہ محض ایک امتحان ہوتا ہے۔ اور اس جانچ کے دوران لاؤڈ اسپیکر پر ہمیں بار بار یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ یہ صرف ایک آزمائش ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہمیں اس دنیاوی زندگی کے متعلق سمجھاتا ہے۔ یہ زندگی دیکھنے، سننے اور محسوس کرنے میں انتہائی حقیقی، سچی اور ٹھوس معلوم ہوگی۔ بسا اوقات یہ ہمیں خوفزدہ کر کے رکھ دے گی۔ کبھی یہ ہمیں خون کے آنسو رلائے گی۔ کبھی یہ ہمیں اپنے قدموں پر مضبوطی سے جمے رہنے کی بجائے میدان چھوڑ کر بھاگ نکلنے پر اکسائے گی۔ لیکن یہ مادی زندگی اور اس کا ہر واقعہ محض ایک امتحان ہے۔ یہ اصل اور ابدی حقیقت نہیں ہے۔ اور ہنگامی نشریاتی نظام کی اس آزمائشی مشق کی طرح، یہ فانی امتحان ہمیں اس حقیقت کے لیے تیار اور تربیت یافتہ کر رہا ہے جو اصل ہے۔ یہ ہمیں اس ابدی حقیقت کے لیے تیار کر رہا ہے جو اس آزمائشی سائرن کی آواز کے پار منتظر ہے۔

اب سوچیے، اگر اس آزمائشی سائرن کا بجنا کوئی اچانک یا غیر متوقع واقعہ ہی نہ ہو تو کیا ہوگا؟ کیا ہو اگر پہلے سے ہر ہر گھر کو باقاعدہ نوٹس اور پیشگی اطلاع بھیج دی گئی ہو کہ فلاں وقت امتحان کی گھنٹی بجنے والی ہے؟ ایک لمحے کے لیے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی اس پیشگی اطلاع اور نوٹس پر غور کیجیے جو اس نے ہمیں دیا ہے: لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ "تم اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے معاملے میں ضرور آزمائے جاؤ گے، اور تم اہلِ کتاب اور مشرکین کی طرف سے بہت سی دل آزار اور تکلیف دہ باتیں ضرور سنو گے۔ اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بلاشبہ یہ بڑی ہمت اور عزم کے کاموں میں سے ہے۔" [سورۃ آل عمران: 186]

اب تصور کیجیے کہ اس پیشگی اطلاع کے ساتھ ساتھ، ہمیں ان ان گنت سابقہ امتوں اور قوموں کا احوال بھی تفصیل سے بتا دیا گیا ہو جن کی ہوبہو اسی طرح آزمائش کی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم ۖ مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ

آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ "کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں یوں ہی داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں بیتے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں پر بیتے تھے؟ انہیں ایسی تنگیاں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ اس طرح جھنجھوڑ ڈالے گئے کہ خود وقت کے پیغمبر اور ان کے ساتھ ایمان والے پکار اٹھے: اللہ کی مدد کب آئے گی؟ سن لو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔" [سورۃ البقرۃ: 214]

پس نہ صرف یہ کہ سائرن کی آمد کی پہلے سے پیش گوئی کر دی گئی تھی—بلکہ یہ کوئی انوکھی اور نئی بات بھی نہیں تھی۔ فرض کیجیے کہ ہماری امت کو بتا دیا گیا تھا کہ ہم کوئی پہلے یا اکیلے نہیں ہیں۔ چنانچہ اس سب کے بعد، جب آزمائش کا وہ سائرن بج اٹھے گا تو ہمارا ردعمل کیا ہونا چاہیے؟ ظاہر ہے، جب ہمیں معلوم ہو کہ یہ محض ایک مشق اور امتحان ہے، تو نہ کوئی حیرت ہوگی اور نہ ہی انکار۔ ہم حواس باختہ نہیں ہوں گے، اور نہ ہی مایوسی و اضطراب میں مبتلا ہوں گے۔ لیکن ہم عمل ضرور کریں گے!

اور اصل اور فیصلہ کن نکتہ یہیں آتا ہے۔ ہم کس کے لیے عمل کر رہے ہیں؟ ہمارا امتحان کون لے رہا ہے؟ درحقیقت کون ہمیں دیکھ رہا ہے؟ سی این این (CNN)؟ سی اسپین (C-SPAN)؟ یا امریکی عوام؟ نہیں! ہرگز نہیں! یہ سب تو اس فریبِ نظر کا حصہ ہیں؛ یہ سب تو خود اس آزمائش کے کارندے ہیں۔ یہ سب اس امتحانی منظر نامے کی مخلوق ہیں۔ ہم صرف اور صرف ایک ہی منصف کے لیے عمل کرتے ہیں۔ ہم کائنات کی واحد ابدی و برحق ہستی (الحق) کی خاطر عمل کرتے ہیں۔ ہم اس لیے قدم اٹھاتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے، اور صرف وہی اس امتحان کا حتمی فیصلہ فرمانے والا ہے!

جیسے ہی ہم اس بنیادی حقیقت کو پا لیتے ہیں، ہمارے اندر ایک انقلابی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ جونہی ہمارے دل و دماغ میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہے کہ یہ سب کچھ محض ایک امتحان ہے، ہمارے سوالات یکسر بدل جاتے ہیں۔ اس شکوے کی بجائے کہ: "ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟" اور "یہ دنیا اتنی ظالم اور غیر منصفانہ کیوں ہے؟" ہمارے باطنی سوالات یہ بن جاتے ہیں: "مجھے اس پر کیسا ردعمل دینا چاہیے؟" "میں اس امتحان میں سرخرو کیسے ہو سکتا ہوں؟" "اس آزمائش سے مجھے کیا سبق سیکھنا مقصود ہے؟" "میں اس ظاہری پردے کو چاک کر کے، مجھے تکلیف پہنچانے والے، مجھ پر ظلم ڈھانے والے اور خود اس آزمائش کے اصل خالق کو کیسے دیکھوں؟" "بحیثیتِ امت ہم اس آزمائش کو کس طرح اپنی حتمی منزل یعنی اللہ کا قرب پانے

کے لیے استعمال کر سکتے ہیں؟" اور "ہم اس امتحان کو اس مقصد کی تکمیل کا ذریعہ کیسے بنائیں جس کے لیے اسے تخلیق کیا گیا تھا—یعنی ایک ایسا آلہ جو ہمیں ہمارے رب کے قریب تر کر دے؟" اللہ اکبر!

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے امتحانات کا حسن اور اعجاز دیکھیے کہ ان کے آنے کی پیشگی اطلاع دینے کے بعد، وہ ہمیں ان میں شاندار کامیابی حاصل کرنے کا نسخۂ کیمیا بھی عطا فرماتا ہے: اور وہ نسخہ ہے "صبر" اور "تقویٰ" (خدا ترسی اور بیداریٔ باطن)! اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتا ہے: لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ "تم اپنے مالوں اور اپنی جانوں میں ضرور آزمائے جاؤ گے، اور تم اہلِ کتاب اور مشرکین سے بہت سی دل آزار باتیں سنو گے، پس اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ یقیناً اولو العزمی کے کاموں میں سے ہے۔" [سورۃ آل عمران: 186]

ایک اور آیتِ مبارکہ میں، اللہ تعالیٰ نے ہمارے خلاف کی جانے والی سازشوں کے ہر نقصان سے محفوظ رہنے کے لیے انہی دو لازمی اجزاء (صبر اور تقویٰ) پر زور دیا ہے: إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا ۖ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ "اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو انہیں برا لگتا ہے اور اگر تم پر کوئی برائی آپڑے تو وہ اس پر خوش ہوتے ہیں۔ لیکن اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی کوئی چال اور سازش تمہیں ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ بے شک اللہ ان کے تمام کرتوتوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔" [سورۃ آل عمران: 120]

آزمائشوں میں کامیابی کے رہنما دستور کے طور پر، اللہ تعالیٰ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ہم سے پہلے گزرے ہوئے اہل ایمان نے امتحانات کے وقت کیسا طرزِ عمل اختیار کیا تھا: الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ۝ فَانقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ ۝ إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ "جن سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف ایک بہت بڑا لشکر جمع ہو چکا ہے لہٰذا ان سے ڈرو، تو اس بات نے ان کے ایمان کو اور زیادہ بڑھا دیا اور انہوں نے کہا: ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے! پس وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ یوں لوٹے کہ انہیں ذرہ برابر کوئی گزند نہ پہنچی، اور وہ اللہ کی رضا

کے تابع رہے۔ اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ یہ تو دراصل شیطان ہے جو اپنے حامیوں سے ڈراتا ہے؛ پس تم ان سے مت ڈرو، اور صرف مجھ ہی سے ڈرو اگر تم سچے مومن ہو۔" [سورۃ آل عمران: 173-175]

ایک اور مقام پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہمیں بتاتا ہے: وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝ ... بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ ۖ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ "اور کتنے ہی انبیاء ایسے گزرے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی، پس اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے نہ تو انہوں نے ہمت ہاری، نہ کمزوری دکھائی اور نہ ہی باطل کے آگے سر جھکایا، اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔ اور ان کی زبانوں پر اس کے سوا کوئی بات نہ تھی کہ: اے ہمارے رب! ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمارے معاملات میں ہماری زیادتیوں سے درگزر فرما، اور ہمارے قدموں کو جما دے اور کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ چنانچہ اللہ نے انہیں دنیا کا ثواب بھی عطا کیا اور آخرت کا بہترین اجر بھی، اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے... بلکہ اللہ ہی تمہارا مولیٰ و مددگار ہے، اور وہ بہترین نصرت فرمانے والا ہے۔" [سورۃ آل عمران: 146-150]

اللہ سبحانہ و تعالیٰ یہ تمام ایمان افروز داستانیں ہمارے سامنے اس لیے بیان فرماتا ہے تاکہ ہم ان اسلاف اور متقین کے ردعمل سے سبق حاصل کر سکیں جو ہم سے پہلے اس راہ سے گزر چکے ہیں۔ اور ان کا ردعمل کیا تھا؟ ان کا ردعمل یہ تھا: "حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ" (ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے)۔ ان کا ردعمل یہ دعا تھی: "اے ہمارے رب! ہمارے گناہ معاف فرما دے، ہمارے معاملات کی کوتاہیوں سے درگزر کر، ہمارے قدم جما دے اور کافروں پر ہمیں فتح عطا فرما"۔ ان کا شیوہ یہ نہیں تھا کہ وہ محض امتحان پر نظریں جما کر بیٹھ جائیں؛ بلکہ ان کا طرزِ عمل یہ تھا کہ وہ امتحان کے آر پار دیکھتے تھے۔ انہوں نے ظاہری فریب کے پردے کو چاک کر کے اپنی نگاہیں اس ذات پر مرکوز کیں جو پسِ پردہ کارفرما ہے: یعنی اللہ تعالیٰ! انہوں نے جان لیا کہ امتحان لینے والا بھی اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے اور اس کٹھن امتحان سے نجات بخشنے والا بھی وہی اکیلا

ہے۔ چنانچہ انہوں نے توبہ و استغفار، صبرِ جمیل، اور اپنے کردار کو تقویٰ کے زیور سے آراستہ کر کے اسی کے حضور نصرت کی فریاد کی۔

لیکن سب سے زیادہ دلوں کو تسکین دینے والی بات یہ ہے کہ خود اللہ تبارک و تعالیٰ مومنوں کو دلاسہ دیتا ہے اور ان سے حتمی فتح و کامیابی کا وعدہ فرماتا ہے: وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ ۝ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ "اور تم نہ ہمت ہارو اور نہ غمگین ہو، تم ہی سربلند رہو گے بشرطیکہ تم سچے مومن ہو۔ اگر تمہیں کوئی زخم لگا ہے تو ان لوگوں کو بھی ویسا ہی زخم لگ چکا ہے۔ اور یہ تو وہ دن ہیں جن کے حالات ہم لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں، تاکہ اللہ ایمان والوں کو جانچ لے اور تم میں سے بعض کو شہادت کا رتبہ عطا فرمائے، اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور تاکہ اللہ سچے مومنوں کا تزکیہ فرمائے اور کافروں کو مٹا دے۔ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے ان لوگوں کو پرکھا ہی نہیں جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا اور جو ثابت قدم رہنے والے ہیں؟" [سورۃ آل عمران: 139-142]

جیسے ہی ہم زندگی کو دیکھنے والی اپنی عینک کا شیشہ بدلتے ہیں، ہمارا اندرونی اور بیرونی ردعمل یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔ جب ہم سے پہلے گزرے ہوئے متقین آزمائے گئے، تو اس آزمائش نے ان کے ایمان اور اطاعت میں مزید اضافہ ہی کیا۔ قرآنِ مجید اس کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے: وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ۚ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا "اور جب مومنوں نے (مدینہ کا گھیراؤ کرنے والے کفر کے) لشکروں کو دیکھا، تو وہ پکار اٹھے: یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ فرمایا تھا، اور اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ فرمایا تھا! اور اس آزمائش نے ان کے ایمان اور جذبۂ تسلیم و اطاعت ہی میں اضافہ کیا۔" [سورۃ الأحزاب: 22]

لیکن جب تک ہم اس عینک کے زاویے کو نہیں بدلیں گے، ہم کبھی اس بیزار کن شکوے سے آگے نہیں بڑھ سکیں گے کہ "ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہو گیا؟" اور ہم اس امتحان کے حقیقی مقصد کو نہیں سمجھ پائیں

گے: یعنی ایک ایسا تکوینی ذریعہ جو ہمارا تزکیہ کرنے، ہمیں کندن بنانے، اور مجھے، آپ کو اور ہمارے تمام دشمنوں کو پیدا کرنے والے اس خالقِ کائنات کے قریب تر کرنے کے لیے بنایا گیا ہے!

topqna.com

یہ زندگی: قید خانہ یا جنت؟

This Life: A Prison or Paradise?

میں ہوائی اڈے پر موجود تھی۔ سیکیورٹی کی قطار میں کھڑے ہو کر میں اپنی روایتی تفتیش اور پوچھ گچھ کی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ وہاں کھڑے کھڑے میری نظر ایک چھوٹی سی بچی پر پڑی جو اپنی ماں کے ساتھ تھی۔ وہ بچی رو رہی تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ ماں نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر بچی کو کوئی دوا دینے کی کوشش کی۔ مجھے اس ننھی سی معصوم بچی کی بے بسی اور تکلیف دیکھ کر شدید دکھ ہوا، اور اچانک مجھ پر ایک حقیقت منکشف ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی ایسے وجود کو دیکھ رہی ہوں جو کسی شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ پاکیزہ اور معصوم روح ایک ایسے فانی مادی جسم کے اندر قید تھی جس کی مجبوری تھی کہ وہ بیمار پڑے، درد جھیلے اور اذیتیں برداشت کرے۔

اور پھر مجھے وہ مشہورِ زمانہ حدیثِ مبارکہ یاد آئی جس میں حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: «الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ، وَجَنَّةُ الْكَافِرِ» "یہ دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت۔" [صحیح مسلم] اور پہلی بار، میں نے اس حدیث کو اس مفہوم سے بالکل مختلف انداز میں سمجھا جو اب تک میرے ذہن میں تھا۔ میرا خیال ہے کہ بہت سے لوگ اس حدیث کی غلط تعبیر کرتے ہیں؛ وہ سمجھتے ہیں کہ کافروں کو اس دنیا میں کھل کھیلنے اور عیش کرنے کی کھلی چھوٹ ہے، جبکہ مومنوں کو حلال و حرام کی پابندیوں میں جکڑ دیا گیا ہے اور انہیں اپنی خوشیوں کے لیے اگلی زندگی کا انتظار کرنا پڑے گا۔ یا شاید کچھ لوگوں کا گمان ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا مومن کے لیے سراسر مصیبت اور دکھ کی جگہ ہے، جبکہ کافر کے لیے یہ سراسر راحت اور عیش و طرب ہے۔

لیکن میرا قطعی یہ ماننا ہے کہ اس حدیث کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے۔

اور یکایک مجھے محسوس ہوا کہ میں اس چھوٹی سی بچی کے اندر اس حدیث کی اصل حقیقت کا مشاہدہ کر رہی ہوں۔ مجھے ایک ایسی روح قید نظر آئی جس کا اصل وطن درحقیقت کوئی اور جہان تھا—ایک ایسا بہتر اور

پاکیزہ جہان، جہاں اسے بیمار نہیں پڑنا تھا!

لیکن تب کیا ہوتا ہے جب معاملہ اس کے برعکس ہو؟ کیا ہوتا ہے جب روح پہلے ہی سے یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ تو جنت میں موجود ہے؟ کیا وہ روح کبھی کسی اور جگہ جانے کی تمنا کرے گی؟ کسی بہتر مقام پر پہنچنے کی آرزو کرے گی؟ ہرگز نہیں! وہ تو ٹھیک اسی جگہ پر موجود ہے جہاں وہ رہنا چاہتی ہے۔ اس روح کی نظر میں اس سے 'بہتر' کوئی شے وجود ہی نہیں رکھتی۔ جب آپ جنت میں ہوں، تو آپ اس سے اعلیٰ و برتر کسی اور مقام کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ آپ کسی اور چیز کے لیے نہیں تڑپتے، نہ کسی اضافے کی تمنا کرتے ہیں۔ آپ وہیں مطمئن اور مگن ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور یہی کیفیت ایک کافر اور منکرِ حق کی ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتا ہے: إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ "بے شک جو لوگ ہم سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور دنیاوی زندگی پر ہی راضی ہو گئے اور اسی پر مطمئن ہو بیٹھے، اور جو ہماری نشانیوں سے یکسر غافل ہیں۔" [سورۃ یونس: 7]

منکرِ حق اور کافر روح کے نزدیک، یہ ناگزیر طور پر تکلیف دہ، حسرتوں سے بھری اور عارضی دنیا ہی ان کی 'جنت' ہے۔ وہ اس کے سوا کچھ جانتے ہی نہیں۔ ذرا تصور کیجیے کہ اگر ایک ایسی دنیا جس میں آپ کو ٹھوکریں کھانی پڑیں، لہولہان ہونا پڑے اور بالآخر مر جانا پڑے، وہی آپ کے علم میں اکلوتی جنت ہو! ذرا اس اندوہناک عذاب اور محرومی کا تصور تو کیجیے!

جو شخص یہ یقین نہیں رکھتا کہ اس سے بہتر بھی کوئی جہان موجود ہے—جو یہ مانتا ہے کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیا ہے اور اس سے بڑھ کر کچھ نہیں مل سکتا—وہ اس فانی زندگی کے ناقص ہونے پر انتہائی بے صبر اور چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ وہ ذرا سی بات پر طیش میں آ جاتا ہے اور فوراً ہمت ہار بیٹھتا ہے کیونکہ اس کے زعم میں اس دنیا کو اس کی جنت ہونا چاہیے تھا۔ اسے یہ احساس ہی نہیں کہ اس سے کہیں زیادہ عظیم اور برتر چیز موجود ہے۔ چنانچہ وہ صرف اسی دنیا کی طلب میں گرفتار رہتا ہے، اسی کے لیے دن رات مرتا اور تگ و دو کرتا ہے۔ اس کی ہر کوشش، ہر صلاحیت، ہر موقع اور ہر وہ نعمت و تحفہ جو اس کے خالق نے اسے عطا کیا تھا، وہ صرف اس دنیا کی طلب میں جھونک دیتا ہے—حالانکہ اس دنیا سے بھی اسے صرف وہی کچھ ملنا ہے جو اس کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔

ان کی روح اس مادی وجود کے ساتھ اس لیے چمٹ جاتی ہے کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ یہی جسم اس کی واحد جنت ہے جو اس کے پاس ہے، یا کبھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتی۔ وہ ہر قیمت پر اس فانی پنجرے سے چمٹے رہنا چاہتی ہے۔ موت کے وقت روح کو اس کی اس نام نہاد 'جنت' سے جدا کرنا کائنات کی بدترین ممکنہ اذیت بن جاتا ہے۔ پروردگارِ عالم نے کافروں کی موت کا نقشہ جسم سے روح کے نوچے جانے کے طور پر کھینچا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَالنَّازِعَاتِ غَرْقًا "قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو (کافروں کی روحوں کو) سختی سے کھینچ نکالتے ہیں!" [سورۃ النازعات: 1]

وہ اس لیے نوچ کر نکالی جاتی ہے کیونکہ وہ روح اس دنیا کو چھوڑ کر جانا ہی نہیں چاہتی۔ وہ تو سمجھے بیٹھی تھی کہ وہ پہلے ہی اپنی جنت میں آباد ہے۔ اسے ادراک ہی نہ تھا کہ اس سے کہیں زیادہ عظیم الشان جہان موجود ہے؛ ہاں، کہیں زیادہ عظیم!

مگر ایک مومن روح کا معاملہ اس سے بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔ مومن اس دنیا میں قید خانے میں ہے—نہ کہ جنت میں۔ کیوں؟ قیدی کون ہوتا ہے؟ قیدی وہ ہوتا ہے جو کسی بندھن میں جکڑا ہوا ہو۔ قیدی وہ ہوتا ہے جسے اس کے اپنے گھر سے دور رکھا گیا ہو، جو کسی جگہ پھنسا ہوا ہو جبکہ اس کی دلی تمنا کسی بہتر مقام پر پہنچنے کی ہو۔ یہ مادی جسم مومن کے لیے قید خانہ اس لیے نہیں ہے کہ مومن کی روح کے لیے یہ زندگی کوئی اندوہناک عذاب ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ روح اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع مقام پر پہنچنے کے لیے بے تاب ہے۔ وہ اپنے اصل اور ابدی "گھر" جانے کے لیے تڑپ رہی ہے! ایک مومن کے لیے یہ دنیاوی زندگی جتنی بھی خوشگوار اور خوبصورت کیوں نہ ہو جائے، اس کامل اور بے عیب حیات کے مقابلے میں ایک قید خانہ ہی ہے جو بارگاہِ الٰہی میں اس کی منتظر ہے۔ اس مومن روح کا تعلق صرف اپنے رب کے ساتھ اور اس کے پاس موجود حقیقی جنت سے ہے۔ وہ وہاں پہنچنا چاہتی ہے۔ لیکن یہ فانی دنیا اس روح کو ایک مقررہ مدت تک لوٹنے سے روکے رکھتی ہے؛ یہی وہ رکاوٹ ہے، یہی وہ زندان ہے۔ اگرچہ ایک مومن کا دل اس فانی زندگی کی واحد سچی جنت کا مسکن ہوتا ہے، لیکن اس کی روح اس مادی جہان کے پار جھانکتی رہتی ہے۔ روح اپنے اصل گھر کی متلاشی رہتی ہے، لیکن اسے ایک معین وقت تک اس جسم کے آہنی پنجرے میں رہنا ہوتا ہے۔ اپنے اصل گھر کو رہائی پانے سے قبل اسے اپنی 'قید کی مدت' پوری کرنی ہوتی ہے۔ مومن روح کا دل اس قید کرنے والے

مادی جسم کے ساتھ نہیں الجھتا۔ جب قید کی مدت پوری ہو جاتی ہے اور قیدی کو بتا دیا جاتا ہے کہ اب وہ اپنے گھر جا سکتا ہے، تو وہ کبھی قید خانے کی سلاخوں کو پکڑ کر نہیں روتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ مومن کی موت کا نقشہ بالکل الگ انداز میں بیان فرماتا ہے۔ ربِ کریم فرماتا ہے: وَالنَّاشِطَاتِ نَشْطًا "اور قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو (مومنوں کی روحوں کو) نرمی اور آسانی سے نکال لیتے ہیں!" [سورۃ النازعات: 2]

مومن کی روح جسم کے بندھنوں سے یوں نرمی اور آسانی سے پھسل کر نکل جاتی ہے جیسے مشکیزے سے پانی کا قطرہ ڈھلک جائے۔ اس کی 'قید کی میعاد' ختم ہو چکی ہوتی ہے اور اب وہ اپنے اصل گھر کی طرف پرواز کر رہی ہوتی ہے۔ وہ اس منکرِ حق کی طرح سلاخوں سے چمٹ کر نہیں رہتی جس نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ جو کچھ ہے بس یہی فانی زندگی ہے اور اس سے بہتر کچھ نہیں مل سکتا۔

اور سچ یہ ہے کہ میں اس سے زیادہ کامل، جامع اور بلیغ تمثیل کا تصور بھی نہیں کر سکتی جو ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے۔ بے شک یہ دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت۔ ہم سب کو ایک ہی پکارنے والا اپنے پاس واپس بلائے گا۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا ہم اپنی زندگی اس طرح گزاریں گے کہ جب وہ بلاوا آئے تو ہم قید خانے کی سلاخوں کو مضبوطی سے پکڑ کر چمٹ جائیں؟ یا ہم اپنی زندگی اس طرز پر بسر کریں گے کہ وہ بلاوا ہمارے لیے قید سے رہائی کا مژدہ بن جائے؟ یعنی اپنے اصل اور حقیقی گھر کی طرف لوٹ جانے کی صدا!

topqna.com

SECTION 4 • حصہ چہارم

خالق کے ساتھ تعلق

RELATIONSHIP WITH THE CREATOR



topqno.com

نماز: زندگی کا فراموش شدہ مقصد

Salah: Life's Forgotten Purpose

انسان نے زمانے کے آغاز سے لے کر اب تک ان گنت سفر کیے ہیں۔ لیکن تاریخِ انسانی میں ایک سفر ایسا ہے جو کسی نے کبھی طے نہیں کیا۔ کسی نے بھی نہیں—سوائے ایک ہستی کے۔

ایک ایسی سواری پر جس پر کبھی کوئی انسان سوار نہ ہوا تھا، ایک ایسے راستے سے جسے کبھی کسی آنکھ نے نہ دیکھا تھا۔ ایک ایسے مقام کی طرف جہاں مخلوق میں سے کبھی کسی کے قدم نہ پہنچے تھے۔ یہ ایک بندۂ خاکی کا اپنے خالقِ برتر سے وصال اور شرفِ ملاقات کا سفر تھا۔ یہ اللہ کے رسول، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا بلند ترین آسمانوں کی جانب سفر تھا۔ یہ الاسراء والمعراج کا عظیم الشان اور بے مثال سفر تھا۔

اس سفر میں اللہ تعالیٰ اپنے حبیبِ پاک ﷺ کو ساتویں آسمان سے بھی پرے سدرۃ المنتہیٰ تک لے گیا—ایک ایسا مقام جہاں مقرب ترین فرشتے، حضرت جبرائیل علیہ السلام کے پر بھی جلتے تھے اور وہ آگے قدم نہیں بڑھا سکتے تھے۔ حضورِ اکرم ﷺ کی زمینی رسالت کے دوران ہر حکم، ہر ہدایت اور ہر فرض حضرت جبرائیل علیہ السلام کی وساطت سے نازل کیا گیا۔ لیکن ایک حکم ایسا تھا جو اس طرح نہیں بھیجا گیا۔ ایک فرمان اس قدر عظیم الشان اور اس درجے اہم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جبرائیل کے ہاتھ نیچے زمین پر بھیجنے کے بجائے اپنے حبیب ﷺ کو خود اپنے روبرو عرشِ بریں پر بلا کر عطا فرمایا۔

وہ فرمانِ عالیشان "نماز" کا تھا۔ جب نبی کریم ﷺ کو پہلی بار نماز کا حکم دیا گیا، تو وہ دن رات میں پچاس وقت کی نمازیں تھیں۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے بارگاہِ الٰہی میں تخفیف اور آسانی کی التجا کی، تو بالآخر یہ حکم روزانہ پانچ نمازوں پر مقرر ہوا، مگر لطف و کرم یہ کہ ان پانچ نمازوں پر بھی پچاس نمازوں ہی کا اجر و ثواب برقرار رکھا گیا۔

اس واقعے پر غور و فکر کرتے ہوئے علمائے کرام نے یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ پچاس سے پانچ تک کا یہ سفر ایک طے شدہ اور حکمت پر مبنی عمل تھا، جس کا مقصد ہمیں یہ سکھانا تھا کہ ہماری زندگیوں میں نماز کا اصل مقام کیا ہونا چاہیے۔ ایک لمحے کے لیے تصور کیجیے کہ اگر واقعی ہمیں دن میں پچاس بار نماز ادا کرنی پڑتی، تو کیا ہم نماز کے سوا کچھ اور کرنے کی سکت رکھتے؟ ہرگز نہیں۔ اور اصل مدعا یہی ہے! ہماری زندگی کے حقیقی مقصد کو واضح کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا طریقہ ہو سکتا تھا؟ گویا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ نماز ہی ہماری اصل زندگی ہے؛ باقی تمام دنیاوی مشاغل جن سے ہم اپنا دن بھرتے ہیں... وہ محض وقتی حرکات و سکنات اور ضمنی معاملات ہیں۔

اور اس کے باوجود، ہم یوں جیتے ہیں جیسے معاملہ اس کے بالکل برعکس ہو۔ نماز گویا وہ چیز بن کر رہ گئی ہے جسے ہم اپنے دن کے معمولات میں کہیں زبردستی ٹھونس دیتے ہیں، وہ بھی تب جب کبھی وقت مل جائے— اگر مل بھی سکے۔ ہماری "زندگیاں" نماز کے گرد نہیں گھومتیں، بلکہ نماز کو ہم نے اپنی نام نہاد مصروف "زندگیوں" کے گرد طواف کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اگر ہم کلاس روم میں ہیں تو نماز ایک ثانوی خیال بن جاتی ہے۔ اگر ہم شاپنگ مال میں ہیں تو سیل کی چھوٹ زیادہ ضروری لگتی ہے۔ جب ہم محض باسکٹ بال کا ایک میچ دیکھنے کے لیے اپنے وجود کے اصل مقصد کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں، تو سمجھ لیجیے کہ ہمارے باطن میں کچھ بہت ہی سنگین خرابی پیدا ہو چکی ہے۔

اور یہ حال تو ان کا ہے جو سرے سے نماز پڑھتے بھی ہیں۔ لیکن کچھ لوگ وہ بھی ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنی زندگی کے مقصد کو پسِ پشت ڈالا، بلکہ اسے یکسر ترک ہی کر دیا۔ نماز چھوڑنے کے بارے میں اکثر ہم اس بھیانک حقیقت کو فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ: کسی بھی مستند عالمِ دین نے کبھی یہ فتویٰ نہیں دیا کہ زنا کا ارتکاب انسان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ کسی عالم نے یہ نہیں کہا کہ چوری کرنا، شراب پینا یا منشیات کا استعمال انسان کو کافر بنا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی عالم نے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا کہ قتلِ ناحق کا مرتکب ہونے والا غیر مسلم ہو جاتا ہے۔ لیکن نماز کے بارے میں، بعض جلیل القدر ائمہ اور علماء کا یہ دو ٹوک مؤقف رہا ہے کہ جو شخص نماز کو ترک کر دے، وہ مسلمان نہیں رہتا۔

یہ بات حضور نبی اکرم ﷺ کی ایسی احادیث کی روشنی میں کہی گئی ہے، جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: "اَلْعَهْدُ الَّذِي بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ" "ہمارے اور ان (کافروں اور منافقوں) کے درمیان عہد اور حدِ فاصل صرف نماز ہے، پس جس نے نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا۔" [مسند احمد]

ذرا تصور کیجیے کہ یہ کتنا سنگین اور ہولناک گناہ ہوگا کہ نبیِ رحمت ﷺ نے اس کے بارے میں اس قدر سخت الفاظ میں تنبیہ فرمائی! ایک لمحے کے لیے سوچیے کہ شیطان نے آخر کیا غلطی کی تھی؟ اس نے اللہ پر ایمان لانے سے انکار نہیں کیا تھا، بلکہ اس نے صرف ایک سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا۔ محض ایک سجدہ! اور ذرا ان لاتعداد سجدوں کا سوچیے جن سے ہم ہر روز انکار کرتے ہیں!

ذرا اس انکار کی ہولناکی پر غور کیجیے۔ اور پھر دیکھیے کہ ہم نماز کے معاملے کو کتنا معمولی اور بے وقعت سمجھ بیٹھے ہیں۔ روزِ قیامت سب سے پہلا سوال جس کے بارے میں ہم سے حساب لیا جائے گا، وہ نماز ہی ہوگی؛ لیکن افسوس کہ آج یہ ہمارے ذہنوں کی آخری ترجیح بن چکی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "إِنَّ أَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عَمَلِهِ صَلَاتُهُ، فَإِنْ صَلُحَتْ فَقَدْ أَفْلَحَ وَأَنْجَحَ، وَإِنْ فَسَدَتْ فَقَدْ خَابَ وَخَسِرَ" "قیامت کے دن بندے کے اعمال میں سب سے پہلے نماز ہی کا حساب لیا جائے گا۔ اگر اس کی نماز درست نکلی تو وہ فلاح پا گیا اور کامیاب و کامران ہوا، لیکن اگر اس کی نماز ہی خراب و ناقص نکلی تو وہ نامراد رہا اور خسارے میں پڑ گیا۔" [سنن ترمذی]

اس روز اہلِ جنت دوزخیوں سے پوچھیں گے کہ وہ کس جرم کی پاداش میں جہنم میں جھونکے گئے؟ اور قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ ان کا سب سے پہلا جواب کیا ہوگا: ﴿مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ﴾ "تمہیں کس چیز نے دوزخ میں جھونکا؟ وہ کہیں گے: ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے۔" (القرآن، 74:42-43)

ہم میں سے کتنے ایسے ہوں گے جو اس دن یہ کہنے والوں میں شامل ہوں گے کہ: "ہم نماز پڑھنے والوں میں نہ تھے، یا ہم وقت پر نماز نہ پڑھتے تھے، یا ہم نے اپنی زندگیوں میں نماز کو کبھی کوئی ترجیح اور اہمیت نہ دی تھی؟" ذرا سوچیے، ایسا کیوں ہے کہ جب ہم کلاس روم میں ہوں، کام کی جگہ پر ہوں، یا فجر کے وقت گہری نیند میں سو رہے ہوں اور ہمیں بیت الخلاء (واش روم) جانے کی حاجت ہو، تو کیا ہم اس کے لیے وقت نہیں نکالتے؟

درحقیقت یہ سوال ہی مضحکہ خیز لگتا ہے۔ ہم اسے نہ جانے کا آپشن سرے سے مانتے ہی نہیں۔ چاہے ہم اپنی زندگی کا سب سے اہم امتحان ہی کیوں نہ دے رہے ہوں، اگر ہمیں حاجت ہوگی تو ہم اٹھ کر ضرور جائیں گے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہاں نہ جانے کے نتیجے میں جو ممکنہ شرمندگی اور رسوائی اٹھانی پڑ سکتی ہے، وہ ہمارے لیے نہ جانے کے خیال کو قطعی ناقابلِ قبول بنا دیتی ہے۔

کتنے ہی لوگ ہیں جو یہ بہانہ تراشتے ہیں کہ کام کے دوران، اسکول میں یا باہر گھومتے ہوئے ان کے پاس نماز پڑھنے کا وقت نہیں ہوتا۔ لیکن کیا ان میں سے کسی نے کبھی یہ کہا کہ ان کے پاس بیت الخلاء جانے کا وقت نہیں تھا، اس لیے انہوں نے اسکول یا دفتر میں ڈائپرز باندھنا شروع کر دیے؟ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جن کا فجر کے وقت حاجت کے باوجود بستر سے اٹھنے کا دل نہ چاہے اور وہ اپنے ہی بستر کو گندا کرنے کا فیصلہ کر لیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم حاجت رفع کرنے کے لیے تو بستر سے اٹھ جاتے ہیں، کلاس چھوڑ دیتے ہیں، یا کام روک دیتے ہیں، لیکن نماز کے لیے ایسا نہیں کرتے۔

سننے میں یہ مثال کتنی عجیب اور مضحکہ خیز لگتی ہے، مگر تلخ حقیقت یہی ہے کہ ہم نے اپنے جسم کی ضروریات کو اپنی روح کی ضروریات پر فوقیت دے رکھی ہے۔ ہم اپنے جسموں کو روز کھانا کھلاتے ہیں کیونکہ اگر نہ کھلائیں تو مر جائیں گے۔ لیکن ہم میں سے بے شمار لوگ اپنی روح کو مسلسل بھوکا رکھ کر مار رہے ہیں، اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر ہم نماز نہیں پڑھ رہے تو ہماری روح پہلے ہی دم توڑ چکی ہے۔ اور ستم ظریفی دیکھیے کہ جس فانی جسم کی ہم اتنی ناز برداری کرتے ہیں وہ تو محض عارضی ہے، جبکہ وہ روح جسے ہم نے نظر انداز کر رکھا ہے، وہ ابدی اور لازوال ہے!

نماز اور بدترین چوری

Salah and the Worst Kind of Theft

صراطِ مستقیم پا لینے کا واحد دردناک پہلو یہ ہے کہ انسان اسے دوبارہ کھو دے۔ گمراہی اور پستی کے کئی راستے ہیں، مگر انسان کے لیے اپنے دین سے گر جانے سے بڑھ کر کوئی اور المیہ نہیں ہو سکتا۔ کبھی یہ کسی ایسی بہن کی داستان ہوتی ہے جو حجاب اتار پھینکنے اور ایک بالکل مختلف قسم کی طرزِ زندگی اپنانے کا فیصلہ کر لیتی ہے؛ تو کبھی یہ کسی ایسے بھائی کی کہانی ہوتی ہے جو کبھی دینی محافل اور کمیونٹی کا روحِ رواں تھا مگر بعد میں بری صحبت کی دلدل میں پھنس گیا۔ مگر ہر داستان میں، کسی نہ کسی موڑ پر، ہمارے یہ بھائی اور بہنیں پستی کی انتہائی گہرائیوں میں جا گرتے ہیں۔

افسوس کہ ایسی کہانیاں اب نایاب نہیں رہیں۔ بسا اوقات ہم ان کو دیکھ کر ورطۂ حیرت میں پڑ جاتے ہیں اور سوچتے ہیں: یہ کیسے ہوا؟ آخر کیوں؟ ہم سوچتے ہیں کہ جو شخص کبھی نیکی کی راہ پر اتنا ثابت قدم تھا، وہ صراطِ مستقیم سے اس قدر دور کیسے بھٹک گیا؟

یہ سوچتے ہوئے ہم اکثر یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا جواب شاید ہماری توقع سے کہیں زیادہ سادہ ہے۔ لوگ گناہوں کی ہر قسم کی دلدل میں گرتے ہیں، لیکن ان میں سے اکثر لوگوں میں ایک گناہ قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہوتا ہے۔ گناہ آلود زندگی گزارنے والے اکثر افراد کے پیچھے ایک ہی بنیادی سبب کارفرما ہوتا ہے۔ چاہے وہ شخص کبھی سیدھی راہ پر تھا اور پھر پھسل گیا، یا وہ سرے سے کبھی اس راہ پر چلا ہی نہیں تھا، ایک بات تقریباً طے شدہ ہے: اس کے گناہوں کی پستی میں گرنے سے پہلے، اس نے لازماً اپنی نماز کو ترک کیا ہوگا، اسے معمولی سمجھا ہوگا، اسے پسِ پشت ڈالا ہوگا، یا اسے یکسر نظر انداز کیا ہوگا۔ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے لیکن پھر بھی مسلسل گناہوں میں غرق ہے، تو غالب امکان یہی ہے کہ اس کی نماز صرف اعضاء کی ایک ظاہری حرکت ہے—جس میں نہ دل شامل ہے نہ روح۔

دیکھیے، نماز کی ایک بنیادی اور جوہری خصوصیت ایسی ہے جسے اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اپنے خالق کے ساتھ ایک مقدس و بابرکت ملاقات ہونے کے علاوہ، نماز ایک انتہائی حقیقی اور مضبوط ترین ڈھال اور تحفظ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمانِ عالیشان ہے: ﴿ اتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ ۖ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ ﴾ "(اے حبیب!) آپ کی طرف جو کتاب وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کیجیے اور نماز قائم کیجیے۔ بیشک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے، اور اللہ کا ذکر یقیناً سب سے بڑا ہے، اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔" (القرآن، 29:45)

جب کوئی شخص نماز کو چھوڑنے کا فیصلہ کرتا ہے، تو وہ درحقیقت اسی الٰہی تحفظ اور ڈھال کو بھی اپنے ہاتھ سے پھینک دیتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنا انتہائی اہم ہے کہ نماز کا چھوٹنا اکثر یک لخت نہیں ہوتا، بلکہ یہ تدریجی مراحل میں ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا نمازوں کو ان کے مقررہ اوقات سے مؤخر کرنے سے ہوتی ہے، پھر ایک نماز کو دوسری نماز کے ساتھ ملا کر پڑھا جانے لگتا ہے۔ جلد ہی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ نماز سرے سے قضا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اور اس سے پہلے کہ آپ کو اندازہ ہو، نماز نہ پڑھنا ہی ایک معمول اور روزمرہ کی عادت بن جاتا ہے۔

اس دوران پردۂ غیب میں ایک اور معرکہ چل رہا ہوتا ہے جو آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ ہر مؤخر ہونے والی یا چھوٹ جانے والی نماز کے ساتھ ایک پوشیدہ جنگ لڑی جا رہی ہوتی ہے: شیطان کی جنگ۔ نماز کو ترک کر کے، انسان درحقیقت اس زرہ بکتر کو اتار کر پھینک دیتا ہے جو اللہ نے اسے عطا کی تھی، اور وہ بغیر کسی ڈھال اور حفاظت کے میدانِ جنگ میں کود پڑتا ہے۔ اب شیطان کو اس پر کھلا اور مکمل تسلط حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَمَن يَعْشُ عَن ذِكْرِ الرَّحْمَٰنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ ﴾ "اور جو شخص رحمن کے ذکر سے اندھا بن جائے (منہ موڑ لے)، ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو اس کا مستقل ساتھی بن جاتا ہے۔" (القرآن، 43:36)

چنانچہ کسی کے لیے یہ امر ہرگز حیرت انگیز نہیں ہونا چاہیے کہ نماز سے غفلت برتنا دراصل پستی اور زوال کی زندگی کی طرف پہلا قدم بن جاتا ہے۔ جو لوگ راہِ راست سے بھٹک چکے ہیں، انہیں محض مڑ کر اس نقطۂ آغاز کو دیکھنا چاہیے جہاں سے ان کا انحراف شروع ہوا تھا؛ وہ دیکھیں گے کہ اس کی شروعات نماز ہی سے ہوئی

تھی۔ اور یہی بات اس کے بالکل برعکس رخ پر بھی حرف بہ حرف سچ ہے۔ جو لوگ اپنی زندگیوں کو بدلنا اور سنوارنا چاہتے ہیں، ان کا سفر بھی نماز پر توجہ مرکوز کرنے اور اسے سنوارنے ہی سے شروع ہوتا ہے۔ جب آپ نماز کو دوبارہ اپنی اولین ترجیح بنا لیتے ہیں—پڑھائی، نوکری، تفریح، میل جول، خریداری، ٹی وی اور کھیل کے مقابلوں سے بھی پہلے—صرف تب ہی آپ اپنی زندگی کو درست سمت میں موڑ سکتے ہیں۔

اس سچائی کا المیہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ نماز شروع کرنے سے پہلے انہیں پہلے اپنی زندگی کو سدھارنا ہوگا۔ یہ سوچ دراصل شیطان کا ایک خطرناک حربہ ہے، کیونکہ وہ بخوبی جانتا ہے کہ وہ نماز ہی ہے جو انسان کو وہ روحانی ایندھن اور رہنمائی فراہم کرے گی جس کی مدد سے وہ اپنی زندگی میں انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ ایسا شخص اس ڈرائیور کی مانند ہے جس کی گاڑی کا پیٹرول ٹینک بالکل خالی ہو چکا ہو، مگر وہ پیٹرول بھروانے سے پہلے یہ ضد کرے کہ وہ پہلے اپنا سفر پورا کرے گا۔ ایسا ڈرائیور کہیں نہیں پہنچ پائے گا۔ بالکل اسی طرح، ایسے لوگ برسوں تک اسی ایک جگہ پھنسے رہتے ہیں: نہ نماز پڑھتے ہیں اور نہ ان کی زندگی بدلتی ہے۔ شیطان نے انہیں چیلنج کیا، اور وہ ان سے جیت گیا۔

ایسا کر کے، ہم نے شیطان کو اس بات کی کھلی چھوٹ دے دی کہ وہ ہم سے ہماری سب سے قیمتی متاع چرا لے۔ ہمارے گھر اور ہماری گاڑیاں ہمیں اتنی عزیز ہوتی ہیں کہ ہم کبھی انہیں لاوارث یا غیر محفوظ چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہم ان کی حفاظت کے لیے سیکیورٹی سسٹمز پر سینکڑوں ڈالر خرچ کر ڈالتے ہیں۔ لیکن ہمارا دین بغیر کسی پہرے کے کھلا پڑا رہتا ہے، تاکہ چوروں میں سب سے بدترین چور اسے چرا کر لے جائے—ایک ایسا چور جس نے خود ربِ کائنات کے سامنے یہ قسم کھائی تھی کہ وہ قیامت تک ہمارا کٹر اور بے رحم دشمن رہے گا۔ وہ کوئی ایسا معمولی چور نہیں جو مرسڈیز کے مونوگرام والی کوئی تراشی ہوئی دھات چرا رہا ہو، بلکہ وہ تو ایک ایسا لٹیرا ہے جو ہماری ابدی روح اور جنت کا لازوال ٹکٹ لوٹ رہا ہے!

ایک مقدس سرگوشی / مناجات

A Sacred Conversation

رات کا ایک ایسا وقت ہوتا ہے جب پوری کائنات کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ دن کے اجالے میں افراتفری اکثر ہماری زندگیوں پر قابض ہو جاتی ہے۔ ملازمت، تعلیم اور گھریلو ذمہ داریاں ہمارے ذہن اور توجہ کے بڑے حصے کو اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہیں۔ دن کی پانچ وقتہ نمازوں کے لیے نکالے جانے والے چند لمحوں کے علاوہ، غور و فکر کرنے یا سکون کی سانس لینے کے لیے الگ سے وقت نکالنا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔ ہم میں سے بے شمار لوگ اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں کہ شاید ہمیں یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ ہم اپنے ہاتھوں سے کیا کچھ کھو رہے ہیں۔

تاہم رات کا ایک ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جب کام ختم ہو جاتا ہے، ٹریفک تھم جاتی ہے اور خاموشی ہی واحد آواز بن کر فضا میں گونجتی ہے۔ اس گھڑی—جب ہمارے اردگرد کی پوری دنیا خوابِ خرگوش میں محو ہوتی ہے—ایک ذات ایسی ہے جو بیدار رہتی ہے اور اس بات کی منتظر ہوتی ہے کہ ہم اس کے دربار میں پکاریں اور التجا کریں۔ ہمیں حدیثِ قدسی میں بتایا گیا ہے: ”يَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَتَعَالَى كُلَّ لَيْلَةٍ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا حِينَ يَبْقَى ثُلُثُ اللَّيْلِ الآخِرُ يَقُولُ: مَنْ يَدْعُونِي فَأَسْتَجِيبَ لَهُ، مَنْ يَسْأَلُنِي فَأُعْطِيَهُ، مَنْ يَسْتَغْفِرُنِي فَأَغْفِرَ لَهُ“ ”ہمارا رب تبارک و تعالیٰ ہر رات کے آخری تہائی حصے میں آسمانِ دنیا پر نزولِ اجلال فرماتا ہے اور پکارتا ہے: ’کون ہے جو مجھ سے دعا کرے تاکہ میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مانگے تاکہ میں اسے عطا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے بخشش طلب کرے تاکہ میں اسے معاف کر دوں؟‘“ [صحیح بخاری و صحیح مسلم]

انسان صرف تصور ہی کر سکتا ہے کہ کیا سماں ہوگا اگر کوئی بادشاہ خود ہمارے دروازے پر دستک دے اور یہ پیشکش کرے کہ جو کچھ ہم مانگیں گے وہ ہمیں عطا کرے گا! ہر عقل مند انسان یہی سوچے گا کہ کم از کم ایسی شاہی ملاقات کے لیے وہ اپنے الارم کا وقت ضرور مقرر کرے گا۔ اگر ہم سے یہ کہہ دیا جائے کہ روزانہ فجر سے

ٹھیک ایک گھنٹہ پہلے ہمارے دروازے پر ایک کروڑ ڈالر ($10,000,000) کا چیک رکھ دیا جائے گا، تو کیا ہم اسے وصول کرنے کے لیے نیند سے بیدار نہ ہوں گے؟

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہمیں مطلع فرمایا ہے کہ رات کے اس پہر، طلوعِ فجر سے عین قبل، وہ اپنے بندوں کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ ذرا اس حقیقت پر غور کیجیے! کائنات کا خالق و مالک ہمیں اپنے ساتھ ایک مقدس اور پُراسرار سرگوشی اور مناجات کی دعوت دے رہا ہے۔ وہ رب اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ ہم آئیں اور اس سے کلام کریں، مگر ہم میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جو اسے انتظار میں چھوڑ کر اپنے نرم بستروں میں خوابِ غفلت کے مزے لیتے رہتے ہیں! اللہ عزوجل ہماری طرف متوجہ ہو کر پوچھتا ہے کہ ہمیں اس سے کیا چاہیے، تمام جہانوں کے خالق نے ہمیں یہ یقین دہانی کرائی ہے کہ ہم جو کچھ طلب کریں گے وہ ہمیں عطا فرمائے گا۔

اور اس سب کے باوجود... ہم سوئے رہتے ہیں!

وہ دن ضرور آئے گا جب فریب کا یہ پردہ تار تار کر دیا جائے گا۔ قرآنِ حکیم فرماتا ہے: ﴿ لَّقَدْ كُنتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ﴾ "(اس سے کہا جائے گا:) تو اس دن کی طرف سے سخت غفلت میں تھا، پس ہم نے تیرے آگے سے تیرا پردہ ہٹا دیا، چنانچہ آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے۔" (القرآن، 50:22)

اس دن ہم پر حقیقتِ کبریٰ آشکار ہوگی۔ اس دن ہمیں معلوم ہوگا کہ رات کے سناٹے میں ادا کی جانے والی دو رکعتیں زمین و آسمان کی تمام تر دولت اور نعمتوں سے کہیں زیادہ وزنی اور قیمتی تھیں۔ تب ہمیں اس بے بہا چیک کی اصل قدر معلوم ہوگی جو ہر رات ہمارے بستر کے پاس چھوڑ دیا جاتا تھا اور ہم غافل سوئے رہتے تھے۔ ایک ایسا دن آنے والا ہے جب انسان آسمان کے نیچے موجود اپنی ہر متاع قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا تاکہ اسے صرف ایک بار لوٹ کر وہ دو رکعتیں ادا کرنے کی مہلت مل جائے۔

ایک ایسا دن آئے گا جب ہم دنیا میں اپنی ہر محبوب ترین چیز، ہر وہ مشغلہ جس نے ہمارے دل و دماغ کو جکڑ رکھا تھا، اور ہر وہ سراب جس کے پیچھے ہم دوڑتے رہے تھے، سب کچھ لٹا دینے پر راضی ہو جائیں گے صرف اس لیے کہ کاش اللہ سے وہ راز و نیاز اور سرگوشی نصیب ہو جاتی۔ لیکن اس دن کچھ بدنصیب ایسے

بھی ہوں گے جن کی طرف سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنا رخ پھیر لے گا... اور انہیں اسی طرح فراموش کر دے گا جیسے وہ کبھی دنیا میں اسے بھولے ہوئے تھے۔

قرآنِ مجید کا ارشاد ہے: ﴿ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنتُ بَصِيرًا ۝ قَالَ كَذَٰلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا ۖ وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنسَىٰ ﴾ "وہ کہے گا: اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا بنا کر کیوں اٹھایا حالانکہ میں تو آنکھوں والا تھا؟ اللہ فرمائے گا: اسی طرح تیرے پاس ہماری نشانیاں اور احکام آئے تھے تو تو نے انہیں بھلا دیا تھا، اور اسی طرح آج تجھے بھی بھلا دیا جائے گا۔" (القرآن، 20:125-126)۔ اور سورۃ المؤمنون میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ لَا تَجْأَرُوا الْيَوْمَ ۖ إِنَّكُم مِّنَّا لَا تُنصَرُونَ ﴾ "آج کے دن فریاد و زاری مت کرو! بیشک تم ہماری طرف سے کوئی مدد نہیں پاؤ گے۔" (القرآن، 23:65)

کیا آپ ایک لمحے کے لیے تصور کر سکتے ہیں کہ یہ آیات کیا فرما رہی ہیں؟ یہ کسی پرانے دوست یا کلاس فیلو کی طرف سے بھلا دیے جانے کی بات نہیں ہے۔ یہ رب العالمین کی جانب سے فراموش کر دیے جانے کا تذکرہ ہے! جہنم کی آگ، ابلتا ہوا کھولتا پانی، یا جھلس جانے والی کھالیں نہیں—بلکہ رب کی نظرِ التفات سے محروم ہو جانا اس کائنات کا سب سے ہولناک ترین عذاب ہے۔

اور جس طرح اس سے بڑی کوئی سزا نہیں ہو سکتی، اسی طرح اس سے بڑی کوئی نعمت اور انعام بھی نہیں ہو سکتا جس کا نقشہ رسول اللہ ﷺ نے اس فرمان میں کھینچا ہے: "إِذَا دَخَلَ أَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ، قَالَ: يَقُولُ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: تُرِيدُونَ شَيْئًا أَزِيدُكُمْ؟ فَيَقُولُونَ: أَلَمْ تُبَيِّضْ وُجُوهَنَا؟ أَلَمْ تُدْخِلْنَا الْجَنَّةَ، وَتُنَجِّنَا مِنَ النَّارِ؟ قَالَ: فَيَكْشِفُ الْحِجَابَ، فَمَا أُعْطُوا شَيْئًا أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنَ النَّظَرِ إِلَى رَبِّهِمْ عَزَّ وَجَلَّ" "جب اہلِ جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے، تو اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائے گا: کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں کچھ اور مزید عطا کروں؟ وہ عرض کریں گے: کیا تو نے ہمارے چہرے روشن نہیں فرما دیے؟ کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا اور جہنم کی آگ سے نجات نہیں بخشی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر اللہ پردہ اٹھا دے گا، پس اہلِ جنت کو عطا کی گئی تمام نعمتوں میں سے کوئی چیز بھی اپنے ربِ جلیل و کریم کے دیدار سے زیادہ محبوب نہ ہوگی۔" [صحیح مسلم]

تاہم، رات کی اس خلوت میں اللہ تبارک و تعالیٰ سے ملاقات کا فیض دیکھنے کے لیے کسی کو قیامت کے دن کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا میں اس مناجات سے دل کو جو بے پایاں سکون

اور قرار نصیب ہوتا ہے، اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ انسان اس کیفیت کا ادراک صرف خود اس کا تجربہ کر کے ہی کر سکتا ہے۔ زندگی پر اس کا جو اثر ہوتا ہے وہ ناپ تول سے بالا تر ہے۔ جب آپ قیام اللیل (رات کی نماز) کے لطف سے آشنا ہو جاتے ہیں، تو آپ کی باقی تمام زندگی بدل کر رہ جاتی ہے۔ اچانک، وہ بوجھ جو کبھی آپ کی کمر توڑ رہے تھے، تنکوں کی طرح ہلکے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ وہ مسائل جو کبھی لاینحل دکھائی دیتے تھے، سلجھنے لگتے ہیں۔ اور اپنے خالق کی وہ قربت، جو کبھی ناپید اور ناقابلِ رسائی لگتی تھی، آپ کے جینے کا واحد سہارا بن جاتی ہے۔

topqna.com

تاریک ترین گھڑی اور طلوعِ سحر

The Darkest Hour and the Coming of the Dawn

ایک مشہور و معروف ضرب المثل کے مطابق: رات کی سب سے تاریک ترین گھڑی وہ ہوتی ہے جو طلوعِ سحر سے ذرا پہلے واقع ہوتی ہے۔ اور اگرچہ فلکیاتی اعتبار سے تاریک ترین لمحہ رات کے اوائل میں گزر جاتا ہے، لیکن اس کہاوت کی استعاراتی اور روحانی سچائی کسی طور بھی کم حقیقی نہیں۔

ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ ہماری زندگیوں کے تاریک ترین ادوار کے فوراً بعد انتہائی پرمسرت اور قیمتی لمحات کا ظہور ہوتا ہے۔ عموماً یہ وہی لمحہ ہوتا ہے جب سب کچھ ٹوٹ پھوٹ کا شکار دکھائی دیتا ہے، تب اچانک ایک غیر متوقع سہارا ہمیں سنبھال لیتا ہے اور پار لگا دیتا ہے۔ کیا حضرت ایوب علیہ السلام سے ایک ایک کر کے ان کی تمام نعمتیں نہیں چھن گئی تھیں، اس سے پہلے کہ وہ سب کچھ اور اس سے بھی کہیں بڑھ کر انہیں واپس لوٹا دیا گیا؟

جی ہاں! حضرت ایوب علیہ السلام کے لیے وہ رات ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ اور ہم میں سے بہت سوں کے لیے ایسا لگتا ہے کہ ان کی تاریک رات کبھی ختم ہی نہیں ہوگی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کسی رات کو ہمیشہ کے لیے تاریک نہیں رہنے دیتا۔ وہ اپنی بے پایاں رحمت سے ہمیں سورج کی تابانی عطا فرماتا ہے۔

اس کے باوجود کبھی ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری آزمائشیں کبھی تھمنے والی نہیں۔ اور شاید ہم میں سے کچھ لوگ اپنے دین میں اس قدر روحانی پستی کا شکار ہو چکے ہوں کہ انہیں اپنے خالق سے اپنا رشتہ کٹا ہوا محسوس ہوتا ہو۔ اور شاید کچھ لوگوں کے گرد اس قدر گہری تاریکی چھا چکی ہو کہ انہیں اندھیرے کا احساس تک نہ رہا ہو۔

لیکن جس طرح رات کے خاتمے پر سورج اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ طلوع ہوتا ہے، بالکل اسی طرح ہماری سحر بھی طلوع ہو چکی ہے۔ اپنی لامحدود رحمت سے اللہ تعالیٰ نے اس رات کی سیاہی کو مٹانے

کے لیے رمضان کا نور بھیج دیا ہے۔ اس نے قرآن کا مہینہ اس لیے نازل فرمایا تاکہ وہ ہمیں پستی سے اٹھا کر بلندیاں بخشے اور ہماری تنہائی و بیگانگی کو اپنے قرب میں بدل دے۔ اس نے یہ بابرکت مہینہ ہمیں اس لیے عطا کیا تاکہ وہ ہمارے دلوں کے خالی پن کو بھر دے، ہماری تنہائی کا علاج کر دے، اور ہماری روحوں کی مفلسی کا خاتمہ کر دے۔ اس نے ہمارے لیے صبحِ نو کا اجالا بھیجا تاکہ ہم ظلمتوں سے نکل کر نور پا سکیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ﴾ ”وہی ہے جو تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی (تمہارے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں) تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جائے، اور وہ مومنوں پر نہایت مہربان ہے۔“ (القرآن، 33:43)

اور یہ رحمت ہر اس شخص کے لیے عام ہے جو اس کا طلب گار ہو۔ یہاں تک کہ بدترین اور سنگ دل ترین گناہ گار کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی لامحدود رحمت سے کبھی مایوس نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ قرآنِ حکیم میں فرماتا ہے: ﴿ قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴾ ”آپ فرما دیجیے: اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے! تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بیشک اللہ تمام گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے، یقیناً وہی بڑا بخشنے والا، نہایت رحم فرمانے والا ہے۔“ (القرآن، 39:53)

اللہ ہی رحمت کا حقیقی مالک ہے، اور پورے سال میں کوئی ایسا لمحہ نہیں جب اس کی رحمت کی موسلا دھار بارش ہم پر اس طرح برستی ہو جیسے وہ رمضان کے مبارک مہینے میں برستی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے رمضان المبارک کے بارے میں ارشاد فرمایا: ”أَوَّلُهُ رَحْمَةٌ، وَأَوْسَطُهُ مَغْفِرَةٌ، وَآخِرُهُ عِتْقٌ مِنَ النَّارِ“ ”اس کا ابتدائی حصہ رحمت ہے، اس کا درمیانی حصہ مغفرت ہے، اور اس کا آخری حصہ دوزخ کی آگ سے آزادی ہے۔“ [صحیح ابن خزیمہ]

رمضان کا ہر لمحہ اللہ کی بارگاہ میں پلٹ آنے کا ایک سنہری موقع ہے۔ اس وقت ہم اپنی زندگیوں میں جس کسی کرب یا صورتحال سے گزر رہے ہیں، وہ اکثر ہمارے اپنے ہی اعمال کا براہِ راست نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر ہم رسوائی کا شکار ہیں یا پستی محسوس کر رہے ہیں، تو یہ ہمارے اپنے گناہ ہیں جنہوں نے ہمیں گرایا ہے۔ ہم صرف اللہ ہی کے ذریعے دوبارہ بلندی پانے کی امید رکھ سکتے ہیں۔ اگر ہم مستقل طور پر فجر کے لیے بیدار

ہونے سے قاصر ہیں، یا اگر ہمیں حرام چیزوں سے باز رہنا دن بہ دن مشکل تر محسوس ہو رہا ہے، تو ہمیں اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کا گہرائی سے جائزہ لینا چاہیے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں کبھی دھوکے میں نہیں رہنا چاہیے۔ ہمیں اپنے دلوں میں کبھی یہ گمان نہیں لانا چاہیے کہ اس کائنات کی کوئی بھی چیز اللہ کی مشیت کے بغیر کامیاب یا ناکام ہو سکتی ہے، دی یا چھینی جا سکتی ہے، بن یا بگڑ سکتی ہے۔ اپنے خالق کے ساتھ ہمارے تعلق ہی کی بدولت ہم زندگی میں عروج پاتے ہیں یا زوال کا شکار ہوتے ہیں—خواہ اس دنیا کے ساتھ ہمارا تعلق ہو یا تمام نوعِ انسانی کے ساتھ۔

لیکن انسانوں کے برعکس، ہمارا خالق دل میں کینے یا بغض نہیں رکھتا۔ ذرا تصور کیجیے کہ آپ کو زندگی کا ایک بالکل نیا اور اجلا صفحہ عطا کر دیا جائے! تصور کیجیے کہ آپ نے ماضی میں جو کچھ بھی کیا اور جس پر آپ نادم ہیں، وہ سب کا سب مکمل طور پر مٹا دیا جائے! رمضان المبارک وہی بے نظیر موقع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بشارت دی: "مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ" "جس نے ایمان اور طلبِ ثواب کی نیت کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے، اس کے پچھلے تمام گناہ بخش دیے جائیں گے۔" [صحیح بخاری]

پس اس بے مثل اور بے نظیر موقع کی موجودگی میں، ہم اس سے بہترین فائدہ کیسے اٹھا سکتے ہیں؟ اس ضمن میں دو ایسے اہم نکات ہیں جنہیں اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، انہیں ذہن نشین رکھنا ضروری ہے:

اول: یہ جانیے کہ آپ روزہ کیوں رکھ رہے ہیں: بہت سے لوگ روزے کو محض ایک روایتی رسم کے طور پر رکھتے ہیں، بغیر اس کے حقیقی مفہوم کو سمجھے۔ دوسرے لوگ اسے غریبوں کے ساتھ ہمدردی اور احساس کی ایک سادہ سی مشق تک محدود کر دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ روزے کا ایک نہایت خوبصورت اور پاکیزہ پہلو ہے، مگر یہ وہ اصل مقصد نہیں ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں فرماتا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ "اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو (پرہیزگار بن جاؤ)۔" (القرآن، 2:183) اپنی جسمانی ضروریات اور خواہشات پر قابو پا کر اور انہیں روک کر، ہم اس سے بھی بڑے معرکے کے لیے قوت حاصل کرتے ہیں: یعنی اپنے نفس (اور روح کی بے لگام خواہشات) پر قابو

پانے کا معرکہ۔ روزے کی حالت میں بھوک کی ہر کسک اور پیاس کی ہر تڑپ ہمیں خدا کی یاد دلاتی ہے—وہ ذات جس کی رضا کے لیے ہم نے یہ قربانی دی ہے۔ اللہ کو مسلسل یاد رکھنے اور اس کی خاطر اپنی جائز خواہشات تک قربان کرنے سے ہم اس کی ہمہ وقت موجودگی کا شعور پاتے ہیں، اور اس طرح ہمارے اندر تقویٰ (خدا کا خوف، خشیت اور شعور) پروان چڑھتا ہے۔ وہی احساس جو ہمیں اس بات سے روکتا ہے کہ جب کوئی نہ دیکھ رہا ہو تب بھی ہم چھپ کر نوالہ نہ کھائیں، وہی احساس ہمیں اس بات کی تربیت دیتا ہے کہ جب کوئی نہ دیکھ رہا ہو تب بھی ہم دوسرے گناہوں سے بچیں۔ اسی کا نام تقویٰ ہے۔

دوم: روزے کو محض بھوک اور پیاس تک محدود نہ کیجیے: رسول اللہ ﷺ کا فرمانِ گرامی ہے: "مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ لِلَّهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ" "جو شخص جھوٹ بولنا اور برے اعمال کرنا نہ چھوڑے، تو اللہ کو اس کی کوئی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔" [صحیح بخاری]۔ حضور اکرم ﷺ نے ہمیں اس بات سے بھی خبردار فرمایا: "رُبَّ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ إِلَّا الْجُوعُ، وَرُبَّ قَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ قِيَامِهِ إِلَّا السَّهَرُ" "کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں جنہیں اپنے روزے سے سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اور کتنے ہی رات کو قیام کرنے والے ایسے ہیں جنہیں اپنے قیام سے سوائے جاگنے کے کچھ نہیں ملتا۔" [سنن دارمی / سنن ابن ماجہ]

روزے کی حالت میں پوری تصویر کو سمجھیے۔ یاد رکھیے کہ روزہ صرف کھانے پینے سے پرہیز کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک بہتر، پاکیزہ اور متقی انسان بننے کی مسلسل جدوجہد ہے۔

اور اس جدوجہد کے ذریعے، ہمیں خدا سے بیگانگی اور تنہائی کی اندھیری دلدل سے نکلنے کا موقع ملتا ہے۔ لیکن جس طرح دن کے اختتام پر سورج غروب ہو جاتا ہے، اسی طرح رمضان بھی آئے گا اور رخصت ہو جائے گا، اور پیچھے صرف وہی نقوش چھوڑ جائے گا جو وہ ہمارے دل کے آسمان پر ثبت کر گیا ہوگا۔

آج ہم نے ایک انسان کو دفن کیا: موت پر ایک بصیرت

We Buried a Man Today: A Reflection on Death

یہ تحریر میں نے کار میں اس وقت لکھی جب میں ایک نیک اور متقی روح کی تدفین کے بعد گھر واپس لوٹ رہی تھی۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس مرحوم پر اور اس کے اہلِ خانہ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

آج ہم نے ایک انسان کو منوں مٹی تلے دفن کیا۔ اور اب میں یہاں زندہ انسانوں کے کارواں میں شامل ہو کر گھر کی طرف رواں دواں ہوں۔ فی الوقت!

فی الوقت، آپ اور میں زندہ انسانوں کے قافلے میں شریک ہیں۔ لیکن اس لیے نہیں کہ ہماری منزل کوئی الگ سرزمین ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ رخصت ہو رہے ہیں اور ہم یہیں رہنے والے ہیں۔ بلکہ صرف اس لیے کہ ہمارا قافلہ کچھ پیچھے رہ گیا ہے۔ اس لمحے ہم گاڑی چلا کر واپس اپنے گھروں، اپنے آرام دہ بستروں، اپنے ٹی وی، اپنے میوزک سسٹمز، اپنی ملازمتوں، اپنے امتحانات، اپنے دوستوں، اپنے فیس بک اور چیٹ کی دنیا کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ اس وقت ہم واپس اپنی غفلتوں، اپنے باطل بتوں اور اپنے فریب خوردہ سرابوں کی طرف جا رہے ہیں۔ لیکن اصل نکتہ یہی ہے! میں واپس اپنے گھر، بستر، ٹی وی اور اسٹیریو کی طرف نہیں جا رہی۔ میں اپنی نوکری، امتحانات، دوستوں، فیس بک اور جی چیٹ کی طرف واپس نہیں پلٹ رہی۔ میں اپنی مصروفیتوں، سرابوں اور بتوں کی طرف نہیں جا رہی۔ میں تو واپس اسی مقام کی طرف رواں دواں ہوں جہاں سے میرا آغاز ہوا تھا۔ میں اب ٹھیک اسی منزل کی جانب بڑھ رہی ہوں جہاں وہ شخص آج پہنچ چکا ہے۔ میں اسی ایک مقام کے سفر پر ہوں۔ بس مجھے یہ معلوم نہیں کہ میرا یہ سفر کتنا وقت لے گا۔

میں وہیں واپس جا رہی ہوں جہاں سے میرا آغاز ہوا تھا: یعنی خدا کے حضور! کیونکہ وہی اللہ "الاول" (سب کا آغاز) ہے اور وہی اللہ "الآخر" (سب کا انجام) ہے۔

میرا جسم مجھے وہاں لے جا رہا ہے، لیکن یہ جسم محض ایک سواری ہے۔ جب میں وہاں پہنچوں گی، تو یہ جسم یہیں پیچھے رہ جائے گا؛ بالکل اسی طرح جیسے آج اس میت کا جسم پیچھے رہ گیا۔ میرا جسم مٹی سے نکلا تھا اور جیسے آیا تھا ویسے ہی مٹی میں واپس لوٹ جائے گا۔ یہ تو محض ایک خول تھا، میری روح کا ایک عارضی ظرف۔ کچھ دیر کے لیے ایک ہم سفر۔ لیکن جب میں اپنی اصل منزل پر پہنچوں گی تو اسے یہیں چھوڑ دوں گی۔ پہنچنا—نہ کہ رخصت ہونا! کیونکہ اصل گھر تو وہی ہے، یہ دنیا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ کسی پاکیزہ اور نیک روح کو واپس بلاتا ہے تو فرماتا ہے: "ارْجِعِي" یعنی لوٹ آؤ! (القرآن، 89:28)

وہ خوبصورت اور پاکیزہ روح جسے آج ہم نے سپردِ خاک کیا، وہ آج زندگی سے رخصت نہیں ہوئی؛ بلکہ وہ تو زندگی کے ایک اعلیٰ، ارفع—اور انشاء اللہ—کہیں زیادہ بہتر درجے میں داخل ہو چکی ہے۔ وہ تو بس اپنے اصل گھر پہنچی ہے۔ لیکن چونکہ جسم اس مادی کائنات کی مٹی سے بنا تھا، اس لیے اسے اپنا جسم یہیں چھوڑ کر جانا پڑا۔ جسم اس نچلی، فانی دنیا کا حصہ ہے؛ وہ دنیا جہاں ہمیں کھانے، سونے، خون بہانے اور آنسو بہانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور مرنے کی بھی۔ لیکن روح بلند ترین عالم سے تعلق رکھتی ہے۔ روح کی صرف ایک ہی ضرورت ہے: اپنے پروردگار کے قرب میں ہونا۔

اور یوں، جب جسم اس مادی دنیا کی تلخیوں سے روتا ہے، خون بہاتا ہے اور درد جھیلتا ہے، روح ان مادی چیزوں کے اثر سے بالکل بے نیاز رہتی ہے۔ روح کو گھائل کرنے، چیرنے یا زخمی کرنے والی صرف ایک ہی چیز ہو سکتی ہے۔ اور صرف ایک ہی چیز ہے جو اسے مار سکتی ہے: یعنی اس کی واحد ضرورت سے اسے محروم کر دینا—اور وہ ہے اپنے پیدا کرنے والے کا قرب، اپنے خدا کی نزدیکی۔ اس لیے ہمیں اس روح پر ہرگز نہیں رونا چاہیے جو اپنی اصل منزل تک پہنچ چکی ہے—وہ مری نہیں ہے! بلکہ ہمیں تو اس انسان پر آنسو بہانے چاہییں جس کا جسم تو زندہ ہے مگر جس کی روح اس ذات سے کٹ کر مر چکی ہے جو اسے حقیقی حیات بخشتی ہے: یعنی خدا!

چنانچہ اہلِ ایمان کی روح اپنے گھر کی طرف دوڑتی ہے، اس حالت میں بھی جب وہ اسی دنیاوی زندگی میں سانس لے رہی ہو۔

اے میرے رب! میری روح کو اپنے اندر ایک ایسا پناہ گاہ اور مضبوط قلعہ بنا دے جسے کوئی انسان اور کوئی حادثہ متزلزل نہ کر سکے۔ سکون، خاموشی اور طمانیت کا ایک ایسا گوشۂ عافیت جس پر بیرونی دنیا کے طوفان اثر انداز نہ ہو سکیں۔ وہ روح جسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے "النفس المطمئنۃ" (مطمئن اور پرسکون جان) کا نام دیا ہے (القرآن، 89:27)۔ وہ روح جسے اللہ تعالیٰ یوں پکار کر اپنی بارگاہ میں واپس بلاتا ہے: ﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ "(نیک روح سے کہا جائے گا:) اے مطمئن جان! تو اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آ، اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی ہو۔ پس تو میرے برگزیدہ بندوں میں شامل ہو جا! اور میری جنت میں داخل ہو جا!" (القرآن، 89:27-30)

topqna.com

میری دعائیں قبول کیوں نہیں ہو رہیں؟

Why Aren't My Prayers Being Answered?

سوال: میری دعائیں قبول کیوں نہیں ہو رہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ آپ کو اس قدر سچا اور کھرا سوال پوچھنے پر بہترین جزا عطا فرمائے، اور وہ ہم سب کو حق و سچائی کی راہ دکھائے۔ آمین۔

میرے خیال میں ایسی صورتحال میں جو بنیادی غلطی ہم سے سرزد ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم "وسیلے" (ذریعے) اور "مقصد" کے درمیان فرق کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر، جب ہم ایک اچھے شریکِ حیات (شوہر) کے لیے دعا مانگتے ہیں، تو کیا وہ خوشگوار شادی ایک وسیلہ ہے یا خود ایک مقصد؟ میرا ماننا ہے کہ اکثر لوگ اسے ہی اپنی منزل اور آخری مقصد سمجھ لیتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد اکثر مایوسی اور دل شکستگی جنم لیتی ہے (اور ستم ظریفی یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں: چاہے ہمیں وہ رشتہ مل جائے یا نہ ملے)۔ اس دنیا کی ہر چیز کی طرح شادی بھی محض ایک ذریعہ ہے—اللہ تک پہنچنے کا ایک وسیلہ۔ چنانچہ اگر ہم اس کے لیے دعا کرتے ہیں اور وہ ہمیں نہیں ملتی، تو ممکن ہے کہ اللہ نے ہمارے لیے کوئی دوسرا وسیلہ چن لیا ہو—شاید کسی آزمائش، اس کے ذریعے حاصل ہونے والے تزکیۂ نفس اور صبر کے راستے، تاکہ وہ ہمیں اس اصل منزل یعنی اللہ تک پہنچا سکے۔ یہ بھی ممکن ہے، اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے، کہ اگر اللہ ہمیں وہی لاجواب شوہر عطا کر دیتا جس کی ہم نے دعا کی تھی، تو شاید وہ نعمت ہمیں غافل بنا دیتی اور اس کے نتیجے میں ہم اپنے اصل مقصد کو پانے سے یکسر محروم رہ جاتے۔

اس حقیقت کو اس تناظر میں دیکھنے کے بجائے، میرا خیال ہے کہ خرابی یہ ہے کہ ہم معاملات کو بالکل الٹ کر کے دیکھ رہے ہیں۔ یہ دنیا (وہ شاندار نوکری، من پسند شریکِ حیات، اولاد، تعلیم، کیریئر وغیرہ) ہماری منزل اور حتمی مقصد بن چکی ہے، اور "اللہ" کو ہم نے اس منزل تک پہنچنے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ بنا رکھا ہے! ہم دعا مانگنے کے ذریعے اس وسیلے (اللہ) کو استعمال کرتے ہیں تاکہ اپنا وہ دنیاوی مقصد حاصل کر سکیں (جس چیز

کے لیے بھی ہم دعا کر رہے ہوں)، اور پھر جب ہمارا یہ وسیلہ (معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ) ہمارے من پسند طریقے سے کام نہیں کرتا تو ہم مایوس ہو جاتے ہیں۔ ہم ہاتھ جھٹک کر آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں اور شکوہ کرنے لگتے ہیں کہ ہماری دعائیں تو قبول ہی نہیں ہو رہیں ! ہمارا وسیلہ ہماری مرضی کے مطابق پورا نہیں اتر رہا !

لیکن اللہ کوئی وسیلہ یا ذریعہ نہیں ہے۔ وہ تو خود اصل مقصد اور منتہائے مقصود ہے ! خود دعا مانگنے کا بھی حتمی مقصد اللہ کے ساتھ ہمارے تعلق کو استوار کرنا ہے۔ دعا کے ذریعے ہم اس کے قریب تر ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا میری نظر میں اصل خرابی یہ ہے کہ ہمارا زاویۂ نگاہ ہی غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے دعائے استخارہ سے بے پناہ محبت ہے۔ یہ دعا اس قدر کامل اور بے عیب ہے کیونکہ یہ اس بات کا برملا اعتراف کرتی ہے کہ تنہا اللہ ہی سب سے بہتر جاننے والا ہے، اور پھر وہ اللہ سے التجا کرتی ہے کہ جو اس کے حق میں بہترین ہو وہ اسے عطا کرے اور جو برا ہو اسے اس سے دور کر دے۔ اس دعا کا محور وہ چیز نہیں ہوتی جو آپ مانگ رہے ہیں، بلکہ اس کا اصل مرکز وہ خیر اور بھلائی ہے جو اس دنیا اور آخرت کے لیے سب سے بہتر ہو۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اپنی من پسند مخصوص چیزوں کے لیے دعا نہیں مانگ سکتے۔ اس کے برعکس، اللہ تو اس بات کو بے حد پسند فرماتا ہے کہ بندہ اس سے مانگے۔ لیکن اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ جب ہم دعا مانگ لیں، اپنی مقدور بھر بھرپور کوشش کر لیں، اور اللہ پر کامل توکل کر لیں، تو پھر اللہ ہمارے لیے جو بھی فیصلہ فرمائے ہم اس پر دل و جان سے راضی رہیں۔ اور ہم اس حقیقت کو پہچانیں کہ اللہ ہر دعا کو قبول فرماتا ہے—مگر ضروری نہیں کہ ہمیشہ اسی شکل میں قبول کرے جس کی ہم توقع باندھے بیٹھے تھے۔ اور اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ہمارا علم انتہائی محدود ہے جبکہ اس کا علم لامحدود اور بے پایاں ہے۔ اپنے علمِ کامل کی بدولت وہ بسا اوقات ہمیں وہ چیز عطا فرماتا ہے جسے وہ ہمارے اصل اور حتمی مقصد یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے زیادہ بہتر اور سود مند جانتا ہے۔

واللہ اعلم (اور حقیقت کا علم صرف اللہ ہی کے پاس ہے)۔

فیس بک: ایک پوشیدہ خطرہ

Facebook: The Hidden Danger

ہم ایک ایسی دنیا میں جی رہے ہیں جس کا محور "میں" (iWorld) ہے۔ آئی فون (iPhone)، آئی پیڈ (iPad)، مائی اسپیس (MySpace) اور یوٹیوب (YouTube) کے جلو میں ہر طرف ایک ہی پیغام گونج رہا ہے: میری ذات، میرا وجود، اور میں! ذات کے اس جنون کو دیکھنے کے لیے انسان کو زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ چیزیں فروخت کرنے کے لیے اشتہار سازوں کو انسان کے نفس اور انا (Ego) کو لبھانا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر، بہت سے اشتہارات ہمارے اندر کے اس حصے کو اپیل کرتے ہیں جو طاقت اور خود مختاری کا دلدادہ ہے۔ ڈائریکٹ ٹی وی آپ سے کہتا ہے: "ٹی وی مت دیکھو، ٹی وی پر حکومت کرو!" یوگرٹ لینڈ کہتا ہے: "حکمرانی آپ کی ہے! لامتناہی امکانات کی دنیا میں خوش آمدید، جہاں مقدار، انتخاب اور منظر نامہ سب آپ کے تابع فرمان ہے!"

لیکن ہماری انا کو شہ دینے والے صرف اشتہار ساز ہی نہیں ہیں۔ ایک ایسا عالمی مظہر اور پلیٹ فارم بھی وجود میں آچکا ہے جو اس انا کے پنپنے کے لیے زرخیز ترین زمین فراہم کرتا ہے۔ اور اس کا نام ہے: فیس بک۔ اب میں خود سب سے پہلے اس بات کا اعتراف کروں گی کہ فیس بک خیر اور بھلائی کے لیے ایک انتہائی طاقتور ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ بھی دوسری بے شمار چیزوں کی طرح ویسا ہی ہے جیسا آپ اسے بنانا چاہیں۔ ایک چھری سے کھانا کاٹ کر کسی بھوکے کا پیٹ بھی بھرا جا سکتا ہے، اور اسی چھری سے کسی کا خون بھی کیا جا سکتا ہے۔ فیس بک کو عظیم الشان مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے—بہر حال یہ فیس بک ہی تھا جس نے ایک آمر کی حکومت کا تختہ الٹنے میں مدد فراہم کی تھی۔ فیس بک کو لوگوں کو منظم کرنے، حق کی دعوت دینے، یاد دہانی کرانے اور جوڑنے کے لیے ایک طاقتور آلے کے طور پر برتا جا سکتا ہے۔ فیس بک خدا کے ساتھ اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمارے رشتے کو مضبوط کرنے کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے... یا پھر فیس بک ہمارے نفسِ امارہ اور انا کے شکنجے کو مزید مضبوط کرنے کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔

فیس بک کا یہ فتنہ اور مظہر بڑا ہی دلچسپ ہے۔ ہم میں سے ہر ہر انسان کے اندر ایک انا اور نفس چھپا ہوا ہے۔ یہ ہمارے وجود کا وہ حصہ ہے جسے دبانا اور قابو میں رکھنا ناگزیر ہے (اگر ہمیں بربادی کی تاریک گھاٹی میں گرنے سے بچنا ہے)۔ انا کو خوراک فراہم کرنے کا خطرہ یہ ہے کہ جوں جوں اسے غذا ملتی ہے، وہ توانا ہوتی جاتی ہے۔ اور جب وہ طاقتور ہو جاتی ہے تو وہ ہم پر حکمرانی کرنے لگتی ہے۔ جلد ہی ہم خدا کے بندے نہیں رہتے؛ بلکہ اپنے ہی نفس کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں۔

انا ہمارے اندر کا وہ حصہ ہے جو اقتدار اور اختیار سے محبت کرتا ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جو خود کو نمایاں دیکھنا، پہچانا جانا، داد سمیٹنا اور پوجا جانا چاہتا ہے۔ فیس بک اس مقصد کے لیے ایک انتہائی زبردست پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا اسٹیج سجا کر دیتا ہے جہاں میرا ہر لفظ، میری ہر تصویر، یا میرے ذہن میں آنے والا ہر خیال دوسروں کی نظروں میں آسکتا ہے، اس کی تعریف کی جا سکتی ہے اور اسے "لائک" (Like) کیا جا سکتا ہے۔ نتیجتاً، میں اس داد و تحسین کا متلاشی بننے لگتا ہوں۔ لیکن پھر یہ بات صرف انٹرنیٹ کی ورچوئل دنیا تک محدود نہیں رہتی۔ میں اس نمائش اور تشہیر کو پیشِ نظر رکھ کر اپنی حقیقی زندگی جینا شروع کر دیتا ہوں۔ اچانک، میں اپنے ہر لمحے، ہر تصویر، اور ہر خیال کو یوں جینے لگتا ہوں گویا مجھے کوئی دیکھ رہا ہے، کیونکہ میرے لاشعور میں یہ سوچ چل رہی ہوتی ہے کہ "میں اسے فیس بک پر پوسٹ کروں گا"۔ یہ کیفیت انسان کے اندر ایک عجیب و غریب نفسیاتی کیفیت پیدا کر دیتی ہے، گویا وہ ہر لمحہ ایک کھلی نمائش گاہ میں زندگی گزار رہا ہو۔ مجھے ہر دم یہ دھیان رہنے لگتا ہے کہ مجھ پر نظر رکھی جا رہی ہے، کیونکہ ہر بات فیس بک پر رکھی جا سکتی ہے تاکہ دوسرے اسے دیکھیں اور اس پر تبصرہ کریں۔

اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ یہ انسان کے اندر اپنی جھوٹی اہمیت کا ایک فریب خوردہ احساس پیدا کر دیتا ہے، جہاں میرا اٹھایا جانے والا ہر بے معنی اور معمولی قدم بھی بین الاقوامی اہمیت کا حامل معلوم ہونے لگتا ہے۔ جلد ہی میں خود اپنی زندگی کا مرکز و محور اور نمائش کی شے بن جاتا ہوں۔ اندر سے یہ صدا آنے لگتی ہے: "میں کتنا اہم ہوں! میری زندگی کتنی خاص ہے! میری ہر ادا کتنی قابلِ دید ہے!" اس کا نتیجہ ایک ایسی دنیا کی صورت میں نکلتا ہے جس کا محور صرف اور صرف "میری ذات" بن جاتی ہے اور میں خود کو اس کائنات کے مرکز میں براجمان سمجھنے لگتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ نتیجہ کائنات کے اصل مقصد اور سچائی کے بالکل متضاد ہے۔ اس زندگی کا اصل مقصد یہ جاننا ہے کہ اللہ کی کبریائی اور عظمت ہی اصل حقیقت ہے، اور اس کے روبرو میری اپنی کوئی حیثیت نہیں اور میں اس کے در کا ایک محتاجِ محض ہوں۔ زندگی کا مقصد خود کو مرکز سے ہٹا کر وہاں اللہ کو براجمان کرنا تھا۔ لیکن فیس بک اس کے بالکل برعکس فریب کو ہوا دیتا ہے۔ یہ میرے اس باطل گمان کو تقویت دیتا ہے کہ میری نام نہاد اہمیت کی وجہ سے میرا ہر غیر اہم قدم یا خیال سرِعام نمائش کے لیے پیش کیا جانا چاہیے۔ اچانک یہ خبر بن جاتی ہے کہ میں نے ناشتے میں کیا کھایا یا گروسری اسٹور سے کیا خریدا، گویا یہ بات اتنی اہم ہے کہ اسے دنیا بھر میں شائع کیا جائے۔ جب میں کوئی تصویر لگاتا ہوں تو لوگوں کی تعریفوں کا منتظر رہتا ہوں؛ میں اعتراف اور داد کا پیاسا بن جاتا ہوں۔ لائکس اور کمنٹس کی گنتی کے ساتھ، ظاہری حسن ایک ایسی چیز بن جاتا ہے جس کی اب پیمائش کی جا سکتی ہے۔ جب میں کوئی تحریر پوسٹ کرتا ہوں تو اس بات کا انتظار کرتا ہوں کہ اسے کتنے لوگ پسند کریں گے۔ اور مجھے مسلسل اس بات کا ہوش رہتا ہے—بلکہ میں اس میں مقابلہ بازی کرنے لگتا ہوں—کہ میرے کتنے "دوست" (Friends) ہیں۔ (یہاں لفظِ دوست کو واوین میں اس لیے لکھا گیا ہے کیونکہ کوئی بھی شخص فیس بک پر موجود اپنے اسی فیصد "دوستوں" کو ذاتی طور پر جانتا تک نہیں)۔

زیادہ سے زیادہ جمع کرنے کی یہ ہوس، مقابلہ بازی اور فخر کا تذکرہ قرآنِ مجید میں بصراحت فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ ﴾ "تمہیں کثرت کی ہوس اور باہمی مقابلے بازی نے غفلت میں ڈالے رکھا۔" (القرآن، 102:1) چاہے یہ مسابقت مال و دولت کے انبار لگانے میں ہو، یا فیس بک پر فالوورز، فرینڈز اور لائکس بٹورنے کی دوڑ ہو، انجام دونوں کا ایک ہی ہے: یعنی ہم اس کے پیچھے پڑ کر اپنے اصل مقصد سے غافل ہو چکے ہیں۔

فیس بک ایک اور خطرناک زاویۂ نگاہ کو بھی مضبوط کرتا ہے: یعنی دوسرے انسانوں پر نظریں جمائے رکھنا، وہ کیا کر رہے ہیں، انہیں کیا پسند ہے، اور وہ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ فیس بک انسان کے اندر اس وسوسے کو ہوا دیتا ہے کہ دوسرے اس کا کیا تخمینہ لگا رہے ہیں۔ جلد ہی، میں "مخلوق کے مدار" میں داخل ہو جاتا ہوں۔ اس مدار کے اندر، میری تعریفیں، میرا درد، میری خوشی، میری خود توقیری، میری کامیابی اور میری ناکامی کا فیصلہ اب وہ مخلوق کرنے لگتی ہے۔ جب میں اس دائرے میں جینے لگتا ہوں، تو میں مخلوق کے

ساتھ ہی اٹھتا اور گرتا ہوں۔ جب لوگ مجھ سے خوش ہوتے ہیں تو میرا حوصلہ بلند ہو جاتا ہے؛ اور جب وہ ناراض ہوتے ہیں تو میں زمین بوس ہو جاتا ہوں۔ میرا وقار لوگوں کے ردِ عمل کا پابند ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں ایک قیدی کی طرح بن جاتا ہوں کیونکہ میں نے اپنی خوشی، غم، تسکین اور مایوسی کی تمام چابیاں خود اٹھا کر لوگوں کے ہاتھوں میں تھما دی ہیں۔

جب میں اللہ کے مدار کے بجائے مخلوق کے مدار میں داخل ہو کر جینے لگتا ہوں، تو میں اسی مدار کی کرنسی (سکۂ رائج الوقت) استعمال کرنا شروع کر دیتا ہوں۔ دیکھیے، اللہ کے مدار کی کرنسی کیا ہے؟ اس کی رضا یا اس کی ناراضگی، اس کا انعام یا اس کا عذاب! لیکن مخلوق کے مدار کی کرنسی کیا ہے؟ لوگوں کی تعریف یا ان کی تنقید! چنانچہ جوں جوں میں اس مدار میں گہرائی تک اترتا جاتا ہوں، میں اس کی کرنسی کی زیادہ سے زیادہ حرص کرنے لگتا ہوں، اور اس کے کھو جانے کے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ مثال کے طور پر، مونوپولی (Monopoly) کے کھیل میں، میں اس کے نقلی نوٹ زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور ایک لمحے کے لیے "امیر" بن کر بہت اچھا بھی محسوس ہوتا ہے۔ لیکن جب کھیل ختم ہو جاتا ہے، تو کیا میں مونوپولی کے اس کاغذی پیسے سے حقیقی دنیا میں کوئی ایک چیز بھی خرید سکتا ہوں؟

انسانوں کی طرف سے ملنے والی تعریف اور داد و تحسین درحقیقت مونوپولی کے اسی کھیل کا جھوٹا پیسہ ہے۔ سمیٹتے وقت ایک لمحے کے لیے تو بہت بھلا لگتا ہے، لیکن جب زندگی کا کھیل ختم ہوتا ہے تو اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اس دنیا اور آخرت کی اصل حقیقت کے میزان پر اس کی قیمت صفر ہے۔ اور اس کے باوجود، میں اپنی عبادات تک میں اس جھوٹی کرنسی کا لالچ کرنے لگتا ہوں! اس طرح میں ایک مخفی اور پوشیدہ شرک کا شکار ہو جاتا ہوں: یعنی "ریاء کاری" (عبادت میں دکھاوا)۔ ریاء کاری دراصل مخلوق کے مدار میں جینے کا ایک ناگزیر شاخسانہ ہے۔ جتنا زیادہ میں اس مدار میں دھنستا چلا جاؤں گا، اتنا ہی زیادہ میں انسانوں کی تعریف، منظوری اور ستائش بٹورنے کے جنون میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ اور جتنا میں اس مدار میں رہوں گا، اتنا ہی مجھے نقصان کا خوف ستاتا رہے گا—عزت کھو جانے کا خوف، وقار مٹ جانے کا ڈر، داد اور منظوری چھن جانے کا وسوسہ۔

لیکن جتنا زیادہ میں لوگوں سے ڈروں گا، اتنا ہی میں ان کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑتا جاؤں گا۔ حقیقی آزادی صرف اس وقت نصیب ہوتی ہے جب میں اللہ کے سوا ہر ہستی اور ہر چیز کے خوف سے خود کو آزاد کر لوں۔

ایک انتہائی پُر حکمت اور جامع حدیثِ نبوی میں آتا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: "یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیے جسے اگر میں کروں تو اللہ بھی مجھ سے محبت کرے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "ازْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبَّكَ اللَّهُ، وَازْهَدْ فِيمَا فِي أَيْدِي النَّاسِ يُحِبَّكَ النَّاسُ" "دنیا سے بے رغبتی اختیار کر لو، اللہ تم سے محبت فرمائے گا۔ اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے بے نیاز ہو جاؤ، تو لوگ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔" [سنن ابن ماجہ]

کیسی عجیب حقیقت ہے کہ ہم لوگوں کی منظوری اور محبت کے پیچھے جتنا کم بھاگتے ہیں، ہمیں ان کی طرف سے اتنی ہی زیادہ محبت حاصل ہوتی ہے۔ ہم دوسروں سے جتنا بے نیاز ہوتے ہیں، لوگ اتنے ہی ہماری طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور ہماری صحبت کے متلاشی بنتے ہیں۔ یہ حدیثِ مبارکہ ہمیں ایک گہری سچائی سکھاتی ہے: صرف اور صرف مخلوق کے اس مصنوعی مدار کو توڑ کر باہر نکلنے ہی سے ہم خدا کی بارگاہ میں بھی سرخرو ہو سکتے ہیں اور بندوں کے درمیان بھی کامیاب ہو سکتے ہیں۔

پس جہاں فیس بک بلاشبہ ایک انتہائی طاقتور ذریعہ ہے، وہاں اسے اپنی آزادی اور خلاصی کا وسیلہ بنائیے—نہ کہ اپنے نفس کی غلامی اور لوگوں کے فیصلوں کی قید کا پھندا!

topqna.com

یہ بیداری ہے

This is Awakening

اس کیفیت اور احساس کو لفظوں میں بیان کرنا انتہائی دشوار ہے۔ ذرا تصور کیجیے کہ آپ نے اپنی پوری زندگی ایک تاریک غار کے اندر گزاری ہو اور آپ یہی سمجھتے رہے ہوں کہ یہی غار آپ کی کل کائنات ہے۔ پھر اچانک آپ اس غار سے باہر قدم رکھتے ہیں۔ اپنی زندگی میں پہلی بار آپ نیلا آسمان دیکھتے ہیں۔ آپ سرسبز درختوں، چہچہاتے پرندوں اور چمکتے سورج کا نظارہ کرتے ہیں۔ اپنی زندگی میں پہلی بار آپ کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ دنیا جسے آپ اب تک سب کچھ سمجھتے رہے تھے، وہ تو محض ایک فریب تھی۔ زندگی میں پہلی دفعہ آپ ایک برتر، سچی اور کہیں زیادہ حسین حقیقت سے روشناس ہوتے ہیں۔ اس ادراک کی سرشاری اور وجد کا ذرا تصور کیجیے! ایک لمحے کے لیے آپ کو لگتا ہے کہ آپ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اچانک غار کی اس پچھلی زندگی کی کوئی بات آپ کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ آپ زندگی میں پہلی بار خود کو بااختیار، پوری طرح بیدار، مکمل طور پر زندہ اور سراپا ہوش مند پاتے ہیں۔ یہ ایک ناقابلِ بیان کیفیت ہے۔ یہ وہ روحانی سرشاری ہے جو نئی نئی آشکار ہونے والی سچائی کے ساتھ نصیب ہوتی ہے۔

یہ بیداری ہے۔

اسلام قبول کرنے والا ہر نو مسلم اس کیفیت سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ ایک پیدائشی مسلمان جو بھٹکنے کے بعد دوبارہ دین کی طرف پلٹتا ہے، وہ بھی اس کیفیت کو جانتا ہے۔ نوعِ انسانی کا ہر وہ فرد جو خدا سے دور زندگی گزارنے کے بعد اس کی چوکھٹ پر لوٹتا ہے، وہ اس احساس کی مٹھاس سے آشنا ہوتا ہے۔ اس روحانی کیفیت کو امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "مدارج السالکین" (اللہ کے راستے کے مسافروں کی منزلیں) میں "یقظہ" (بیداری) کا نام دیا ہے۔ وہ اس کیفیت کو اللہ کی طرف جانے والی راہ کی سب سے پہلی منزل قرار دیتے ہیں۔ یہ وہ کیفیت ہے جسے بسا اوقات "نو مسلم کا جوش و ولولہ" (Convert Zeal) بھی کہا جاتا ہے۔ جب کوئی انسان نیا نیا اسلام قبول کرتا ہے یا اللہ کی طرف رجوع کرنا شروع کرتا ہے، تو وہ اکثر ایسے

غیر معمولی جذبے، ولولے اور توانائی سے لبریز ہوتا ہے جو دوسروں میں نہیں پائی جاتی۔ اس سرگرمی اور قوت کا راز وہ روحانی وجد اور سرشاری ہے جو اس کیفیت کا خاصہ ہے۔

بیداری کی منزل کی خصوصیات: پہلی خصوصیت: اللہ تعالیٰ عبادت کو آسان بنا دیتا ہے—جب انسان اس کیفیت میں ہوتا ہے تو اس کے لیے عبادت کرنا بے حد سہل اور آسان ہو جاتا ہے۔ انسان اس قدر پرجوش اور پُرعزم ہوتا ہے کہ وہ اس نئی دریافت شدہ سچائی کی خاطر ہر چیز با آسانی قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہ جذبہ اور ولولہ انسان کو پلک جھپکتے میں صفر سے ساٹھ (0 to 60) کی رفتار پر پہنچا دیتا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے انسان کو کوئی روحانی مقوی غذا یا ایندھن مل گیا ہو۔ آپ کے اندر جو یہ طاقت پیدا ہوتی ہے یہ آپ کے اپنے وجود کی نہیں ہوتی، بلکہ یہ ایک غیبی نصرت اور امداد ہوتی ہے جو آپ کو عطا کی گئی ہوتی ہے۔ اور اس معاملے میں یہ مدد براہِ راست خدا کی طرف سے دی جاتی ہے۔ بعض لوگ یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ بہت زیادہ اور بہت جلدی اپنے اندر تبدیلیاں نہ لائیے۔ لیکن میرا ماننا ہے کہ تیزی سے تبدیلی لانا بذاتِ خود کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ تکبر ہے۔ اصل خرابی ناامیدی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ آپ کو ایک ایسا تحفہ اور توفیق عطا فرماتا ہے جس کی بدولت آپ زیادہ عبادت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں، تو اس نعمت کو ضرور کام میں لائیے۔ لیکن اس توفیق پر اپنے نفس کے بجائے اللہ کا شکر ادا کیجیے۔ اور یہ بات ذہن نشین رکھیے کہ یہ غیر معمولی کیفیت عارضی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے طفیل آپ بہت ہی مختصر وقت میں صفر سے ساٹھ پر پہنچ گئے ہوں، لیکن جب یہ وجد اور سرشاری کی لہر اترنے لگے، تو ہمت مت ہاریے اور خود کو پھسل کر دوبارہ صفر پر مت آنے دیجیے۔

دوسری خصوصیت: یہ کیفیت عارضی ہے—اس دنیا کی ہر کیفیت اور حال کی طرح، یہ روحانی کیفیت بھی عارضی ہوتی ہے۔ زندگی کبھی بھی ایک سیدھی لکیر کی مانند نہیں چلتی۔ اور نہ ہی خدا کی طرف جانے والا راستہ ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ اس سچائی کو نہ سمجھنا اس کیفیت کے گزر جانے کے بعد مایوسی اور دل شکستگی کا باعث بن سکتا ہے۔

اس روحانی کیفیت کے خطرات اور گھاٹیاں: اس کیفیت سے جڑے ہوئے دو بڑے خطرات اور فریب دراصل اوپر بیان کی گئی خصوصیات کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہیں۔ یہی دونوں گھاٹیاں درحقیقت راہِ خدا میں جمود،

سستی اور رکاوٹ کے دو سب سے بڑے اسباب بھی ہیں: یعنی تکبر/ خود پسندی اور ناامیدی۔ تکبر میں مبتلا شخص پہلے ہی یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ وہ بہت اچھا اور کافی ہو چکا ہے، لہٰذا وہ مزید جدوجہد کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ جبکہ ناامید شخص یہ یقین کر لیتا ہے کہ وہ کبھی بھی سدھرنے یا اچھا بننے کے قابل نہیں ہو سکتا، لہٰذا وہ بھی کوشش ترک کر دیتا ہے۔ دو بالکل متضاد اور الٹ بیماریاں، لیکن انجام دونوں کا ایک ہی نکلتا ہے: یعنی اللہ کی راہ میں آگے بڑھنے سے رک جانا!

تکبر: پہلا خطرہ اور فریب اس حقیقت کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے کہ عبادت کی یہ بڑھی ہوئی طاقت اور توفیق خدا کی طرف سے آئی تھی اور یہ اس روحانی کیفیت کی خاصیت تھی—نہ کہ خود اس فرد کا ذاتی کمال! جو شخص اس راز کو نہیں سمجھتا وہ عبادت کی اس بلند تر صلاحیت کو غلط طور پر اپنی ذاتی پارسائی اور تقویٰ سے منسوب کر بیٹھتا ہے۔ یہ غلط انتساب انتہائی خطرناک ہے کیونکہ یہ انسان کو غرور، تکبر اور خود پسندی کی دلدل میں دھکیل دیتا ہے۔ بجائے اس کے کہ بندہ یہ سمجھے کہ یہ بلند روحانی کیفیت اللہ کا ایک عطیہ اور فضل ہے، نمازی اپنے اندر ایک پوشیدہ تکبر محسوس کرنے لگتا ہے اور ان لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے جن کے اندر ایسا جوش و خروش دکھائی نہیں دیتا۔

مایوسی اور ناامیدی: دوسرا خطرہ اس حقیقت سے غافل ہونے سے جنم لیتا ہے کہ دنیا کی تمام حالتوں کی طرح یہ روحانی سرشاری بھی عارضی ہے۔ اس سرور کے ختم ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ ناکام ہو گئے ہیں یا آپ سے کوئی بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے! اکثر لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ رمضان المبارک کی روحانی سرشاری گزر جانے کے بعد کیسا محسوس ہوتا ہے۔ اس سرور اور کیفیت میں اتار چڑھاؤ آنا زندگی کا ایک فطری قانون ہے۔ اور یہ ایک ایسا سبق ہے جسے خود جلیل القدر صحابی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک کو سیکھنا پڑا تھا۔ ایک دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: "نَافَقَ حَنْظَلَةُ يَا رَسُولَ اللَّهِ! فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَمَا ذَاكَ؟ قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، نَكُونُ عِنْدَكَ تُذَكِّرُنَا بِالنَّارِ وَالْجَنَّةِ، حَتَّى كَأَنَّا رَأْيَ عَيْنٍ، فَإِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِكَ عَافَسْنَا الْأَزْوَاجَ وَالْأَوْلَادَ وَالضَّيْعَاتِ فَنَسِينَا كَثِيرًا! فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ إِنْ لَوْ تَدُومُونَ عَلَى مَا تَكُونُونَ عِنْدِي وَفِي الذِّكْرِ لَصَافَحَتْكُمُ الْمَلَائِكَةُ عَلَى فُرُشِكُمْ وَفِي طُرُقِكُمْ، وَلَكِنْ يَا حَنْظَلَةُ سَاعَةً وَسَاعَةً، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ"

"'حنظلہ تو منافق ہو گیا، یا رسول اللہ!' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: 'وہ کیسے؟' عرض کیا: 'یا رسول اللہ! جب ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو آپ ہمیں جنت اور دوزخ کی یاد دلاتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں، لیکن جب ہم آپ کی مجلس سے رخصت ہو کر نکلتے ہیں اور اپنی بیویوں، بچوں اور کاروبار میں مشغول ہوتے ہیں تو ان میں سے اکثر باتیں بھول جاتے ہیں!' اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: 'اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! اگر تم اسی کیفیت پر ہمیشگی اختیار کر لو جو میرے پاس ہوتی ہے اور ذکر میں قائم رہو، تو فرشتے تمہارے بستروں پر اور تمہارے راستوں میں تم سے مصافحہ کرنے لگیں؛ لیکن اے حنظلہ! ایک گھڑی یہ اور ایک گھڑی وہ (یعنی زندگی میں کیفیات بدلتی رہتی ہیں)۔' آپ ﷺ نے یہ جملہ تین مرتبہ دہرایا۔" [صحیح مسلم]

روحانی سرشاری کی لہر اتر جانے کے بعد: اس سفر کا سب سے اہم اصول یہ ہے کہ کبھی ہمت نہ ہاری جائے! یہ جان لیجیے کہ اب اگر آپ کے اندر ویسا جوش و خروش باقی نہیں رہا تو اس کا سبب یہ نہیں کہ آپ کسی معاملے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ بلندی کے بعد آنے والی یہ گراوٹ اور مد و جزر اس راہ کا ایک فطری حصہ ہے! بالکل اسی طرح جیسے حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر اور حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہما کے سامنے واضح فرمایا کہ یہ کیفیات کا اتار چڑھاؤ اس راہ کا لازمی جزو ہے۔ اور اگر ہم ہمیشہ اسی روحانی بلندی اور وجد میں رہتے تو ہم انسان نہ رہتے، بلکہ فرشتے بن چکے ہوتے! کامیابی کا اصل فیصلہ کن معیار یہ نہیں ہوتا کہ جب ہمارا جذبہ عروج پر ہو تب ہم کیا کرتے ہیں۔ بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ جب ہم زوال یا سستی کی کیفیت میں ہوں—جب ہمارا دل اس طرح نہ مائل ہو رہا ہو—تب ہم کیا کرتے ہیں؟ اس راستے پر کامیاب ہونے کی اصل کنجی یہ ہے کہ جب آپ اپنے معمول کے نچلے درجے (Low) پر پہنچیں، تب بھی اپنا سفر جاری رکھیں، یہ جانتے ہوئے کہ ایسا ہونا بالکل فطری اور معمول کی بات ہے۔

شیطان کے حربے اور پھندے: ہمیشہ یاد رکھیے کہ شیطان آپ کی موجودہ کیفیت کے مطابق الگ الگ حربوں سے آپ پر حملہ آور ہوگا۔ جب آپ بلندی اور سرشاری پر ہوں گے—جب آپ کا روحانی جذبہ عروج پر ہوگا، تو وہ آپ کو تکبر اور غرور میں مبتلا کر کے گھیرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ آپ کو دوسروں کو حقیر سمجھنے پر اکسائے گا۔ وہ بالآخر آپ کے اندر یہ خود پسندی بھر دے گا کہ آپ اپنے آپ سے اتنے خوش ہو جائیں کہ آپ

سوچیں کہ اب آپ کو مزید جدوجہد کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہی کیونکہ آپ پہلے ہی بہت پارسا اور عظیم بن چکے ہیں (اور اپنے اردگرد کے لوگوں سے کہیں بہتر ہیں)۔ وہ مستقل طور پر آپ کی نظریں ان لوگوں پر جمائے رکھے گا جو بظاہر آپ سے کم عمل کرتے ہیں، تاکہ آپ اپنی کوتاہیوں کا جواز تراش سکیں۔ مثال کے طور پر، اگر آپ حجاب نہیں لیتیں، تو وہ آپ کے دل میں یہ وسوسہ ڈالے گا کہ: "دیکھو، کتنی ہی حجاب والی لڑکیاں فلاں فلاں برے کام کرتی ہیں! کم از کم میں وہ سب تو نہیں کرتی! میں کتنے ہی ایسے اچھے کام کرتی ہوں جو وہ نہیں کرتیں!" یا اگر آپ کی نمازوں میں سستی آنے لگے، تو آپ سوچنے لگیں کہ: "کم از کم میں فلاں شخص کی طرح نائٹ کلبوں میں تو نہیں جاتا یا شراب تو نہیں پیتا۔" یاد رکھیے، اللہ تعالیٰ امتحان کے نتائج میں کسی کا موازنہ کر کے رعایتی نمبر (Grading on a curve) نہیں دیتا۔ دوسرے کیا کر رہے ہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قیامت کے دن ہم میں سے ہر ایک کو تنِ تنہا اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے۔ اور یہ سب محض شیطان کے وہ ہتھکنڈے ہیں جو وہ ہمیں راہِ خدا میں جدوجہد روکنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

جب آپ سستی اور گراوٹ کی کیفیت میں ہوں—لیکن جب آپ پر سستی اور اداسی کا دور آتا ہے، تو شیطان ایک بالکل مختلف راستے سے آپ پر وار کرتا ہے؛ وہ آپ کو مایوس اور ناامید کر کے گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ آپ کو یہ باور کرانے کی کوشش کرے گا کہ آپ بالکل بے وقعت اور بے کار ہو چکے ہیں اور اب کوشش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ آپ کے دل میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کرے گا کہ آپ ایک ناکام انسان ہیں اور آپ چاہے کچھ بھی کر لیں، آپ کبھی بھی اس مقام پر واپس نہیں پہنچ سکیں گے جہاں آپ کبھی ہوا کرتے تھے! یا وہ آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرے گا کہ آپ اتنے "برے" بن چکے ہیں کہ اللہ آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ نتیجتاً، آپ اپنے آپ کو گناہوں کی دلدل میں مزید نیچے گرنے دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ پہلے بہت بلند مقام پر رہے ہوں، اور پھر جب آپ کی عبادات میں سستی آنے لگی تو آپ اپنے آپ سے بیزار ہو گئے۔ اور شاید اپنی پچھلی خود پسندی اور پارسائی کے زعم میں آپ نے دوسروں کو غلطی کرنے یا کمزور پڑنے کی گنجائش کبھی نہ دی تھی۔ اب یہ رویہ آپ کے اپنے لیے ہلاکت خیز بن جاتا ہے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ اپنے آپ کو بھی کمزور پڑنے یا خطا سرزد ہونے کی "اجازت" نہیں دیتے۔ چونکہ آپ کا گمان تھا کہ آپ کے لیے خطاکار انسان ہونا جائز نہیں، اس لیے جب آپ سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو آپ اپنے اوپر اتنے سخت ہو جاتے ہیں کہ بالآخر ساری امید ہی کھو بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ آپ اپنے آپ کو بے لگام چھوڑ دیتے

ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ مزید گناہوں کا ارتکاب کرنے لگیں، جس سے آپ کی مایوسی مزید گہری ہو جاتی ہے ! اور یہ خود ساختہ تباہی کا ایک ایسا چکر بن جاتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ شیطان آپ کو یہ پٹی بھی پڑھانے کی کوشش کرے گا کہ چونکہ آپ اتنے "برے" انسان بن چکے ہیں، اس لیے اب آپ کو توبہ کرنے یا نماز پڑھنے کا ناٹک نہیں کرنا چاہیے ورنہ آپ منافق کہلائیں گے۔ وہ درحقیقت آپ کو اللہ کی رحمت سے مایوس کر دینا چاہتا ہے۔ بس یہی اس کا سب سے بڑا ہدف ہے !

یہ سب محض اس کے تراشے ہوئے جھوٹ اور فریب ہیں۔ اور بہرحال، وہ اپنے اس کام میں بڑا مشاق اور پرانا کھلاڑی ہے۔ جب آپ سے گناہ سرزد ہو جائے، تو یہی وہ وقت ہوتا ہے جب آپ کو اللہ کی طرف پہلے سے کہیں زیادہ رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے—نہ کہ اس سے دور بھاگنے کی !

زوال کے اس بھنور سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے، ہمیشہ یاد رکھیے کہ سستی اور گراوٹ کے یہ ادوار راستے کا ایک فطری حصہ ہیں۔ یاد رکھیے کہ دینی کیفیات میں "فتور" (وقتی گراوٹ اور سستی کا آنا) انسانی فطرت کا لازمی تقاضا ہے۔ جب آپ کو یہ ادراک ہو جائے گا کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ناکام ہو گئے ہیں یا آپ (معاذ اللہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی خیال کی طرح) منافق بن گئے ہیں، تو جب آپ اس موڑ پر پہنچیں گے تو ہمت ہارنے اور میدان چھوڑنے سے بچ جائیں گے۔ اس کا سب سے بڑا حل یہ ہے کہ انسان اپنے اندر کچھ ایسی مستقل عادتیں پختہ کر لے جو اس کا "کم سے کم بنیادی نصاب" (Bare Minimum) بن جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خواہ آپ کا موڈ کیسا بھی ہو، آپ کے اندر کیسا ہی بے دلی اور سستی کا عالم ہو، آپ کم از کم ان بنیادی فرائض کو ہر حال میں لازماً ادا کریں۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ جب آپ نچلی سطح پر ہوں گے تو یہ عمل نبھانا زیادہ دشوار ضرور ہوگا، مگر آپ لڑ کر اور جدوجہد کر کے ان پر قائم رہیں گے۔ مثال کے طور پر، اس بنیادی نصاب کا سب سے پہلا جزو پانچ وقت کی نمازیں ان کے مقررہ اوقات پر ادا کرنا ہے۔ اس پر کبھی، کسی بھی قیمت پر سمجھوتہ نہیں ہونا چاہیے—خواہ آپ کا دل کتنا ہی بیزار کیوں نہ ہو رہا ہو ! ان نمازوں کو یوں سمجھنا چاہیے جیسے سانس لینے کے لیے ہوا ضروری ہے۔ ذرا سوچیے کیا بنے گا اگر انسان جب کبھی تھک جائے یا اس کا موڈ خراب ہو تو وہ سانس لینا ہی بند کر دے !

اس کم سے کم بنیادی معمول میں کچھ دیگر عبادات کو بھی شامل کر لینا مستحسن ہے۔ مثال کے طور پر، کچھ مخصوص نوافل، مسنون اذکار، یا روزانہ تلاوتِ قرآن کا ایک حصہ اپنے معمول پر لازم کر لیں—چاہے وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ کو مسلسل اور مستقل مزاجی سے کیا جانے والا چھوٹا سا عمل بھی اس بہت بڑے عمل سے کہیں زیادہ محبوب ہے جو کبھی کبھار جوش میں آ کر کیا جائے اور پھر چھوڑ دیا جائے۔ اگر آپ اپنے اس کمزوری اور سستی کے دور میں بھی ان بنیادی عبادات کے دامن کو تھامے رہیں گے، تو آپ ایمان کی موج پر سوار ہو کر انشاء اللہ دوبارہ بلندی کی طرف ابھر آئیں گے۔ اور خدا نے چاہا، تو جب آپ دوبارہ ابھریں گے تو آپ اپنے پچھلے عروج سے بھی کہیں زیادہ بلند مقام پر ہوں گے۔

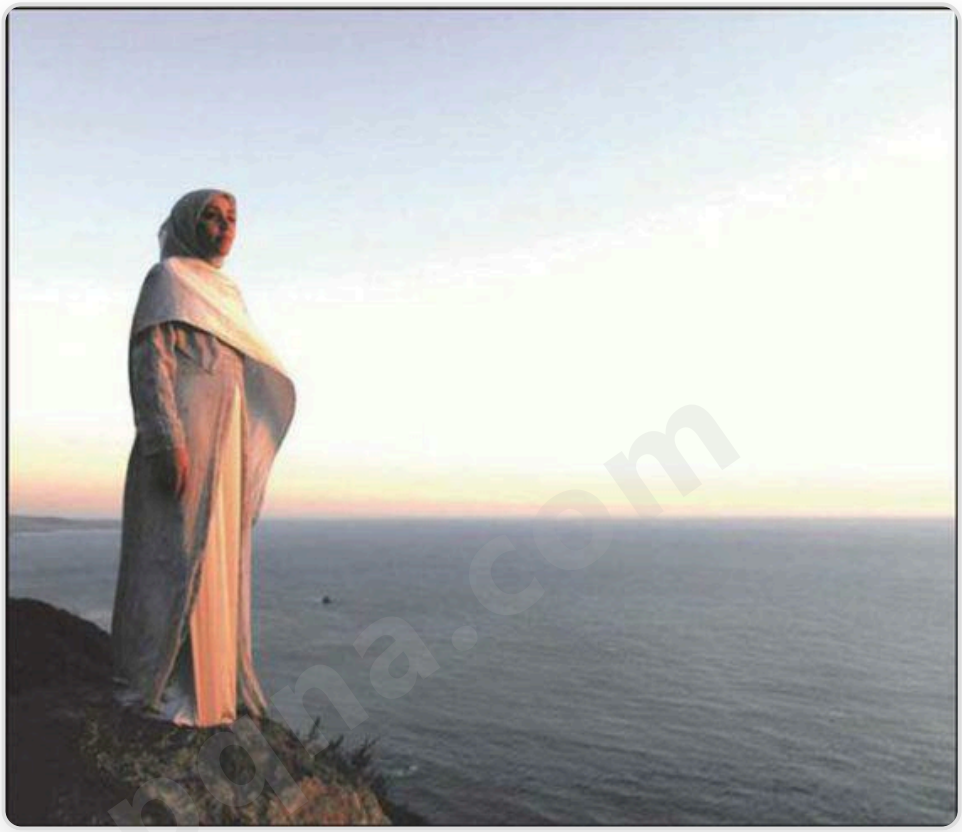
یہ جان لیجیے کہ اللہ کی طرف لے جانے والا راستہ کوئی ہموار اور سپاٹ سڑک نہیں ہے۔ آپ کا ایمان گھٹتا اور بڑھتا رہے گا۔ آپ کے اندر عبادت کرنے کی طاقت میں اتار چڑھاؤ آتا رہے گا۔ لیکن یقین رکھیے کہ ہر نشیب کے بعد ایک فراز بھی آتا ہے، ہر گراوٹ کے بعد ایک عروج منتظر ہوتا ہے۔ بس ثابت قدم رہیے، استقامت اختیار کیجیے، امید کا دامن مت چھوڑیے اور اللہ ہی سے مدد طلب کیجیے۔ راستہ کٹھن ہے۔ اس راہ میں ٹھوکریں بھی آئیں گی اور گڑھے بھی پڑیں گے۔ لیکن اس دنیا کی ہر چیز کی طرح، یہ سفر بھی بالآخر ایک دن اپنے اختتام کو پہنچے گا۔ اور وہ انجام اس تمام تر مشقت اور قربانی کا ایسا شاندار صلہ بن جائے گا کہ انسان پکار اٹھے گا کہ یہ سودا ہر طرح سے نفع بخش تھا!

> اللہ رب العزت کا فرمانِ عالیشان ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ﴾ ”اے انسان! بیشک تو اپنے رب کی طرف (پہنچنے کے لیے) سخت جدوجہد اور مشقت جھیلتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے... بالآخر تو اس سے جا ملنے والا ہے۔“ (القرآن، 84:6)

SECTION 5 • حصہ پنجم

عورت کا مقام و مرتبہ

WOMEN'S STATUS



topoma.com

خواتین کی حقیقی بااختیاری

The Empowerment of Women

جب رسول اللہ ﷺ کے صحابی [حضرت رِبعی بن عامرؓ] اہلِ بستی کے سامنے اسلام کا آفاقی پیغام پیش کرنے کے لیے تشریف لائے، تو انہوں نے اس حقیقت کو نہایت خوبصورت اور دلنشیں انداز میں بیان فرمایا۔ انہوں نے کہا: "میں اس لیے آیا ہوں کہ تمہیں بندوں کی غلامی سے نکال کر بندوں کے رب کی بندگی میں لے آؤں۔"

اس ایک جملے میں بصیرت کا ایک عظیم اور پرشکوہ خزانہ پوشیدہ ہے۔ انھی الفاظ کے باطن میں انسان کی حقیقی بااختیاری (Empowerment) کی کلید اور حریت و آزادی کی واحد سچی راہ مضمر ہے۔

دیکھیے، جس لمحے آپ یا میں اپنے خالق کے سوا کسی بھی دوسری چیز کو یہ حق دے دیتے ہیں کہ وہ ہماری کامیابی، ہماری ناکامی، ہماری خوشی، یا ہماری وقعت و قیمت کا تعین کرے، اسی لمحے ہم ایک خاموش مگر بے انتہا تباہ کن غلامی کے شکنجے میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ وہ شے جو میری خود توقیری، میری کامیابی اور میری ناکامی کی پیمائش بن جاتی ہے، دراصل وہی مجھ پر حاوی ہو جاتی ہے اور وہی میری مالک و آقا بن بیٹھتی ہے۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں وہ جھوٹے آقا جنہوں نے عورت کی قدر و قیمت کا پیمانہ طے کیا، مختلف روپ دھارتے رہے ہیں۔ عورت کے لیے قائم کیے گئے ان پیمانوں میں سب سے عام اور غالب پیمانہ 'مرد کا معیار' رہا ہے۔ مگر ہم اکثر یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو یہ عزت و توقیر بخشی ہے کہ اس کی قدر و قیمت کا تعین اپنی ذاتِ گرامی کے تعلق سے کیا ہے—نہ کہ مرد کے تعلق سے۔ لیکن جوں ہی مغربی نسائیت (ویسٹرن فیمینزم) نے اس پورے منظرنامے سے خدا کے تصور ہی کو محو کر دیا، تو مرد کے سوا کوئی دوسرا پیمانہ باقی ہی نہ بچا۔ نتیجتاً، مغربی فیمنسٹ عورت اس بات پر مجبور ہو گئی کہ وہ اپنی قدر و منزلت کو مرد کے تقابل میں تلاش کرے۔ اور یوں کرتے ہوئے اس نے ایک بنیادی طور پر ناقص اور فاسد مفروضے کو قبول کر لیا؛ اس

نے یہ مان لیا کہ مرد ہی اصل معیار ہے، اور اس لیے ایک عورت اس وقت تک مکمل انسان نہیں بن سکتی جب تک کہ وہ اس معیار—یعنی مرد—کی ہو بہو نقل نہ بن جائے!

جب مرد نے اپنے بال چھوٹے ترشوائے، تو اس نے بھی بال چھوٹے کروانے کی ٹھانی۔ جب مرد فوج میں بھرتی ہوا، تو وہ بھی فوج میں شامل ہونا چاہتی تھی۔ ان تمام چیزوں کے لیے اس کی تڑپ کی اس کے سوا کوئی دوسری وجہ نہ تھی کہ اس کا نام نہاد "معیار" (یعنی مرد) ایسا کر رہا تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہی کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کو ان کے باہمی تنوع، اختصاص اور انفرادی امتیاز میں عزت بخشی ہے—نہ کہ ان کی یکسانیت اور مماثلت میں۔ جب ہم مرد کو معیار تسلیم کر لیتے ہیں، تو اچانک ہر وہ صفت جو خاص صنفِ نازک اور نسوانیت سے وابستہ ہے، از خود حقیر اور فروتر قرار پا جاتی ہے۔ حساس دل ہونا ایک عیب یا توہین بن جاتا ہے، اور کل وقتی ماں بننا ایک پستی و رسوائی ٹھہرتی ہے۔ اس کشمکش میں جو بے لچک و خشک عقلانیت (جسے مردانہ صفت سمجھا گیا) اور بے لوث شفقت و دلسوزی (جسے نسوانی صفت مانا گیا) کے درمیان چھڑی، وہاں خشک عقل و منطق کو ہی برتر قرار دے دیا گیا۔

جیسے ہی ہم نے یہ تسلیم کر لیا کہ مرد کے پاس جو کچھ ہے اور مرد جو کچھ کرتا ہے وہی برتر ہے، تو اس کے بعد جو کچھ رونما ہوا وہ محض ایک اضطراری اور اندھی ردِ عمل پر مبنی دوڑ تھی: اگر مردوں کے پاس یہ ہے—تو ہمیں بھی یہی چاہیے! اگر مرد اگلی صفوں میں نماز پڑھتے ہیں، تو ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ یہی افضل ہے، چنانچہ ہم بھی اگلی صفوں میں ہی نماز ادا کرنا چاہتی ہیں۔ اگر مرد نماز کی امامت کراتے ہیں، تو ہم گمان کر بیٹھتے ہیں کہ امام شاید خدا کے زیادہ قریب ہوتا ہے، اس لیے ہم بھی نماز کی امامت کروانا چاہتی ہیں۔ اس فکری سفر میں کسی موڑ پر ہم نے نادانستہ طور پر یہ غلط نظریہ قبول کر لیا کہ ظاہری دنیاوی پیشوائی یا قیادت کا کوئی منصب حاصل ہونا، اللہ کے ہاں کسی بلند درجے کا غماز ہے۔

لیکن ایک مسلمان عورت کو اس طرح اپنی تحقیر اور تذلیل کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ اس کا اصل پیمانہ اور معیار خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کی قدر و منزلت کا تعین خود خدا فرماتا ہے؛ اسے اپنی وقعت کے تعین کے لیے کسی مرد کی محتاجی نہیں۔

عورت ہونے کے ناطے ہمیں جو شرف اور اعزاز حاصل ہے، اس کے پیشِ نظر ہم صرف اسی صورت میں خود کو نیچا دکھاتی ہیں جب ہم وہ بننے کی ناکام کوشش کرتی ہیں جو ہم نہیں ہیں—اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہم درحقیقت وہ بننا بھی نہیں چاہتیں: یعنی ایک مرد! بطورِ عورت، ہم اس وقت تک کبھی حقیقی حریت و نجات نہیں پا سکتیں جب تک کہ ہم مردوں کی اندھی نقالی ترک نہ کر دیں، اور اللہ کے عطا کردہ اپنے مخصوص نسوانی حسن اور امتیازی مقام کی سچی قدر نہ پہچان لیں۔

اور پھر، اسی معاشرے میں ایک اور غالب "آقا" موجود ہے جس نے عورت کے لیے اس کی قدر و قیمت کا تعین کر رکھا ہے۔ اور وہ ہے نام نہاد حسن و خوبصورتی کا معیار۔ اپنے بچپن سے ہی، بحیثیتِ عورت، ہمیں معاشرے نے ایک نہایت واضح پیغام سکھایا اور گھول کر پلایا ہے۔ اور وہ پیغام یہ ہے کہ: "دبلی پتلی بنو، پرکشش بنو، دلربا دکھائی دو... ورنہ تم کچھ بھی نہیں ہو!" چنانچہ ہم سے کہا گیا کہ ان کے بنائے ہوئے میک اپ کا لیپ کرو اور ان کے چھوٹے اسکرٹ زیبِ تن کرو۔ ہمیں سکھایا گیا کہ خوبصورت اور دلکش دکھائی دینے کی خاطر اپنی زندگیاں، اپنے جسم اور اپنی عزت و خودداری تک قربان کر دو۔ ہم نے یہ یقین کر لیا کہ ہم خواہ کچھ بھی کر لیں، ہماری قدر و قیمت صرف اسی حد تک ہے جس حد تک ہم مردوں کو لبھا سکیں اور ان کی آنکھوں کو بھا سکیں۔ چنانچہ ہم نے اپنی زندگیاں 'کاسموپولیٹن' میگزین کے سرورق کی نذر کر دیں اور اپنے جسم اشتہار بازوں کے حوالے کر دیے تاکہ وہ اپنی تجارتی اشیاء بیچ سکیں۔ ہم درحقیقت غلام تھیں، لیکن انہوں نے ہمیں باور کرایا کہ ہم آزاد ہیں۔ ہم ان کے لیے محض ایک بے جان شوپیس (نمائشی شے) تھیں، مگر انہوں نے قسمیں کھا کر کہا کہ یہی تو اصل کامیابی ہے۔ کیونکہ انہوں نے آپ کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ آپ کی زندگی کا اصل مقصد محض نمائش بننا، مردوں کو اپنی طرف مائل کرنا اور ان کے لیے دلکش نظر آنا ہے۔ انہوں نے آپ کو یہ یقین دلایا کہ آپ کا جسم تو ان کی نئی گاڑیوں کی فروخت کی تشہیر کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ مگر انہوں نے سراسر جھوٹ بولا! آپ کا جسم، آپ کی روح، اس سے کہیں بلند، کہیں ارفع اور کہیں مقدس مقصد کے لیے تخلیق کی گئی ہے!

اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں ارشاد فرماتا ہے: "بلاشبہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز اور مکرم وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار اور متقی ہے۔" (سورۃ الحجرات: 13)

پس آپ صاحبِ عزت و شرف ہیں! لیکن یہ عزت مردوں سے آپ کے کسی تعلق—خواہ ان جیسا بننے یا ان کو خوش کرنے—کی مرہونِ منت نہیں ہے۔ بطورِ عورت آپ کی قدر و منزلت آپ کی کمر کے سائز یا آپ کو پسند کرنے والے مردوں کی تعداد سے نہیں ناپی جاتی۔ بحیثیتِ انسان آپ کی وقعت ایک کہیں زیادہ بلند وبالا ترازو میں تولی جاتی ہے: اور وہ ہے تقویٰ، للہیت اور پرہیزگاری کا ترازو! اور فیشن میگزینوں کے تمام تر دعووں کے برعکس—آپ کی حیات کا مقصد محض مردوں کے لیے خوشنما اور پرکشش دکھائی دینے سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔

ہماری ذات کی تکمیل صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے ساتھ ہمارے تعلق سے ہی ممکن ہے۔ مگر اس کے باوجود، بچپن سے ہی ہم عورتوں کو یہ سبق پڑھایا گیا ہے کہ ہم اس وقت تک کبھی مکمل نہیں ہو سکتیں جب تک کہ کوئی مرد آکر ہمیں مکمل نہ کر دے۔ سنڈریلا کی کہانی کی طرح ہمیں یہ سکھایا گیا کہ ہم اس وقت تک بے بس اور لاچار ہیں جب تک کہ کوئی شہزادہ آکر ہمیں نجات نہ دلائے۔ سلیپنگ بیوٹی کی طرح ہمیں بتایا گیا کہ ہماری زندگی کا اصل آغاز اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ کوئی خوابوں کا شہزادہ (پرنس چارمنگ) آکر ہمیں بوسہ نہ دے۔ مگر اصل حقیقت یہ ہے: کوئی شہزادہ آپ کی ذات کو مکمل نہیں کر سکتا، اور نہ ہی کوئی بہادر شہسوار آپ کو نجات دلا سکتا ہے۔ یہ قدرت صرف اور صرف اللہ کے پاس ہے! آپ کا شہزادہ محض ایک فانی انسان ہے۔ اللہ اسے آپ کا ہم سفر بنا کر بھیج سکتا ہے—لیکن وہ آپ کا نجات دہندہ (مسیحا) ہرگز نہیں ہو سکتا۔ وہ آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک تو ہو سکتا ہے—مگر وہ آپ کے پھیپھڑوں میں اترنے والی سانس ہرگز نہیں بن سکتا! آپ کی سانسیں تو اللہ کی مرہونِ منت ہیں۔ آپ کی نجات اور آپ کی ذات کی تکمیل اس کے قرب میں ہے—نہ کہ کسی مخلوق کے قرب میں۔ نہ کسی شہزادے کی قربت میں، نہ فیشن، حسن یا انداز و اطوار کے قرب میں۔

اس لیے میں آپ سے التماس کرتی ہوں کہ ان تمام باطل تصورات کو اپنے ذہنوں سے کھرچ کر نکال پھینکیے (Unlearn کیجیے)۔ میں آپ کو پکارتی ہوں کہ اٹھ کھڑی ہوئیے اور دنیا پر یہ حقیقت آشکار کر دیجیے کہ آپ کسی بھی شے کی غلام نہیں ہیں—نہ فیشن کی، نہ ظاہری حسن کی، اور نہ ہی مردوں کی! آپ صرف اور صرف ایک اللہ کی بندی اور اسی کی غلام ہیں۔ میں آپ سے کہتی ہوں کہ دنیا کو صاف بتا دیجیے کہ آپ اپنے جسم کی نمائش کر کے مردوں کی تسکین کے لیے پیدا نہیں کی گئیں؛ بلکہ آپ تو اپنے خالق و مالک رب کو راضی کرنے کے لیے وجود

میں آئی ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو بظاہر خیر خواہی کا لبادہ اوڑھ کر آپ کو نام نہاد 'آزادی' دلانے کے دعویدار بنتے ہیں، ان کی طرف دیکھ کر بس مسکرائیے اور کہیے: "آپ کی مہربانی، مگر مجھے ایسی آزادی کی کوئی حاجت نہیں!"

انہیں بتا دیجیے کہ آپ محض نمائش کے لیے نہیں بنی ہیں۔ اور نہ ہی آپ کا جسم عام پبلک کے لطف اندوز ہونے اور استعمال کے لیے ہے۔ دنیا کو یہ باور کرا دیجیے کہ آپ کی حیثیت کو کبھی کسی بے جان شے، یا جوتے فروخت کرنے کے لیے ٹانگوں کی ایک جوڑی تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ایک روح ہیں، ایک شعور و عقل ہیں، اور اللہ کی معزز بندی ہیں۔ اور آپ کی اصل وقعت و قیمت اسی روح، اسی قلب اور اس اخلاقی کردار کے حسن سے متعین ہوتی ہے۔ لہٰذا، آپ ان کے حسن کے خود ساختہ پیمانوں کی پوجا نہیں کرتیں؛ آپ ان کی فیشن کی عقل کے آگے سر نہیں جھکاتیں۔ آپ کی اطاعت و بندگی تو کسی ایسی ذات کے لیے ہے جو کائنات کی ہر شے سے ارفع و اعلیٰ ہے! چنانچہ اس سوال کے جواب میں کہ ایک عورت حقیقی بااختیاری کہاں اور کیسے پا سکتی ہے، میں خود کو رسول اللہ ﷺ کے اسی جلیل القدر صحابی کے فرمان کی طرف لوٹتا ہوا پاتی ہوں۔ مجھے اس حقیقت کا ازسرنو ادراک ہوتا ہے کہ سچی حریت اور حقیقی بااختیاری اسی میں مضمر ہے کہ انسان خود کو تمام جھوٹے آقاؤں، تمام من گھڑت تعریفوں اور تمام دیگر خود ساختہ معیارات کی غلامی سے آزاد کرا لے۔ مسلمان خواتین ہونے کے ناطے، ہمیں اس پوشیدہ و خاموش غلامی کی زنجیروں سے آزادی مل چکی ہے۔ ہمیں اپنی قدر و منزلت طے کرنے کے لیے معاشرے کے وضع کردہ حسن یا فیشن کے معیاروں کی ذرا بھی ضرورت نہیں۔ عزت و توقیر پانے کے لیے ہمیں مردوں کی ہوبہو نقل بننے کی کوئی حاجت نہیں، اور نہ ہی اپنی ذات کی تکمیل یا نجات کے لیے کسی فرضی شہزادے کے انتظار کی ضرورت ہے۔ ہماری وقعت، ہماری عزت، ہماری نجات، اور ہماری تکمیل کسی بندے (غلام) میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو بندوں کے رب کی بارگاہ میں ہے!

اس تہذیب کے نام ایک خط جس نے میری پرورش کی

A Letter to the Culture that Raised Me

جب میں ہوش سنبھال رہی تھی، تو تم نے مجھے 'بدصورت بطخ کے بچے' (The Ugly Duckling) کی کہانی سنائی۔ اور برسوں تک میں یہی سمجھتی رہی کہ وہ بدصورت بطخ کا بچہ دراصل میں ہی ہوں۔ تم نے مدتوں مجھے یہ سکھایا کہ میں اپنے اصل معیار (یعنی مرد) کے سوا کچھ نہیں ہوں مگر محض ایک ناقص اور بھدی نقل! میں نہ تو مردوں کی طرح تیز دوڑ سکتی تھی اور نہ ان جتنا بھاری بوجھ اٹھا سکتی تھی۔ نہ میں اتنے پیسے کما پاتی تھی، اور میں بہت جلدی رو پڑتی تھی۔ میں مردوں کی بنائی ہوئی ایسی دنیا میں پروان چڑھی جہاں مجھ جیسے وجود کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

اور جب میں مرد نہ بن سکی، تو میری واحد تمنا یہ بن گئی کہ بس کسی طرح اسے خوش رکھوں۔ میں نے تمہارا بنایا ہوا میک اپ چہرے پر مل لیا اور تمہارے چھوٹے اسکرٹ زیبِ تن کیے۔ میں نے صرف خوبصورت اور پرکشش دکھائی دینے کی خاطر اپنی زندگی، اپنا جسم اور اپنی عزتِ نفس تک نچھاور کر دی۔ میں یہ مان بیٹھی تھی کہ میں کچھ بھی کر لوں، میری وقعت کا دارومدار صرف اسی بات پر ہے کہ میں اپنے اس آقا کو کتنا لبھا سکتی ہوں اور اس کے لیے کتنی دلکش بن سکتی ہوں۔ اور یوں میں نے اپنی زندگی 'کاسموپولیٹن' کے سرورق کی نذر کر دی اور اپنا جسم تمہارے حوالے کر دیا تاکہ تم اسے بازار میں بیچ سکو۔

میں ایک بے بس لونڈی اور غلام تھی، مگر تم نے مجھے یہ پٹی پڑھائی کہ میں آزاد ہوں۔ میں تمہارے لیے محض ایک نمائشی شے تھی، لیکن تم نے حلف اٹھا کر مجھے یقین دلایا کہ یہی تو اصل کامیابی ہے۔ تم نے مجھے سکھایا کہ میری زندگی کا کل مقصد صرف نمائش بننا، مردوں کو رجھانا اور ان کے لیے خوبصورت نظر آنا ہے۔ تم نے مجھ سے یہ تسلیم کروایا کہ میرا جسم تو تمہاری کاروں کی تشہیر کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اور تم نے میری ایسی تربیت کی کہ میں خود کو ایک بدصورت بطخ کا بچہ سمجھتی رہی۔ مگر تم نے سراسر جھوٹ بولا تھا! اسلام مجھے بتاتا ہے کہ میں بدصورت بطخ نہیں بلکہ ایک خوبصورت اور پرشکوہ راج ہنس (Swan) ہوں! میں مختلف ہوں—اور مجھے

ایسا ہی مختلف ہونا چاہیے تھا، کیونکہ یہی فطرت کا تقاضا ہے۔ اور میرا جسم، میری روح، اس سے کہیں ارفع، کہیں پاکیزہ اور کہیں عظیم تر مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہے!

اللہ تعالیٰ قرآنِ حکیم میں ارشاد فرماتا ہے: "اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں بانٹ دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بلاشبہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا، باخبر ہے۔" (سورۃ الحجرات: 13)

پس میں معزز و محترم ہوں، مگر یہ عزت مردوں سے میرے کسی تعلق کی محتاج نہیں۔ ایک عورت کی حیثیت سے میری قدروقیمت میری کمر کی پیمائش یا مجھے پسند کرنے والے مردوں کے شمار سے متعین نہیں ہوتی۔ ایک انسان کے طور پر میری وقعت ایک کہیں زیادہ بلند معیار پر تولی جاتی ہے: تقویٰ، للہیت اور پاکبازی کا معیار! اور فیشن کے رسالے خواہ کچھ بھی کہیں—میری زندگی کا مقصد محض مردوں کے لیے دلکش نظر آنے سے کہیں زیادہ ارفع و مقدس ہے۔

چنانچہ، اللہ تعالیٰ مجھے حکم دیتا ہے کہ میں خود کو ڈھانپ کر رکھوں، اپنی زینت و حسن کو چھپاؤں، اور دنیا کو یہ بتا دوں کہ میں اپنے جسم کے ذریعے مردوں کو خوش کرنے کے لیے نہیں بنی؛ بلکہ میں تو اپنے رب کو راضی کرنے کے لیے جیتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ عورت کے جسم کی توقیر اور حرمت کو اس طرح بلند فرماتا ہے کہ وہ اس کے احترام اور اسے پردے میں رکھنے کا حکم دیتا ہے، تاکہ یہ حسن صرف اسی کے سامنے عیاں ہو جو فی الواقع اس کا حقدار ہے—یعنی صرف وہ مرد جس سے میں نکاح کے پاکیزہ بندھن میں بندھوں۔ اس لیے وہ لوگ جو مجھے نام نہاد 'آزادی' دلانے کے متمنی ہیں، ان سے مجھے بس ایک ہی بات کہنی ہے: "شکریہ، مگر مجھے آپ کی ایسی آزادی کی ہرگز ضرورت نہیں!"

میں یہاں اس لیے نہیں ہوں کہ سرِعام نمائش بن کر رہ جاؤں۔ اور نہ ہی میرا جسم عام لوگوں کے دیکھنے اور لطف لینے کی کوئی شے ہے۔ مجھے کبھی کسی بے جان شوپیس، یا جوتے بیچنے کے لیے ٹانگوں کے ایک جوڑے تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ میں ایک روح ہوں، ایک صاحبِ عقل و فکر وجود ہوں، اور اللہ کی بندی ہوں۔ میری قدر و قیمت کا تعین میری روح، میرے قلب، اور میرے اخلاقی کردار کے حسن سے ہوتا ہے۔ اس

لیے، میں تمہارے حسن کے خود ساختہ بتوں کی پوجا نہیں کروں گی، اور نہ ہی تمہاری فیشن پرستی کے آگے سر تسلیم خم کروں گی۔ میری بندگی و اطاعت تو اس پاک پروردگار کے لیے ہے جو ہر شے سے بلند و برتر ہے!

اپنے پردے اور حجاب کے ذریعے میں اپنے حسن کے بجائے اپنے ایمان کا اظہار کرتی ہوں۔ ایک انسان کے طور پر میری قدر و منزلت اللہ تعالیٰ کے ساتھ میرے تعلق سے طے ہوتی ہے، نہ کہ میرے ظاہری خدوخال سے۔ میں ان چیزوں کو ڈھانپ دیتی ہوں جو غیر متعلق اور ثانوی ہیں۔ اور جب تم میری طرف دیکھتے ہو، تو تمہیں کوئی نمائش شدہ جسم نظر نہیں آتا۔ تم مجھے صرف وہی دیکھتے ہو جو میں حقیقت میں ہوں: یعنی اپنے خالق و مالک کی ایک عاجز بندی! دیکھیے، بطورِ مسلم خاتون، مجھے ایک خاموش مگر گہری غلامی کے بندھنوں سے نجات مل چکی ہے۔ میں اس زمین پر اللہ کے بندوں اور غلاموں کے سامنے جوابدہ نہیں ہوں۔ میں تو صرف اور صرف ان سب کے حقیقی بادشاہ (رب العالمین) کے سامنے جوابدہ ہوں!

topqna.com

امامتِ نماز پر ایک خاتون کا تجزیاتی نقطۂ نظر

A Woman's Reflection on Leading Prayer

18 مارچ 2005ء کو آمنہ ودود نے تاریخ میں پہلی بار خواتین کی امامت میں جمعہ کی نماز پڑھائی۔ اس روز، خواتین نے مردوں کی مشابہت اختیار کرنے اور ان جیسا بننے کی جانب ایک بہت بڑا قدم اٹھایا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس حریت اور نجات کے کچھ قریب پہنچ سکیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کی تھی؟ میرا خیال ہے: ہرگز نہیں!

ہم اکثر یہ حقیقت فراموش کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو یہ عزت بخشی ہے کہ اس کی قدر و قیمت کا تعین اپنی ذاتِ پاک کے تعلق سے کیا ہے—نہ کہ مرد کے تعلق سے۔ لیکن جب مغربی نسائیت (ویسٹرن فیمینزم) منظر نامے سے خدا کے وجود کو مٹا دیتی ہے، تو سوائے مرد کے کوئی دوسرا معیار باقی ہی نہیں رہتا۔ نتیجتاً، مغربی فیمنسٹ عورت اس پر مجبور ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی قدر و منزلت مرد کے تقابل میں تلاش کرے۔ اور یوں کرتے ہوئے وہ ایک بنیادی طور پر فاسد مفروضے کو گلے لگا لیتی ہے۔ وہ یہ تسلیم کر لیتی ہے کہ مرد ہی اصل پیمانہ ہے، اور اس لیے عورت اس وقت تک مکمل انسان نہیں بن سکتی جب تک کہ وہ ہوبہو مرد کی مانند نہ بن جائے۔ جب مرد نے بال چھوٹے ترشوائے، تو وہ بھی چھوٹے بال کٹوانا چاہتی تھی۔ جب مرد فوج میں گیا، تو وہ بھی فوج میں بھرتی ہونا چاہتی تھی۔ ان چیزوں کے پیچھے اس کی خواہش کی اس کے سوا کوئی دلیل نہ تھی کہ اس نام نہاد "معیار" (مرد) کے پاس یہ چیز تھی۔ وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کو ان کے جداگانہ فطری امتیاز و خصوصیات میں وقار بخشا ہے—نہ کہ ان کی بے جا یکسانیت اور نقالی میں۔ اور 18 مارچ کو، مسلم خواتین نے بھی ہوبہو یہی فاش غلطی دہرا دی!

چودہ سو سال سے تمام علمائے امت کا اس بات پر اجماع چلا آ رہا ہے کہ نماز کی امامت مرد ہی کروائیں گے۔ بحیثیتِ مسلم خاتون، یہ بات اتنی اہمیت کی حامل کیوں ہے؟ نماز کی امامت کرانے والا روحانی اعتبار سے مقتدیوں پر کوئی برتری یا فضیلت نہیں رکھتا۔ کوئی عمل صرف اس لیے افضل نہیں ہو جاتا کہ اسے مرد

انجام دے رہا ہے۔ اور امامت کرانا محض اس لیے کوئی برتر عمل نہیں بن جاتا کہ یہ بظاہر قیادت یا آگے کھڑے ہونے کا نام ہے۔ اگر یہ عورتوں کا منصب ہوتا یا اللہ کے نزدیک اس میں کوئی زیادہ تقدس اور روحانی بلندی رکھی گئی ہوتی، تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ، حضرت خدیجہؓ، یا سیدہ فاطمۃ الزہراءؓ—جو کائنات کی تمام خواتین میں سب سے عظیم ہستیاں ہیں—کو امامت کا حکم کیوں نہ فرمایا؟ یہ وہ مقدس خواتین تھیں جنہیں دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی گئی تھی—مگر انہوں نے کبھی مردوں کی نماز کی امامت نہیں فرمائی۔ لیکن اب، چودہ سو سال کی تاریخ میں پہلی بار، ہم کسی مرد کو نماز کی امامت کراتے دیکھتی ہیں اور دل میں سوچتی ہیں: "یہ تو ناانصافی ہے!" ہم یہ اس وقت سوچتی ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امامت کروانے والے کو کوئی خصوصی روحانی امتیاز عطا نہیں کیا۔ اللہ کی بارگاہ میں امام کا درجہ اپنے پیچھے نماز پڑھنے والے مقتدی سے کچھ بھی بلند تر نہیں ہے۔

دوسری طرف دیکھیے، صرف ایک عورت ہی ماں بننے کا شرف پا سکتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ماں کو ایک غیر معمولی اور بے مثال فضیلت و امتیاز بخشا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں تعلیم دی کہ "جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے۔" مگر مرد خواہ کچھ بھی کر لے، وہ کبھی ماں نہیں بن سکتا۔ تو پھر کیا یہ بات ناانصافی نہیں کہلائے گی؟ جب رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا: "میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟" تو آپ ﷺ نے تین مرتبہ ارشاد فرمایا: "تمہاری ماں"، اور چوتھی بار جا کر فرمایا: "تمہارا باپ۔" تو کیا اسے صنفی تعصب (Sexist) کہا جائے گا؟ مرد خواہ زمین و آسمان کے قلابے ملا دے، وہ کبھی ماں کا وہ بلند مقام حاصل نہیں کر سکتا جو اللہ نے اسے بخشا ہے!

مگر اس کے باوجود، جب اللہ تعالیٰ ہمیں کسی ایسی صفت سے نوازتا ہے جو خالصتاً نسوانی اور منفرد ہے، تو ہم مردوں کے تقابل میں اپنی قیمت تلاش کرنے میں اس قدر منہمک ہوتی ہیں کہ اس الٰہی تحفے کی قدر کرنا تو درکنار، اس پر توجہ تک نہیں دیتیں۔ ہم نے بھی مرد ہی کو معیار تسلیم کر لیا ہے؛ چنانچہ نسوانیت کا ہر امتیازی وصف ہمارے ہاں از خود کم تر اور ادنیٰ ٹھہرتا ہے۔ حساسیت ایک گالی بن جاتی ہے اور ماں بننا ایک پستی و ذلت سمجھا جاتا ہے۔ اس کشمکش میں جو بے لچک و خشک عقل پسندی (جسے مردانہ وصف قرار دیا گیا) اور بے غرض دلسوزی و ایثار (جسے زنانہ صفت مانا گیا) کے مابین برپا ہوئی، وہاں خشک عقل ہی کو حاکمِ مطلق تسلیم کر

لیا گیا۔ جوں ہی ہم نے یہ مفروضہ قبول کر لیا کہ ہر وہ چیز جو مرد کے پاس ہے اور جو وہ کرتا ہے وہی افضل ہے، تو اس کے نتیجے میں وہی اضطراری اور اندھی دوڑ شروع ہو گئی: جو کچھ مردوں کے پاس ہے، ہمیں بھی وہی چاہیے! اگر مرد اگلی صفوں میں نماز پڑھتے ہیں، تو ہم یہ سمجھ لیتی ہیں کہ یہی افضل ہے، اس لیے ہم بھی پہلی ہی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا چاہتی ہیں۔ اگر مرد نماز کی امامت کرواتے ہیں، تو ہم فرض کر لیتی ہیں کہ امام خدا کے زیادہ قریب ہوتا ہے، لہٰذا ہمیں بھی امامت کرانی چاہیے۔ اس راستے پر چلتے ہوئے ہم نے کہیں یہ لغو تصور قبول کر لیا کہ دنیاوی امامت وپیشوائی کا کوئی منصب پا لینا، دراصل بارگاہِ الٰہی میں بلند مرتبے کی علامت ہے۔

ایک مسلمان خاتون کو ہرگز ضرورت نہیں کہ وہ اس طرح اپنے وقار کو پامال کرے۔ اس کا اصل معیار خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کو وقعت و شرف بخشنے والا خود خدا ہے؛ اسے مرد کے سہارے کی حاجت نہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مردوں کی تقلید کی اس جنونی دوڑ میں، ہم عورتوں نے کبھی ایک لمحے کو رک کر اس امکان پر غور تک نہیں کیا کہ جو کچھ ہمارے پاس پہلے سے موجود ہے شاید وہ ہمارے حق میں کہیں زیادہ بہتر ہو! بعض صورتوں میں تو ہم نے صرف مردوں جیسا دکھنے کی خاطر وہ سب کچھ گنوا دیا جو درحقیقت کہیں زیادہ بلند اور ارفع تھا۔ پچاس سال قبل، معاشرے نے ہمیں یہ پڑھایا کہ مرد اس لیے برتر ہیں کیونکہ وہ روزی کمانے کے لیے گھر چھوڑ کر کارخانوں اور فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں۔ ہم مائیں تھیں۔ مگر اس کے باوجود، ہم سے کہا گیا کہ ایک انسان اور نئی نسل کی پرورش کو چھوڑ کر کسی مشین پر جا کر مشقت کرنا ہی دراصل 'نسوانی آزادی' ہے! ہم نے یہ مان لیا کہ کارخانے میں پرزے جوڑنا معاشرے کی بنیادی اینٹیں رکھنے اور انسان سازی سے زیادہ افضل ہے—صرف اس لیے کہ یہ کام مرد کیا کرتا تھا! پھر کارخانوں اور دفاتر میں کام کے بعد، ہم سے یہ توقع باندھ لی گئی کہ ہم کوئی مافوق الفطرت (Superhuman) مخلوق بن جائیں—ایک بے عیب ماں، ایک مثالی بیوی، ایک بے مثل سلیقہ مند گھریلو خاتون—اور اس کے ساتھ ساتھ ایک شاندار پیشہ ورانہ کیریئر بھی سنبھالیں! اور اگرچہ بذاتِ خود عورت کے کوئی پیشہ اختیار کرنے یا ملازمت کرنے میں کوئی قباحت نہیں، مگر مردوں کی اس اندھی تقلید کے نتیجے میں ہم نے کیا کچھ قربان کر دیا، اس کا احساس ہمیں بہت جلد ہو گیا۔ ہم نے بے بسی سے دیکھا کہ ہماری اپنی ہی اولادیں ہمارے لیے اجنبی بنتی چلی گئیں، اور ہمیں جلد ہی ادراک ہو گیا کہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے کتنا عظیم اعزاز گنوا دیا ہے۔

اور اب جا کر—جب انہیں انتخاب کا حق ملا ہے—مغرب کی خواتین اپنے بچوں کی پرورش کی خاطر گھروں میں رہنے کو ترجیح دے رہی ہیں۔ امریکی محکمہ زراعت (USDA) کے اعداد و شمار کے مطابق، نوزائیدہ بچوں کی صرف 31 فیصد مائیں، اور دو یا اس سے زیادہ بچوں کی صرف 18 فیصد مائیں کل وقتی (فل ٹائم) ملازمت کر رہی ہیں۔ اور ان برسرِ روزگار ماؤں میں سے بھی، سن 2000ء میں 'پیرنٹنگ میگزین' کے ایک سروے کے مطابق 93 فیصد ماؤں کا کہنا تھا کہ وہ ملازمت کے بجائے گھر پر رہ کر اپنے بچوں کی پرورش کو ترجیح دیں گی، مگر وہ محض 'مالی مجبوریوں' کے تحت کام کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ وہ 'مالی مجبوریاں اور بار' ہیں جو جدید مغرب کے صنفوں کی جبری یکسانیت کے فلسفے نے عورت پر لادے ہیں، جبکہ اسلام نے صنفی تنوع اور فطری اختصاص کے ذریعے عورت کے کندھوں سے یہ سارا مالی بوجھ اتار پھینکا ہے۔ مغرب کی عورت کو اس اعزاز اور حق کا ادراک کرنے میں تقریباً ایک صدی کے تلخ تجربات سے گزرنا پڑا جو اسلام نے چودہ سو سال پہلے ہی مسلم عورت کو ایک مسلمہ شرف کے طور پر عطا کر دیا تھا!

عورت ہونے کی حیثیت سے جو شرف و فضیلت مجھے حاصل ہے، اس کے بعد میں صرف اسی صورت میں خود کو گراؤں گی جب میں وہ بننے کی کوشش کروں جو میں نہیں ہوں—اور سچ پوچھیے تو—میں درحقیقت وہ بننا بھی نہیں چاہتی: یعنی ایک مرد! بطورِ خواتین، ہم اس وقت تک کبھی حقیقی آزادی کی منزل نہیں پا سکتیں جب تک کہ ہم مردوں کی نقالی کا بھوت اپنے سر سے نہ اتار پھینکیں، اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اپنے مخصوص فطری حسن اور انفرادی کمالات کی دل سے قدر نہ کریں۔ اگر مجھے خشک و بے لچک عدل اور سراپا رحمت و شفقت کے درمیان کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو، تو میں بلا جھجک شفقت و رحمت کو چنوں گی۔ اور اگر مجھے دنیاوی پیشوائی و قیادت اور اپنے قدموں تلے بچھائی گئی جنت کے درمیان فیصلہ کرنا ہو—تو میں بانگِ دہل جنت کو ہی منتخب کروں گی!

مردانگی اور ظاہری سختی کا نقاب

Manhood and The Facade of Being Hard

پچھلے ہفتے میری بہن کا فون آیا۔ موسمِ گرما کے آغاز سے ہی وہ بیرونِ ملک زیرِ تعلیم ہے، چنانچہ اس کی آواز سن کر فطری طور پر میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس کی خیریت دریافت کرنے کے بعد، میں نے اس کے نئے مسکن کے بارے میں پوچھا۔ چونکہ وہ ایک مسلم ملک میں رہ رہی تھی، اس لیے مجھے دلی اطمینان تھا کہ وہاں سب کچھ خیر و عافیت سے ہی ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد جو داستان اس نے سنائی وہ میرے لیے ایک شدید صدمہ تھی۔ اس نے ایک ایسی بستی کا احوال بیان کرنا شروع کیا جہاں کوئی لڑکی گلی سے گزرنے والے اوباش مردوں کے نازیبا فقروں کا نشانہ بنے بغیر بمشکل ہی اپنے گھر سے باہر قدم رکھ سکتی ہے۔ اس نے بتایا کہ راہ چلتی لڑکیوں پر آوازیں کسنا اب کوئی شاذ و نادر بات نہیں رہی، بلکہ ایک عام دستور اور معمول بن چکا ہے۔ پھر اس نے اپنی ایک مسلم سہیلی کا سچا واقعہ سنایا۔ وہ لڑکی ٹیکسی میں سفر کر رہی تھی اور جب اپنی منزل پر پہنچی تو اس نے ڈرائیور کو کرایہ پیش کیا۔ ان میں سے کئی ممالک میں ٹیکسیوں میں کرایہ ناپنے والے میٹر کا کوئی سخت نظام نہیں ہوتا، اور چونکہ کرایہ طے کرنے میں اکثر من مانی چلتی ہے، اس لیے ڈرائیور کرائے پر طیش میں آگیا۔ رفتہ رفتہ تکرار اتنی بڑھی کہ ڈرائیور نے اس لڑکی کو کندھوں سے پکڑ لیا اور جھنجھوڑنے لگا۔ اس پر لڑکی نے بھی غصے میں آکر ڈرائیور کو سخت سست کہہ دیا۔ اس کے جواب میں ڈرائیور نے اس نوجوان لڑکی کے منہ پر پوری قوت سے مکا جڑ دیا!

یہاں تک سن کر میں شدید تڑپ اٹھی اور مضطرب ہو گئی۔ لیکن اس کے بعد میری بہن نے جو بتایا وہ سب سے زیادہ روح فرسا اور دل دہلا دینے والا تھا۔ قریب ہی مردوں کا ایک گروہ کھڑا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا، اور وہ دوڑ کر جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس مظلوم لڑکی کی مدد کے لیے لپکے ہوں گے؟ نہیں! وہ بے حسوں کی طرح بس کھڑے تماشا دیکھتے رہے!

کہانی کے اسی موڑ پر آ کر میں گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اچانک میں نے خود کو مردانگی کی ہر اس تعریف پر سوال اٹھاتے ہوئے پایا جس پر میں اب تک یقین رکھتی آئی تھی۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کوئی مرد—ایک نہیں، بلکہ لاتعداد مرد—کسی عورت کو یوں سرِ عام پٹتا اور بے توقیر ہوتا دیکھ کر کیسے محض بے حس تماشائی بن کر کھڑا رہ سکتا ہے اور اسے بچانے کے لیے انگلی تک نہیں ہلاتا؟ اس سانحے نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آج کے معاشرے میں مرد ہونے کی پہچان کن معیارات سے ہوتی ہے۔ کیا مردانگی کا مفہوم اس قدر مسخ ہو چکا ہے کہ وہ محض بے لگام شہوت اور حیوانی خواہش بن کر رہ گیا ہے؟ کیا سفید براق زرہ پہنے، مظلوموں کی ڈھال بننے والے 'غیرت مند شہسوار' کا تصور سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے اور لڑکیوں پر آوازیں کسنے والے نام نہاد غنڈہ صفت نوجوانوں کے روپ میں تبدیل ہو چکا ہے؟ اور سب سے بڑھ کر، اس بات نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آج کے دور میں ایک سچے 'مسلمان مرد' ہونے کا کیا تقاضا ہے۔ میں حیران تھی کہ بحیثیتِ مسلمان مردانگی کے جو غالب پیمانے ہمارے ہاں رائج ہیں، کیا فی الواقع انہیں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا؟ آج ایک مرد سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ بے حس، جذبات سے عاری، خشک، پتھر دل اور جھکنے سے نابلد ہو۔ جسمانی جارحیت اور غصے کو بہادری قرار دے کر سراہا جاتا ہے جبکہ دلی جذبات کے اظہار کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ تب میں نے مردانگی کے اس کامل ترین نمونے اور پیکرِ جمیل کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا جو انسانیت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ میں نے سرورِ کائنات، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ پر نگاہ ڈالنے کی ٹھانی۔

آج مردانگی کی سب سے عام تعریف جذبات کے اظہار سے کورا ہونا سمجھی جاتی ہے۔ یہ مفروضہ تقریباً ہر جگہ مسلم مانا جاتا ہے کہ رونا اور اشکبار ہونا 'نامردی' اور کمزوری کی علامت ہے۔ مگر اس کے برعکس، رسول اللہ ﷺ نے اس کی بالکل مختلف تصویر کشی فرمائی ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ کی آغوشِ مبارک میں آپ کی صاحبزادی کے لختِ جگر کو دیا گیا جس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں، تو آپ ﷺ کی چشمِ مبارک سے آنسوؤں کا دریا بہہ نکلا۔ آپ کے جلیل القدر صحابی حضرت سعد بن عبادہؓ نے یہ دیکھ کر عرض کیا: "یا رسول اللہ! یہ کیا ہے؟" (یعنی کیا آپ بھی رو رہے ہیں؟)۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "یہ وہ رحمت و شفقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں ودیعت فرمائی ہے۔ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے انہی پر رحم فرماتا ہے جو خود دوسروں پر رحم کرنے والے ہوتے ہیں۔" [صحیح البخاری]

مگر آج ایک مرد سے نہ صرف یہ چاہا جاتا ہے کہ وہ غم کے جذبات کو چھپا کر رکھے، بلکہ اسے بچپن ہی سے یہ گھٹی پلائی جاتی ہے کہ کسی بھی قسم کے دلی جذبات کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کے مبارک عہد میں بھی کچھ ایسے لوگ موجود تھے جن کا یہی گمان تھا۔ ایک مرتبہ ایک دیہاتی (الاقرع بن حابس) کی موجودگی میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے نواسے کی پیشانی پر پیار سے بوسہ دیا۔ اس پر اس بدوی نے حیرت سے کہا: "میرے دس بچے ہیں، میں نے تو ان میں سے کبھی کسی کو نہیں چوما!" رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف نگاہ فرمائی اور ارشاد فرمایا: "جو رحم نہیں کرتا، اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا۔" [صحیح البخاری] بلکہ محبت اور الفت کے اظہار کے معاملے میں تو نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات نہایت واضح اور روشن تھیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جب کوئی شخص اپنے کسی دینی بھائی سے محبت رکھے، تو اسے چاہیے کہ وہ اسے بتا دے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔" [سنن ابی داؤد]

رسول اللہ ﷺ اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ بھی بے پناہ محبت، انس اور دلداری کا برتاؤ فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے کھانے سے اسی وقت لطف اندوز ہوتے جب عائشہؓ آپ کے پہلو میں تشریف فرما ہوتیں۔ وہ دونوں ایک ہی برتن یا پیالے سے پانی پیتے، اور آپ ﷺ خاص نگاہ فرماتے کہ عائشہؓ نے پیالے کے کس کنارے پر اپنے لب رکھے ہیں تاکہ آپ ﷺ بھی اپنا دہنِ مبارک عین اسی جگہ رکھ کر پانی نوش فرمائیں۔ عائشہؓ ہڈی سے گوشت چباتی تو آپ ﷺ اسی ہڈی کو لیتے اور اپنا دہنِ مبارک عین اسی جگہ رکھتے جہاں سے عائشہؓ نے کھایا تھا۔ [صحیح مسلم]

اس کے علاوہ، مردانگی سے جڑے ایک اور خود ساختہ مغالطے کے بالکل برعکس، نبی اکرم ﷺ گھر کے کام کاج میں بھی ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "رسول اللہ ﷺ خود اپنے کپڑوں کو پیوند لگاتے، اپنی بکری کا دودھ دوہتے، اور گھر کے کاموں میں اپنے اہلِ خانہ کا ہاتھ بٹاتے تھے۔" [صحیح البخاری و مسلم]

مگر مرد کے بارے میں پائے جانے والے عام ترین فریبوں میں شاید سب سے بڑا فریب یہ نظریہ ہے کہ ایک مرد کو لازماً 'سخت، روکھا اور درشت خو' ہونا چاہیے۔ نرمی و ملائمت کو عموماً صرف ایک زنانہ صفت سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ سرورِ کائنات حضرت محمد ﷺ کا فرمانِ عالیشان ہے: "بے شک اللہ نرمی فرمانے والا

ہے اور وہ نرمی کو پسند فرماتا ہے۔ اور وہ نرمی پر وہ کچھ عطا فرماتا ہے جو سختی پر عطا نہیں کرتا، اور نہ ہی کسی دوسری صفت پر عطا فرماتا ہے۔" [صحیح مسلم] ایک اور حدیثِ مبارکہ میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص نرمی اور ملائمت سے محروم کر دیا گیا، وہ درحقیقت تمام تر بھلائی سے محروم کر دیا گیا۔" [صحیح مسلم]

مگر افسوس کہ مردانگی کی ہماری جدید تعریف میں سے یہ سارا لطف، حلم اور نرمی ناپید ہو چکی ہے۔ یہ امر کس قدر دہلا دینے والا ہے کہ ایک لڑکا سڑک پر چلتی کسی عورت کو ہراساں کرنے اور چھیڑنے کو تو فخر سے 'مردانگی' سمجھے، لیکن جب کسی مظلوم لڑکی کو سرِ عام مارا پیٹا جا رہا ہو تو وہ بے حس تماشائی بن کر کھڑا رہے اور اس کی غیرت و مردانگی پر کوئی آنچ نہ آئے! یہ صورتِ حال آپ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ کہیں 'مردانگی' کا ہمارا یہ خود ساختہ تصور ہمارے پیارے نبی، رحمتِ عالم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے بجائے کسی ہالی ووڈ کے گینگسٹر اور بدمعاش سے تو مشابہ نہیں ہو گیا؟!

topqna.com

SECTION 6 • حصہ ششم

امتِ مسلمہ

UMMAH



سابقے اور لاحقے ہٹا دو

Drop the Prefix

"آپ کس قسم کے مسلمان ہیں؟" یہ سوال بظاہر عجیب اور نامانوس معلوم ہوتا ہے، مگر ان قوتوں کے لیے جو اسلام کو تقسیم کر کے اس پر تسلط جمانا چاہتی ہیں (Divide and Conquer کرنا چاہتی ہیں)، اس کا جواب روز بروز غیر معمولی اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ تشویشناک اور روح فرسا وہ فکری لیبل اور القاب ہیں جو ہم خود اپنے اوپر چسپاں کر لیتے ہیں۔ ہمارے خاندانی دائروں میں ہم میں سے شاذ و نادر ہی کوئی ایسا ہوگا جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس کا اپنے بہن بھائیوں سے کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ لیکن جب خاندان کا کوئی فرد کوئی غلطی کر بیٹھتا ہے—خواہ وہ کتنی ہی بڑی غلطی کیوں نہ ہو—یا وہ کوئی ایسا نظریہ رکھتا ہے جس سے ہم متفق نہیں ہوتے، تو ہم میں سے شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس بنیاد پر اپنے پورے خاندان سے قطع تعلق کر لے، ناطہ توڑ لے اور اپنا خاندانی نام ہی بدل ڈالے۔ مگر آج، ہماری وسیع تر مسلم فیملی اور ملتِ اسلامیہ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہو چکا ہے۔ آج ہم محض 'مسلمان' نہیں رہے۔ اب ہم 'ترقی پسند' (Progressives)، 'اسلامسٹس' (Islamists)، 'روایت پسند' (Traditionalists)، 'سلفی' (Salafis)، 'مقامی باشندے' (Indigenous) اور 'مہاجرین' (Immigrants) بن چکے ہیں۔ اور ہر گروہ دوسرے گروہ سے اس قدر یگانہ اور دور ہو چکا ہے کہ ہم شاید یہ بات ہی بھول چکے ہیں کہ ہم سب کا کلمہ، دین اور عقیدہ ایک ہی ہے!

اگرچہ ہماری امت کے اندر فکری اور فقہی اختلافات کی ایک حقیقی تاریخ موجود ہے، لیکن موجودہ دور میں کچھ بہت ہی سنگین خرابی پیدا ہو چکی ہے۔ اسلام کے دائرے کے اندر اختلافات نہ صرف یہ کہ برداشت کیے جاتے تھے—بلکہ انہیں اللہ کی رحمت کے طور پر قبول کیا جاتا تھا۔ لیکن جیسے ہی ہم اپنے سے اختلاف رکھنے والے ہر شخص پر کوئی نہ کوئی ٹھپہ (لیبل) لگا دیتے ہیں اور اسے دیوار سے لگا کر دائرے سے خارج کرنے لگتے ہیں، وہیں سے ہمارا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ جب ہم ان القاب و خطابات کو تسلیم کر کے انہیں اپنی بنیادی

شناخت کا ماخذ بنا لیتے ہیں، تو اس کا نتیجہ تباہ کن نکلتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم اپنی الگ الگ چھاؤنیاں قائم کر لیتے ہیں، صرف اپنی ہی مخصوص محفلوں اور کانفرنسوں میں شرکت کرتے ہیں؛ اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ہم صرف انہی لوگوں سے ہم کلام ہوتے ہیں جو ہماری ہی رائے سے اتفاق کرتے ہوں۔ یوں امت کے اندر باہمی مکالمہ دم توڑ دیتا ہے، ہمارے اختلافات سنگین خلیج اور انتہاؤں میں بدل جاتے ہیں، اور ہماری سوچ شدت پسندی کی نذر ہو جاتی ہے۔ زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ ہم دنیا بھر میں بسنے والے مسلمانوں کے دوسرے گروہوں کے دکھ درد اور احوال سے بالکل بے نیاز ہو جاتے ہیں، گویا ہم اس اکائی اور جسدِ واحد کے اعضاء کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے کاٹ کر پھینک رہے ہوں جس کے بارے میں ہمارے پیارے نبی ﷺ نے سکھایا تھا کہ ہم سب ایک جسم کی مانند ہیں۔ وہ 'دوسرا گروہ' (جو بہرحال ہمارا دینی بھائی ہی ہے) ہمارے لیے اتنا اجنبی اور مبغوض بن جاتا ہے کہ ہم ایک ہی خاندانی نام (مسلمان) سے پکارے جانے تک سے کترانے لگتے ہیں، اور حتیٰ کہ ان کے خلاف اپنے دشمنوں کی صفوں میں جا کھڑے ہوتے ہیں! دیکھتے ہی دیکھتے وہ اختلافات، جو کبھی باعثِ رحمت تھے، اب ایک عذاب اور اسلام کو شکست دینے کا مہلک ترین ہتھیار بن جاتے ہیں۔ ہمارے دشمن "ایک دوسرے کو ہم پر ٹوٹ پڑنے کے لیے یوں دعوت دیتے ہیں جیسے کھانے والے دسترخوان پر دوسروں کو اپنے پیالے کی طرف بلاتے ہیں۔" [سنن ابی داؤد]

18 مارچ 2004ء کو امریکا کے بااثر تھنک ٹینک 'رینڈ کارپوریشن' (RAND) نے ایک رپورٹ جاری کی جس کا بظاہر مقصد اسلام کو اس کے اصل نقوش مٹا کر اور مغربی سیکولرازم کے سانچے میں ڈھال کر 'مہذب' بنانا تھا۔ اس رپورٹ میں، جس کا عنوان تھا: "سول ڈیموکریٹک اسلام: شراکت دار، وسائل اور حکمتِ عملیاں" (Civil Democratic Islam: Partners, Resources, Strategies)، مصنفہ چیرل بینارڈ (Cheryl Benard) لکھتی ہیں: "مغرب کے حق میں جو چیز کارگر ثابت ہوئی وہ جدیدیت پسندی (Modernism) تھی، نہ کہ روایتی قدامت پسندی۔ اور اس میں یہ ناگزیر ضرورت شامل تھی کہ اصل مذہبی عقائد و احکام سے انحراف کیا جائے، ان میں من مانی تبدیلیاں کی جائیں، اور ان کے بنیادی اجزاء کو دانستہ نظر انداز کر دیا جائے۔" اسلام کے احکام و عقائد سے "انحراف کرنے، ان میں تحریف کرنے، اور دانستہ نظر انداز کرنے" کے لیے بینارڈ ایک نہایت سادہ نسخہ اور حکمتِ عملی تجویز کرتی ہیں: القاب چسپاں کرو، تقسیم کرو، اور تسلط جماؤ (Label, Divide, Control)! مسلمانوں کے ہر طبقے پر ایک الگ لیبل لگانے کے بعد وہ یہ مشورہ دیتی ہیں کہ

ان گروہوں کو ایک دوسرے کے مدِ مقابل لا کھڑا کیا جائے۔ دیگر چالوں کے ساتھ ساتھ، بینارڈیہ تجویز کرتی ہیں کہ "روایت پسندوں اور بنیاد پرستوں کے درمیان اختلافات کو خوب ہوا دی جائے"، اور "روایت پسندوں اور بنیاد پرستوں کے درمیان کسی بھی قسم کے اتحاد اور ہم آہنگی کی حوصلہ شکنی کی جائے۔"

اس تفرقے اور تقسیم کاری میں کامیابی پا کر اور نام نہاد 'جدیدیت پسند' و 'ترقی پسند' مسلمانوں کی پشت پناہی کر کے، بینارڈ ایک ایسا خود ساختہ 'سول جمہوری' اسلام ایجاد کرنے کی متمنی ہیں جو ان کے زعم میں کم پسماندہ اور کم انتشار انگیز ہو۔ اور زیادہ واضح الفاظ میں، ان کی دلی تمنا ایک ایسا اسلام تراشنا ہے جو نو قدامت پسند (Neo-Conservative) مغربی ایجنڈے کی بالا دستی اور استعمار کے آگے مکمل طور پر ہتھیار ڈال دے۔ پس اگر اسلام کا چہرہ مسخ کرنے کا پہلا مرحلہ انھی خود ساختہ القاب و خطابات سے فائدہ اٹھانا ہے، تو آئیے ہم ان کے منہ پر کہہ دیں: "بہت شکریہ، مگر ہمیں آپ کی اس سازش کی کوئی ضرورت نہیں!" اللہ تعالیٰ ہم سے ارشاد فرماتا ہے: "اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو۔" (سورۃ آل عمران: 103) چنانچہ، اگرچہ ہمیں اور ہمارے دین کو 'مہذب' بنانے کی اس مغربی مہم پر ہم ان کی عنایت کے شکر گزار ہیں—مگر ہم اس پیشکش کو یکسر مسترد کرتے ہیں۔ اصلاح صرف اس شے کی کی جاتی ہے جو بگڑ چکی ہو یا ازکارِ رفتہ ہو چکی ہو۔ اور مرمت اسی چیز کی درکار ہوتی ہے جو ٹوٹ چکی ہو!

اور اگرچہ یہ آپ کا بڑا کرم ہے کہ آپ ہمیں 'جدید' یا 'معتدل' کہنا چاہتے ہیں، لیکن ہم ان غیر ضروری اور کھوکھلے القاب کے بغیر ہی بخوبی جی سکتے ہیں۔ اسلام اپنی اصل تعریف اور روح کے اعتبار سے ہی سراپا اعتدال ہے، چنانچہ ہم اس کے بنیادی اصولوں پر جتنی سختی سے کاربند رہیں گے—اتنے ہی زیادہ سچے معتدل بنیں گے۔ اور اسلام اپنی فطرت میں لازوال اور آفاقی ہے، لہٰذا اگر ہم سچے مسلمان ہیں—تو ہم ہر دور میں جدید اور تازہ دم ہی رہیں گے۔ ہم نہ تو نام نہاد 'ترقی پسند' ہیں اور نہ ہی 'قدامت پسند'۔ ہم نہ 'جدید سلفی' ہیں اور نہ ہی 'اسلامسٹس'۔ ہم نہ 'روایت پسند' ہیں اور نہ ہی 'وہابی'۔ ہم نہ 'مہاجر' ہیں اور نہ ہی 'مقامی'۔ آپ کی عنایت کا شکریہ، مگر ہمیں آپ کے تراشے ہوئے کسی سابقے یا لاحقے کی قطعاً کوئی حاجت نہیں۔ ہم بس مسلمان ہیں!

مسلمان بنو، مگر صرف نام نہاد اعتدال کے ساتھ!

Be Muslim, But Only in Moderation

سال 2004ء کے اپنے پہلے صدارتی مباحثے میں، سینیٹر جان کیری نے شام کا آغاز اس وقت کے مقبول ترین سیاسی راگ سے کیا۔ اپنے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے، کیری نے یہ وضاحت کی کہ امریکہ کو نام نہاد "بنیاد پرست اسلامی مسلمانوں" (Radical Islamic Muslims) کو تنہا اور بے اثر کرنے کی ضرورت ہے: "دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے میرے پاس ایک بہتر منصوبہ ہے... جس کا آغاز یوں ہوگا کہ بنیاد پرست اسلامی مسلمانوں کو تنہا کر دیا جائے، نہ کہ وہ خود ریاستہائے متحدہ امریکہ کو تنہا کر سکیں۔" پہلی نگاہ میں، یہ جملہ بے معنی تکرار بلکہ جہالت پر مبنی معلوم ہوتا تھا۔ ایک مسلمان، اپنی تعریف ہی کے رو سے، دینِ اسلام کا پیروکار ہوتا ہے، اور یوں وہ از خود "اسلامی" ہوتا ہے۔ "اسلامی مسلمان" کہنا بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی کہے: "امریکی امریکی"! تو کیا کیری محض الفاظ کی تکرار کر رہے تھے؟ یا شاید ان کا یہ بیان اس سے کہیں زیادہ پردہ چاک کر رہا تھا جتنا خود انہیں بھی ادراک تھا؟ کیا واقعی تمام مسلمان "اسلامی" ہوتے ہیں؟ سچ بات تو یہ ہے کہ—نہیں۔ کم از کم ان کی نظر میں جو 'اچھے مسلمان' ہیں، وہ تو ہرگز اسلامی نہیں!

دن بہ دن پس پردہ یہ مفروضہ جڑ پکڑتا جا رہا ہے کہ اصل مسئلہ خود اسلام ہی ہے۔ اگر اسلام، بحیثیتِ دین، اپنی اصل میں ہی 'بنیاد پرست اور انتہا پسند' ہے، تو کوئی چیز جتنی کم "اسلامی" ہوگی اتنی ہی بہتر سمجھی جائے گی۔ اور یوں ایک 'معتدل مسلمان'—وہ لقب جس کے پانے کے لیے لوگ بے چین رہتے ہیں—دراصل وہ شخص ہے جو برائے نام ہی مسلمان ہے اور اسی لیے وہ بس برائے نام ہی برا ہے۔ یہ بات کہنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی سیاہ فام سے کہا جائے کہ تم صرف 'برائے نام سیاہ فام' بنو تاکہ تم زیادہ پرتشدد نہ ہو سکو! اس کے برعکس، جو مسلمان بہت زیادہ "اسلامی" ہوگا وہ خود بخود ان کی نظر میں "بنیاد پرست" ٹھہرے گا—یعنی ایک "بنیاد پرست اسلامی مسلمان"—جس سے نمٹنا (اور اسے تنہا و بے اثر کرنا) از بس ضروری ہے۔

درحقیقت، مونا میفیلڈ (Mona Mayfield) ان خود ساختہ اصولوں کو خوب سمجھتی تھیں جب وہ اپنے شوہر کا دفاع کر رہی تھیں—جن پر اسپین بم دھماکوں میں ملوث ہونے کا جھوٹا الزام لگایا گیا تھا۔ مونا میفیلڈ نے ایسوسی ایٹڈ پریس کے سامنے اپنے شوہر کے قبولِ اسلام کے بارے میں صفائی پیش کرتے ہوئے کہا: "ہمارے گھر میں بائبل موجود ہے۔ وہ کوئی بنیاد پرست نہیں ہے—اس نے تو بس اسے ایک مختلف اور منفرد چیز سمجھا تھا۔" اپنے شوہر کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے، میفیلڈ نے اسلام کے ساتھ اس کی وابستگی اور پابندی کو کم سے کم تر کر کے دکھانے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے شوہر کے قبولِ اسلام کے فیصلے کی تاویلیں گھڑنے کی ضرورت محسوس کی—گویا اسلام قبول کرنا ہی اس کا اصل جرم تھا! مسجد کے منتظم شہریار احمد نے بھی میفیلڈ کے دفاع میں یہی انداز اپنایا۔ احمد نے صحافیوں سے کہا: "وہ ایک معتدل انسان سمجھے جاتے تھے۔ میفیلڈ جمعہ کی نماز کے لیے بس اس رسم کی ادائیگی کی خاطر حاضر ہوتے تھے کہ جوتے اتاریں، اپنے ننگے پاؤں دھوئیں اور خطبہ سننے کے لیے قالین پر بیٹھ جائیں۔ وہ بعض متقی اور پابندِ شریعت مسلمانوں کی طرح مسجد میں پانچ وقت نماز نہیں پڑھتے تھے۔" یہاں واضح مفہوم یہی نکلتا ہے کہ برینڈن میفیلڈ کا گناہ گار یا بے گناہ ہونا کسی نہ کسی طرح اس بات سے وابستہ تھا کہ وہ مسجد میں کتنی بار نماز پڑھنے آیا کرتے تھے! احمد نے تو یہاں تک دعویٰ کر دیا کہ: "اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو بس یہی کہ وہ دینداری کے معاملے میں کم ہی جھکاؤ رکھتے تھے۔"

ایک 'قابلِ قبول' مسلمان کیسا ہونا چاہیے، اس کے ایسے 'بے دین' یا 'کم مذہب' نمونے مغربی میڈیا پر ہر طرف بکھرے پڑے دکھائی دیتے ہیں۔ ارشاد مانجی، میڈیا انٹرپرینیور اور کتاب 'دی ٹربل وِد اسلام' (The Trouble with Islam) کی مصنفہ، انھی سب سے زیادہ سراہے جانے والے نمونوں میں سے ایک ہیں۔ مانجی کی تحریریں کثرت سے شائع کی جاتی ہیں اور وہ تمام بڑے میڈیا چینلز پر نمودار ہوتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ انہیں جرات مندی کے اعتراف میں اوپرا ونفری کا 'چھوتزپاہ ایوارڈ' (Chutzpah Award) بھی دیا گیا۔ اگرچہ مانجی خود کو "مسلم باغی / انکاری" (Muslim refusenik) کہتی ہیں، مگر میڈیا انہیں ایک مثالی "عمل کرنے والی مسلمان" کے طور پر پیش کرتا ہے۔ امریکی ادارے برائے امن (USIP) کے بورڈ ممبر ڈینیل پائپس انہیں ایک "بہادر، معتدل، اور جدید مسلمان" قرار دیتے ہیں۔ لیکن ستم ظریفی دیکھیے کہ مانجی کے افکار کا اسلام سے اتنا بھی تعلق نہیں جتنا ڈینیل پائپس کی سوچ کا امن سے ہے! واشنگٹن پوسٹ کے ایک مضمون میں نماز—جو

اسلامی عقیدے کا بنیادی ستون ہے—کے متعلق مانجی کے نام نہاد 'انکشافِ ذات' کا احوال یوں بیان کیا گیا ہے: "اس کے بجائے، اس نے کہا، اس نے اپنے طریقے سے تنہا عبادت کرنا شروع کر دی۔ اپنے پاؤں، بازو اور چہرہ دھونے کے بعد، وہ مخملی قالین پر بیٹھ جاتی اور مکہ کی سمت رخ کر لیتی۔ رفتہ رفتہ اس نے یہ بھی چھوڑ دیا، کیونکہ وہ 'اندھی اطاعت اور روایتی تابعداری کے گڑھے میں گرنا' نہیں چاہتی تھی۔"

دنیا بھر کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے اس عمل کے بارے میں مانجی اپنی جو بھی رائے رکھنا چاہیں رکھیں، انہیں اس کا اختیار ہے۔ وہ اسلام کے ان تمام یا کسی بھی شعائر کو چھوڑنے میں بھی آزاد ہیں۔ لیکن مانجی کو محض ایک ایسی غیر اہم عورت کے طور پر پیش نہیں کیا جاتا جس نے نماز نہ پڑھنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ بلکہ اپنے دین کے بنیادی ارکان کو چھوڑنے کے اس کے ذاتی فیصلے کو—جب تک کہ وہ دین اسلام ہے—آزادی کی ایک عظیم جنگ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے! ظلم و جبر کے خلاف ایک معرکہ بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ وہ 'بہادر' اور 'جری' قرار پاتی ہیں، اور ان تمام مسلمانوں کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ بنا دی جاتی ہیں جو 'بہت زیادہ اسلامی' نہیں بننا چاہتے۔ ایسے کردار کو ایک مثالی نمونہ بنانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی سے کہا جائے کہ وہ 'بہت زیادہ سیاہ فام' یا 'بہت زیادہ یہودی' نہ بنے، گویا یہ شناختیں اپنی اصل میں ہی بری یا پرتشدد ہوں اور جو شخص محض 'برائے نام سیاہ فام' یا 'برائے نام یہودی' رہنے کی جدوجہد کرے وہ کوئی مجاہدِ آزادی ہو! مثال کے طور پر، مانجی نے واشنگٹن پوسٹ کو بتایا: "تشدد تو بہرحال ہونا ہی ہے، تو پھر آزادی کی خاطر یہ خطرہ کیوں نہ مول لے لیا جائے؟" جی ہاں! آزادی واقعی بہت خوب ہے۔ مانجی نے شاید اسے زیادہ چرب زبانی سے کہا ہو۔ کیری نے اسے زیادہ باریک بینی اور سفارت کاری سے ادا کیا ہو۔ مگر کیلیفورنیا کے امپیریل ویلی کالج کے بزنس مینجمنٹ کے ایک پروفیسر نے اس سچائی کو زیادہ برملائی سے بے نقاب کر دیا: "نام نہاد اسلامی دہشت گردی کو ختم کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ خود دینِ اسلام ہی کا خاتمہ کر دیا جائے۔" مگر آپ اسے خواہ کسی بھی پیرائے میں بیان کریں، ایک بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے: آج کے دور میں جب بات اسلام کی آتی ہے —تو جتنا کم ہو اتنا ہی بہتر سمجھا جاتا ہے!

ناقابلِ بیان سانحات اور ہماری امت کی حالتِ زار

Unspeakable Tragedy and The Condition of our Ummah

میرا گمان ہے کہ انسانی ذہن میں ایک ایسا گوشہ ہوتا ہے جہاں ہم اس وقت جا چھپتے ہیں جب کہیں اور پناہ لی کوئی جگہ باقی نہ بچے۔ اور شاید انسانی دل کا بھی ایک ایسا حصہ ہوتا ہے جہاں ہم ناقابلِ تصور سانحات اور دکھوں کو عمر بھر بار بار جیتے ہیں۔ تاہم، آج شام اور فلسطین کے مظلوم عوام کے لیے، وہ المیہ محض ذہن یا دل کی کوئی فرضی تصویر نہیں ہے؛ بلکہ وہی واحد تلخ حقیقت ہے جس میں وہ سانس لے رہے ہیں۔ جب میں بے بسی کی تصویر بنی ان سرزمینوں میں بہنے والے خون اور بربریت کے مناظر دیکھتی ہوں، تو میں بھی خود کو اس الجھن میں پاتی ہوں کہ اب کہاں جاؤں۔ میں اپنے ذہن کے اندر کسی ایسے گوشے کی تلاش کرتی ہوں، جہاں میں ان بے معنی سانحات کا کوئی مفہوم تلاش کر سکوں اور خود کو یہ فریب دے سکوں کہ یہ سب کچھ حقیقت میں رونما نہیں ہو رہا۔ میں رنج، غصے اور شدید یاسیت (ڈپریشن) کے درمیان جھولتی رہتی ہوں، لیکن انجام کار میں ایک ہی تپتے ہوئے، پیہم سوال کی طرف لوٹ آتی ہوں: آخر کیوں؟ ہمارے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ ہم پوری دنیا میں کیوں اس قدر ستم رسیدہ اور خوار ہیں؟ ہم اس ظلم کے طوفان کو روکنے میں اس قدر بے بس اور لاچار کیوں ہیں؟ ہم اس ملک میں، جس کے ہم باقاعدہ شہری ہیں، سیاسی طور پر اتنے بے وزن اور بے اثر کیوں ہیں؟ ہم اپنے پورے گلے کے زور سے چیختے ہیں، خطوط لکھتے ہیں اور وائٹ ہاؤس کے نمائندوں کو فون کرتے ہیں، مگر جواب میں ان کی زبانوں پر محض وہی پرانا بے شرم راگ جاری رہتا ہے کہ: ”اسرائیل کو اپنے دفاع کا پورا حق حاصل ہے؟“ ہم آخر اس پستی اور زوال کے موڑ پر کیسے آن پہنچے؟ آخر کیوں؟ ہمیں یہ سوال پوچھنا ہی ہوگا کہ آخر کیوں!

ہمیں ایک لمحے کو تھم کر سنجیدگی سے یہ جائزہ لینا ہوگا کہ بحیثیتِ امتِ مسلمہ آج ہم کس مقام پر کھڑے ہیں اور ہم کیا بن چکے ہیں۔ کبھی ایک وہ دور تھا جب دنیا بھر میں مسلمانوں کا نام عزت و وقار سے لیا جاتا تھا، ایک ایسا وقت جب دوست ہم سے محبت کرتے تھے اور دشمن ہماری ہیبت سے کانپتے تھے۔ مگر آج ہم دنیا

میں سب سے زیادہ مظلوم، نشانۂ ستم، بدنام اور نفرت کا شکار گروہ بن چکے ہیں۔ گیلپ (Gallup) کے ایک حالیہ سروے میں، نصف سے زائد امریکیوں نے اعتراف کیا کہ اسلام کے بارے میں ان کی رائے "زیادہ سازگار نہیں" یا "قطعی طور پر ناموافق" ہے، اور 43 فیصد نے اعتراف کیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف اپنے دلوں میں کم از کم "تھوڑا بہت" تعصب ضرور رکھتے ہیں—اور یہ شرح عیسائیوں، یہودیوں یا بدھ مت کے ماننے والوں کے مقابلے میں دوگنی سے بھی زیادہ ہے۔ تاہم بات صرف ہم سے نفرت کیے جانے تک محدود نہیں ہے۔ دنیا کے بے شمار خطوں میں ہمیں تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، ہمارے گلے کاٹے جا رہے ہیں، اور ہماری املاک و گھر بار لوٹے جا رہے ہیں۔ اور جہاں ہم پر جسمانی حملے نہیں ہو رہے، وہاں ہمیں بنیادی حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے، ہم پر جھوٹے الزامات تھوپے جا رہے ہیں اور بے گناہ قید و بند کی صعوبتوں میں جھونکا جا رہا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف نفرت کی جڑیں اس قدر گہری ہو چکی ہیں کہ اسلام مخالف پروپیگنڈا ایک ایسا مقبول تعصب بن چکا ہے جسے کھلے عام گوارا کیا جاتا ہے۔ یہ تعصب اس قدر عام ہو چکا ہے کہ اب سیاست دان اپنے سیاسی قد کاٹھ کو بڑھانے اور الیکشن جیتنے کے لیے اسے کھلے عام استعمال کرتے ہیں۔

یہ حالتِ زار جس میں آج بحیثیتِ امت ہم مبتلا ہیں، چودہ سو سال سے بھی پہلے رسول اللہ ﷺ نے پوری تفصیل کے ساتھ بیان فرما دی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) سے ارشاد فرمایا: "عنقریب قومیں تمہارے خلاف ایک دوسرے کو (ٹوٹ پڑنے کے لیے) یوں بلائیں گی جیسے کھانے والے کھانے کے پیالے (دسترخوان) پر ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔" کسی نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! کیا اس وقت ہماری تعداد کی کمی کے باعث ایسا ہوگا؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں! بلکہ تم اس دن تعداد میں بہت زیادہ ہوگے، لیکن تم سیلاب کے جھاگ اور کوڑے کرکٹ کی طرح (بے وزن اور بے وقعت) ہوگے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے سینوں سے تمہاری ہیبت و رعب نکال لے گا اور تمہارے دلوں میں 'وَہَن' ڈال دے گا۔" کسی نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! 'وَہَن' کیا ہے؟" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "دنیا کی محبت اور موت کی ناپسندیدگی (خوف)۔" [صحیح حدیث: سنن ابی داؤد و مسند احمد]

عین اسی طرح جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی، آج تمام باطل قوتیں فی الواقع ہم پر ٹوٹ پڑنے کے لیے ایک دوسرے کو ایسے ہی پکار رہی ہیں جیسے بھوکے دسترخوان پر دست درازی کے لیے ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔ اس حدیثِ مبارکہ میں، نبی اکرم ﷺ نے ہماری حالت کی تشبیہ پانی کے اوپر تیرنے والے جھاگ سے بھی دی ہے۔ اگر آپ سمندر کے تھپیڑے کھاتی لہروں کا مشاہدہ کریں، تو آپ دیکھیں گے کہ پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی جھاگ کی وہ پتلی تہہ مکمل طور پر بے وزن اور بے وقعت ہوتی ہے جس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا؛ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی اسے نیست و نابود کر دیتا ہے۔ اس میں اتنی طاقت اور سکت بھی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے بہاؤ کی سمت خود طے کر سکے۔ اس کے بجائے، پانی کی موجیں اسے جدھر چاہتی ہیں بہا لے جاتی ہیں۔ یہی ہماری حالتِ زار ہے، جیسا کہ حضورِ اکرم ﷺ نے نقشہ کھینچا تھا۔ تاہم، ہمیں ایک بار پھر اس سوال کی طرف لوٹنا ہوگا کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ رسول اللہ ﷺ نے اس سوال کا دو ٹوک اور روشن جواب عنایت فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ دلوں میں 'وَہَن' بھر دیا جائے گا۔ جب اس لفظ کا مفہوم دریافت کیا گیا، تو نبی کریم ﷺ نے چند ایسے کلمات میں جواب دیا جو اپنے اندر معانی کا ایک بحرِ ناپیدا کنار رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہن: "دنیا کی محبت اور موت کا خوف (ناپسندیدگی) ہے۔" رسول اللہ ﷺ یہاں ایک ایسی قوم کا احوال بیان فرما رہے ہیں جو اس مادی دنیا کی زندگی میں اس قدر غرق ہو چکی ہے کہ اس نے انہیں خود غرض، مادہ پرست، کوتاہ بین، اور اپنے رب کی بارگاہ میں پیشی اور ملاقات سے قطعی غافل کر دیا ہے۔ آپ ﷺ ایک ایسی قوم کا نقشہ کھینچ رہے ہیں جو دنیا پرستی کی دلدل میں اس حد تک دھنس چکی ہے کہ اس نے اپنا اعلیٰ اخلاقی کردار ہی گنوا دیا ہے۔

اسی اخلاقی اور باطنی کردار کے دائرے میں کسی بھی قوم کے حالات میں تبدیلی واقع ہوتی ہے—خواہ وہ اچھائی سے برائی کی طرف ہو یا برائی سے اچھائی کی جانب۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا دو ٹوک فرمان ہے: "بے شک اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے اندر کی حالت کو نہ بدل ڈالیں۔" (سورۃ الرعد: 11) لہٰذا، یہ انسانوں کے باطنی کردار ہی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ کسی قوم کی حالت دنیا کی سپر پاور اور عالمی قیادت سے گر کر سمندر کی جھاگ کی مانند بے وزن ہو جاتی ہے۔ اور صرف دلوں کی حالت اور کردار کی کایا پلٹنے ہی سے وہ قوم، جو کبھی سمندر کی بے بس جھاگ بن چکی تھی، ایک بار پھر ایک ناقابلِ تسخیر اور طاقتور قوت بن کر ابھر سکتی ہے۔

چنانچہ، بحیثیتِ مسلمان ہمیں کبھی بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ کے سچے دین کے لیے اس کی نصرت، فتح اور غلبے کا وعدہ اٹل ہے۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ کیا آپ اور میں اس نصرت اور فتح کا حصہ بنیں گے یا نہیں؟ اللہ سبحانہ و تعالیٰ قرآنِ مجید میں ہمیں اس حقیقت کی یاد دہانی کراتے ہوئے فرماتا ہے: "اور تم نہ سست پڑو اور نہ غمگین ہو، اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔" (سورۃ آل عمران: 139) صرف ہمارے سچے اور پختہ ایمان اور ہماری مخلصانہ جدوجہد ہی کی برکت سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہماری حالت کو بدلے گا۔ پس ان مظلوموں کی خاطر جو آج شام، فلسطین اور دنیا کے چپے چپے پر اپنے لہو میں نہا رہے ہیں، ہمیں بحیثیتِ امتِ مسلمہ خوابِ غفلت سے بیدار ہونا ہوگا اور اپنے رب کی طرف سچے دل سے رجوع کرنا ہوگا!

topqna.com

آج کے دور میں بحیرہ قلزم کا شق ہونا: مصر پر ایک نگاہ

Today's Opening of the Red Sea: Reflections on Egypt

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بحیرہ قلزم (بحرِ احمر) کے ساحل پر کھڑے تھے، تو ان کے عقب سے ایک جابر سرکش (فرعون) اور اس کا لشکرِ جرار سر پر پہنچ چکا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہیوں میں تذبذب اور اختلاف کی دراڑیں پڑنے لگیں۔ آگے دیکھتے ہوئے ان لوگوں کو سوائے اپنی یقینی شکست اور ہلاکت کے کچھ نظر نہ آیا: "پھر جب دونوں لشکروں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا، تو موسیٰ کے ساتھی پکار اٹھے: یقیناً ہم تو پکڑ لیے گئے!" (سورۃ الشعراء: 61)

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نگاہیں مختلف تھیں۔ ان کی آنکھیں بصیرت کی وہ روحانی آنکھیں تھیں جو ظاہری دنیاوی مصائب اور شکست کے ملمع اور فریب کے پار دیکھ سکتی تھیں۔ انہوں نے حقیقت کا مشاہدہ کیا۔ ایک ایسے قلب کے ساتھ جو خدائے برتر سے پیوستہ تھا، اسی بظاہر ناممکن اور لاچار کر دینے والی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے، موسیٰ علیہ السلام کو صرف اور صرف اللہ ہی دکھائی دے رہا تھا: "موسیٰ نے فرمایا: ہرگز نہیں! یقیناً میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا!" (سورۃ الشعراء: 62)

اور فی الواقع اللہ تعالیٰ نے بالکل وہی کر دکھایا: "پھر ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے عصا کو سمندر پر مارو۔ پس وہ سمندر شق ہو گیا اور اس کا ہر ایک ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی مانند ہو گیا۔ اور ہم نے دوسرے گروہ (فرعونیوں) کو بھی وہاں قریب لا کھڑا کیا۔ اور ہم نے موسیٰ اور ان کے تمام ساتھ والوں کو نجات عطا فرمائی؛ پھر دوسروں کو غرق کر دیا۔" (سورۃ الشعراء: 63-66)

آج مصر میں، ہم بھی ایک بحیرہ قلزم کے سامنے کھڑے ہیں۔ آج مصر میں، ایک جابر اور اس کی فوج ہماری پشت پر کھڑی ہے۔ آج کچھ ایسے لوگ ہیں جنہیں محض شکست ہی شکست دکھائی دے رہی ہے۔ تاہم، کچھ دوسری آنکھیں ایسی بھی ہیں جو اس بند گلی اور رکاوٹوں کے پار سے نکلنے والے راستے اور اس کے پیچھے چھپی امید کی کرن کو دیکھ رہی ہیں۔ آج مصر میں کچھ ایسے نفوسِ قدسیہ ہیں جو—پیچھے جابر اور اس کی

سنگینیں ہونے کے باوجود—پکار رہے ہیں: "یقیناً میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا!"

کوئی شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ تاریخ کے اتنے نازک موڑ پر ہم ایک قدیم قصہ کیوں دہرا رہے ہیں؟ ہزاروں سال پرانا واقعہ بھلا آج کے دور میں کیا اہمیت رکھتا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ محض کوئی فرضی کہانی نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ محض کوئی پرانا قصہ ہے۔ بلکہ یہ تو تمام زمانوں کے لیے ایک ابدی نشانی اور درسِ عبرت ہے! اگلی ہی آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "بے شک اس واقعے میں ایک بڑی نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں تھے۔" (سورۃ الشعراء: 67) یہ اللہ تعالیٰ کی برحق ہستی اور اس دنیا کے باطنی اسرار کی ایک عظیم نشانی ہے۔ یہ اس حقیقت کی گواہی ہے کہ ظلم و جبر کو کبھی دوام اور فتح حاصل نہیں ہوتی، اور تمام تر رکاوٹیں محض سراب اور فریبِ نظر ہیں جنہیں ہمیں آزمانے، ہماری تربیت کرنے اور ہمیں کندن بنانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ مگر سب سے بڑھ کر یہ اس امر کی نشانی ہے کہ حقیقی کامیابی کس سرچشمے سے پھوٹتی ہے۔ اور یہ اس کا عملی مشاہدہ ہے کہ تمام تر بظاہر نامساعد حالات کے باوجود—ایک ایسے لمحے میں جب ہم خود کو چاروں طرف سے محصور، شکستہ دل اور بے بس خیال کرتے ہیں—کامیابی کیسی دکھائی دیتی ہے!

کچھ لوگ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ اگر ہم واقعی حق اور اللہ کے راستے پر ہیں، تو فتح و نصرت اتنی آسانی سے نصیب کیوں نہیں ہو جاتی؟ کچھ لوگ سوچتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حق پر قائم رہنے والوں کو بغیر کسی سخت جدوجہد، قربانی اور آزمائش کے بس یوں ہی فتح کیوں نہ عطا فرما دی؟ اس سوال کا جواب بھی خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں عطا فرمایا ہے۔ وہ ارشاد فرماتا ہے: "اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا مگر یہ کہ ہم نے وہاں کے لوگوں کو تنگی اور تکلیف (تکالیف و مصائب) میں مبتلا کیا تاکہ وہ عاجزی و زاری کریں (اور تضرع کی کیفیت کو پہنچیں)۔" (سورۃ الاعراف: 94)

یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ سختیوں اور مصائب کا مقصد 'تضرع' کے مرتبے تک پہنچنا ہے۔ تضرع اللہ کے حضور انتہائی عاجزی اور انکساری کا نام ہے—مگر یہ محض عام عاجزی نہیں ہے۔ تضرع کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے ذرا تصور کیجیے کہ آپ ایک بے کراں سمندر کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی کشتی میں بالکل تنہا ہیں۔ تصور کیجیے کہ اچانک ایک ہولناک طوفان اٹھتا ہے اور بلند و بالا لہریں پہاڑوں کی صورت آپ کو چاروں

طرف سے گھیر لیتی ہیں۔ اب تصور کیجیے کہ اس نازک لمحے میں آپ اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس کی نصرت کے طالب ہوتے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ اس وقت آپ پر احتیاج، ہیبت، بے بسی اور مطلق عاجزی و گریہ و زاری کی کیا کیفیت طاری ہوگی؟ بس اسی کیفیت کا نام 'تضرع' ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ آزمائش کے حالات اس لیے پیدا فرماتا ہے تاکہ ہمیں اس قیمتی تحفے سے نواز سکے۔ اللہ کو ہمارے لیے مشکلات پیدا کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ وہ تو ایسے حالات اس لیے پیدا فرماتا ہے تاکہ ہم اس کے قرب کے اس خاص مقام کو پا سکیں جسے ان کے بغیر حاصل کرنا ہمارے لیے شاید ممکن نہ ہوتا۔ عاجزی، قربِ الٰہی اور صرف اور صرف اللہ پر مکمل انحصار کی وہ انمول کیفیت وہی نعمت ہے جس سے آج مصر کے غیور عوام کو نوازا گیا ہے۔ اللہ اکبر—اللہ سب سے بڑا ہے! لیکن اللہ تعالیٰ ان مصائب اور آزمائشوں کا ایک اور مقصد بھی بیان فرماتا ہے، ارشاد ہوتا ہے: "اور ہم نے ان کو زمین میں مختلف گروہوں میں بانٹ دیا۔ ان میں سے کچھ نیکوکار تھے اور کچھ اس کے سوا۔ اور ہم نے انہیں خوشحالی اور تنگ دستی دونوں کے ذریعے آزمایا تاکہ وہ (ہماری طرف) رجوع کریں۔" (سورۃ الاعراف: 168)

سورۃ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ ہمیں آگاہ فرماتا ہے: "اگر تمہیں کوئی زخم پہنچا ہے تو (یاد رکھو کہ) ان لوگوں کو بھی ایسا ہی زخم لگ چکا ہے۔ اور یہ تو وہ دن ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں، تاکہ اللہ سچے ایمان والوں کو جان لے اور تم میں سے بعض کو شہادت کے درجے پر فائز کرے۔ اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا۔ اور اس لیے بھی کہ اللہ ایمان والوں کو خوب نکھار کر پاکیزہ بنا دے اور منکرینِ حق کا زور توڑ ڈالے۔ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے جہاد (جدوجہد) کرنے والوں کو آزمایا نہیں اور نہ ہی ثابت قدم رہنے والوں کو پرکھا ہے؟" (سورۃ آل عمران: 140-142)

یہاں اللہ تعالیٰ نے آزمائش اور سختی کا مقصد 'تمحیص' بیان فرمایا ہے۔ 'تمحیص' دراصل وہ لفظ ہے جو سونے کو آگ میں تپا کر خالص اور کھرا کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ آگ میں تپائے بغیر، سونا بلاشبہ ایک قیمتی دھات تو ہوتا ہے—مگر وہ کھوٹ اور میل کچیل سے بھرا ہوتا ہے۔ تمحیص کے عمل، یعنی بھٹی میں تپانے کے ذریعے سونے سے تمام کھوٹ کو الگ کر کے اسے خالص بنا دیا جاتا ہے۔ یہی عمل اللہ تعالیٰ مومنوں کے

ساتھ فرماتا ہے۔ مصائب اور کٹھن حالات کی بھٹی سے گزار کر، اہل ایمان کو کندن کی طرح پاک و صاف کر دیا جاتا ہے۔ اور بالکل اسی طرح، آج مصر کے باسیوں کو بھی تپا کر کندن بنایا جا رہا ہے۔ اس عوامی بیداری اور انقلاب سے چند دن قبل تک، دنیا مصری نوجوانوں سے بالکل ناامید ہو چکی تھی اور انہیں ایک ضائع شدہ نسل سمجھ بیٹھی تھی۔ ہم یہ گمان کرتے تھے کہ وہ اپنی منزل اور مقصدِ حیات کھو چکے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ انہوں نے اپنی زندگیوں کو سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے، لڑکیوں پر نازیبا فقرے کسنے، یا انٹرنیٹ کیفوں میں حقے کے کش لگانے تک محدود کر لیا ہے۔ مگر اس سخت آزمائش کے ذریعے، مصر کے مردہ دل نوجوانوں میں نئی روح پھونک دی گئی ہے! آج وہی نوجوان سڑکوں پر استبداد اور جبر کو للکارتے ہوئے سینہ سپر ہیں، نمازوں میں سجدہ ریز ہیں، اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اپنے رب کو پکار رہے ہیں۔ وہی نوجوان جو چند روز قبل نماز کے قریب بھی نہ پھٹکتے تھے، آج اپنے خالق کے آگے سر بسجود ہونے کے لیے فوجی ٹینکوں کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں! اس انقلاب سے چند دن پہلے، مصری مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان کشیدگی اپنی تاریخ کی بدترین سطح کو چھو رہی تھی۔ لیکن آج عیسائی اور مسلمان ایک دوسرے کے تحفظ اور اپنے وطن کے دفاع کے لیے شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔ وہی لوگ جو اس بھٹی میں 'تپائے جانے' سے ایک دن پہلے ایک دوسرے پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہ تھے، آج بہن بھائیوں کی طرح، ایک وجود کی مانند متحد ہو کر اپنی گلیوں، اپنے گھروں اور اپنے محلوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اور اسی آزمائش کے طفیل، وہ نوجوان جو چند دن پہلے محض اپنے موبائل فون، شیشہ اور سگریٹ کی خاطر جی رہا تھا، آج اپنی قوم کو آزادی دلانے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے پر آمادہ ہو چکا ہے!

اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں فرماتا ہے: "آپ کہیے: وہ کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یا وہ کون ہے جو کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے؟ اور وہ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ اور وہ کون ہے جو تمام کائنات کے امور کی تدبیر و انتظام فرماتا ہے؟ وہ فوراً بول اٹھیں گے کہ: 'اللہ!' پس آپ کہیے: 'تو کیا پھر بھی تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے؟'" (سورۃ یونس: 31)

وہ صرف اللہ ہی کی ذات ہے جو مردہ سے زندہ کو برآمد فرماتی ہے۔ اس نے ہمیں موت کی وادی سے نکال کر نئی زندگی بخشی ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی یہ گمان مت کیجیے کہ اس واقعے کی ایک گھڑی بھی کسی عظیم

مقصد کے بغیر گزر رہی ہے—یہ ایک انتہائی گہرا، پر حکمت، حسین اور زنجیریں کاٹ دینے والا الٰہی مقصد ہے۔ دہائیوں سے مصر کے عوام خوف کے سائے میں جیتے آئے تھے۔ لیکن جب آپ خوف کو اپنے اوپر حاوی ہونے دیتے ہیں، تو آپ غلام بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مصر کے غیور عوام کو اپنے سب سے بڑے خوف کا سامنا کروا کر—اور اس پر فتح یاب کر کے—اس ذہنی غلامی سے نجات دلا دی ہے۔ اللہ نے مصری قوم کو یہ حوصلہ بخش کر آزاد کر دیا ہے کہ وہ اپنے ظالم و جابر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے اور پوری دنیا کو للکار کر کہہ سکیں کہ اب وہ کبھی خوف کے سائے میں سانس نہیں لیں گے! چنانچہ اب حسنی مبارک اقتدار میں رہے یا رخصت ہو جائے، جیتا رہے یا مر جائے—اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مصر کے عوام تو پہلے ہی آزاد ہو چکے ہیں! وہ واقعی آزاد ہو چکے ہیں!

حسنی مبارک کی کوئی حقیقت نہیں رہی۔ وہ محض ایک مہرہ اور آلہ ہے—ایک ایسا آلہ جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ مصری عوام اور پوری امتِ مسلمہ کے لیے اپنی تدبیر اور منصوبے کو عملی جامہ پہنا رہا ہے۔ ایک ایسا ذریعہ جس سے وہ مصری قوم اور پوری امت کو تپا کر پاکیزہ بنانے، حسن بخشنے اور سچی آزادی سے ہمکنار کرنے کا اپنا فیصلہ نافذ فرما رہا ہے۔ اور ہم آج مصر میں موجود ہیں یا نہیں، یہ غیر اہم ہے۔ مصر تو ہمارے جسدِ ملی کا محض ایک عضو ہے۔ مصر کی تطہیر و تزکیہ دراصل ہماری پوری امت کے جسم کی تطہیر ہے۔ یہ آپ کی اور میری باطنی تطہیر ہے۔ یہ ہمارے لیے سنہری موقع ہے کہ ہم خود اپنے آپ سے سوال کریں کہ ہمارے دل کس چیز سے وابستہ ہیں؟ ہم کس چیز سے لرزتے ہیں؟ ہماری دوڑ دھوپ کس مقصد کے لیے ہے؟ ہم کن اصولوں کے لیے سینہ سپر ہیں؟ اور ہم آخر کدھر جا رہے ہیں؟ جب کوئی جسم گہری نیند—بلکہ کوما—میں پڑا ہو، تو یہ صرف اللہ کی بے پایاں رحمت ہی ہوتی ہے کہ وہ ہمیں بیدار کرنے کے لیے جھنجھوڑنے والی گھنٹی بجا دیتا ہے۔ یہ محض اس کی بیکراں رحمت کا فیضان ہے کہ وہ وہاں زندگی بخش دیتا ہے جہاں کبھی موت کا راج تھا۔ ہم غفلت کی نیند سو رہے تھے، اس لیے اس نے ہمارے پاس ایک نشانی بھیجی۔ ہم بے خبر تھے، تو اس نے ہمیں جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا۔ ہم اس دنیاوی حیات کو پوج رہے تھے اور اس پاکیزہ روح کی آزادی کے مقابلے میں مادی مال و متاع کو ترجیح دے رہے تھے جو صرف اور صرف اپنے رب سے لو لگائے اور اس کے سوا کسی کا خوف نہ رکھے—چنانچہ اس نے ہمیں آزادی کا پروانہ عطا فرما دیا!

کتنے ایسے خوش نصیب انسان ہوں گے جو اپنی زندگی میں ایسے تاریخ ساز معجزات کا مشاہدہ کر سکیں گے؟ کتنے لوگ اپنی آنکھوں سے سمندر کو شق ہوتے ہوئے اور ایک سرکش فرعون کو ذلیل و رسوا ہوتے دیکھ پائیں گے؟ کیا ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہیے کہ ہمیں یہ سب کچھ دکھانے کے لیے کیوں چنا گیا؟ کیا ہمیں خود سے نہیں پوچھنا چاہیے کہ ہم سے کیا سبق سیکھنے، کیا تبدیلی لانے اور اپنی زندگیوں کو کس طرح بدلنے کا تقاضا کیا گیا ہے؟ کیونکہ اگر ہم ایک لمحے کے لیے بھی یہ سوچتے ہیں کہ یہ سب کچھ صرف اہلِ مصر کا معاملہ ہے، تو ہم اس کی اصل روح اور پیغام کو سمجھنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ ہم سوئے ہوئے تھے، اور اللہ نے ہمیں بیدار کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ ہم مردہ تھے اور اللہ ہمیں نئی زندگی عطا کرنا چاہتا ہے! ہمیں یہ سوچنے کا عادی بنا دیا گیا تھا کہ ہمارا دشمن ہمارے وجود سے باہر بیٹھا ہے۔ یہ کہ اسے ہم پر کوئی حقیقی طاقت حاصل ہے۔ یہ بھی ایک فریبِ نظر اور سراب ہے۔ اصل دشمن تو ہمارے اپنے باطن کے اندر بیٹھا ہے! تمام بیرونی دشمن درحقیقت ہماری اپنی اندرونی روحانی بیماریوں کا ہی ظاہری عکس ہیں۔ چنانچہ اگر ہم ان بیرونی دشمنوں کو شکست دینا چاہتے ہیں، تو ہمیں سب سے پہلے اپنے اندر کے دشمن کو زیر کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم ہمیں آگاہ فرماتا ہے: "بے شک اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ پہلے اپنے اندر کی کیفیت کو خود نہ بدل ڈالیں۔" (سورۃ الرعد: 11)

ہمیں سب سے پہلے اپنے دل سے لالچ، خود غرضی، شرک، اللہ کے سوا کسی اور سے آخری درجے کا خوف، محبت، امید اور غیر اللہ پر تکیے کے بتوں کو پاش پاش کرنا ہوگا۔ ہمیں حبِ دنیا کو فتح کرنا ہوگا—جو ہماری تمام باطنی بیماریوں اور تمام تر مظلومیت کی جڑ ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنی زندگی کے خارجی فرعونوں کو شکست دے سکیں، ہمیں اپنے اندر بیٹھے ہوئے فرعونِ نفس کو پچھاڑنا ہوگا! پس مصر کے میدانوں میں لڑی جانے والی جنگ حریت کی جنگ ہے۔ بالکل بجا! لیکن کس چیز سے حریت؟ حقیقی معنوں میں مقہور اور مجبور کون ہے؟ کیا آپ اور میں فی الواقع آزاد ہیں؟ اصل اسیری اور غلامی کیا ہے؟ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس سوال کا نہایت بصیرت افروز جواب دیا ہے، وہ فرماتے ہیں: "حقیقی قیدی وہ ہے جس کا دل اپنے رب کی یاد اور معرفت سے قید ہو چکا ہو، اور اصل اسیر اور غلام وہ ہے جسے اس کی نفسانی خواہشات نے اپنا قیدی بنا رکھا ہو!" (ابن القیم، الوابل الصیب) جب آپ اندر سے آزاد ہو جاتے ہیں، تو آپ کسی کو بھی اپنی آزادی چھیننے کی اجازت نہیں دیتے۔ اور جب آپ کے پاس یہ باطنی حریت آجاتی ہے، تو آپ ان جابروں، فرعونوں

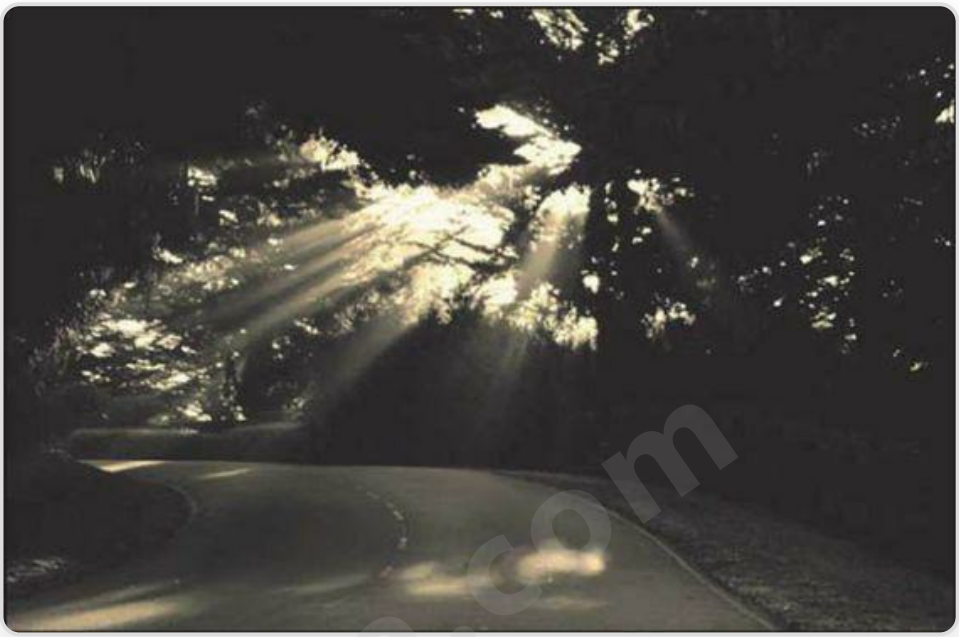
اور غنڈوں کے پار ان کے مالک و رب کو دیکھنے لگتے ہیں۔ جب آپ اندر سے آزاد ہوتے ہیں، تو آپ کو کوئی غلام بنا ہی نہیں سکتا؛ کیونکہ آپ کسی انسان کو صرف اسی وقت غلام بنا سکتے ہیں جب وہ دنیاوی چیزوں کی محبت میں گرفتار ہو۔ آپ صرف اسی شخص کو ڈرا دھمکا سکتے ہیں جو کسی نقصان سے خوفزدہ ہو۔ آپ کا کسی انسان پر زور صرف اسی وقت چلتا ہے جب وہ کسی ایسی چیز کا محتاج یا متمنی ہو جسے چھیننے کی طاقت آپ کے پاس ہو۔ لیکن کائنات میں صرف ایک ہی ہستی ایسی ہے جسے کوئی انسان آپ سے چھیننے کی ذرہ برابر بھی طاقت نہیں رکھتا: اور وہ ہے آپ کا اللہ!

اور اسی لیے جب ہم مصر کی آزادی کی جدوجہد کرتے ہیں، تو ایک کہیں زیادہ وسیع اور حقیقی پیمانے پر یہ دراصل خود اپنے آپ کو آزاد کرانے کی جنگ ہے۔ یہ اپنے ہی نفس کی سرکشی اور خواہشات کی غلامی کے استبداد سے نجات پانے کی جنگ ہے۔ یہ اپنے باطل دنیاوی سہاروں اور دلی وابستگیوں، ہر اس چیز کے تسلط سے جس نے ہمیں جکڑ رکھا ہے، اور ہر اس جھوٹے معبود سے نجات کی جنگ ہے جس کی ہم اللہ کو چھوڑ کر بندگی کر رہے ہیں۔ یہ خود اپنی غلامی کی زنجیریں کاٹنے کی جنگ ہے۔ خواہ ہم امریکی ڈالر کے غلام ہوں، اپنی نفسانی خواہشات کے اسیر ہوں، جاہ و منصب کے پجاری ہوں، دولت کے بندے ہوں یا خوف کے ماتحت —مصر کی بھٹی میں ہونے والی تطہیر دراصل ہم سب کے دلوں کا تزکیہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں حقیقی اور ابدی کامیابی کا جو نسخۂ کیمیا ہمیں عطا کیا گیا ہے وہ دو بنیادی ارکان پر مشتمل ہے: صبر (استقامت و پامردی) اور تقویٰ (صرف اور صرف اللہ کا خوف اور پرہیزگاری): "اے ایمان والو! صبر کرو، اور مقابلے میں استقامت دکھاؤ، اور مورچوں پر ڈٹے رہو، اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم فلاح و کامیابی پا جاؤ۔" (سورۃ آل عمران: 200) چنانچہ، اگر آج ہم مصر کو محض ایک ایسا تماشا سمجھ کر دیکھ رہے ہیں جو ہمارے وجود سے باہر کہیں رونما ہو رہا ہے، اور اس دوران اپنے باطن کی صفائی نہیں کرتے، اپنے گریبانوں میں نہیں جھانکتے، اور اپنی زندگیوں میں کوئی سچی تبدیلی برپا نہیں کرتے—تو ہم نے اس عظیم معجزے کے اصل مقصد ہی کو گنوا دیا ہے۔ کیونکہ بہرحال، ایسا ہر روز تو نہیں ہوتا کہ ہماری اپنی آنکھوں کے سامنے بحرِ احمر شق ہو جائے!

SECTION 7 • حصہ ہفتم

شاعری و مناجات

POETRY



topqna.com

تمہارے نام خط

A Letter to You

اس آزادی کی کیفیت کو بیان کرنا کتنا کٹھن ہے؛ یہ اس قدر عمیق اور اس قدر سچی اور حقیقی ہے۔ ساری الجھنوں، خالی ڈبوں اور کھوکھلی تمثالوں کے پار جب میں نے دیکھا، تو مجھے تمہارا چہرہ نظر آیا—اے دنیا! تم میری آنکھوں پر پردے پر پردہ ڈالتی گئیں۔ تم نے چاہا کہ مجھے جیت لو، مجھے فریب دو، اور اپنے جھوٹ کی زنجیروں میں جکڑ کر مجھے اپنا غلام بنا لو۔

حالانکہ سچائی تو یہ ہے کہ جب میں سوالی بن کر تمہارے در پر کھڑی تھی، تم مجھے پانی کا ایک قطرہ تک نہ دے سکیں۔ میں تمہارے سامنے گھٹنوں کے بل گری تھی، اس آس میں تڑپتی ہوئی کہ تم میرے باطن کے خلا کو بھر دو گی۔

مگر اب جو کچھ میری نگاہوں کے سامنے ہے، وہ بصیرت و سچائی کی ایک ایسی روشن جھلک ہے جسے مسلسل مایوسیوں اور محرومیوں کی ضرب ہی تراش سکتی تھی۔ اور اب میں یہاں بیٹھی ہوں، تمہارے کارندوں کے بیچ گھری ہوئی، ان جھوٹوں کے لشکر کے درمیان جو مجھے بیڑیوں میں جکڑے رکھنے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ لیکن اب میں مزید تمہاری قیدی نہیں رہوں گی۔ اب میں وہ معصوم نادان بچی نہیں رہی جو راتوں کو جاگ کر تمہارے خواب بنتی تھی۔ اب میں وہ شکستہ دل بچی نہیں رہی جو تم پر اپنے آنسو بہا کر ضائع کرے۔ میری یک طرفہ محبت اب مجھے توڑ نہیں سکتی۔ تم مجھے نہیں توڑ سکتیں! میں تمہاری جھوٹی چمک دمک اور دلفریب وعدوں کے آگے سر نہیں جھکاؤں گی۔ میں تمہارے جھوٹے تخت کے سامنے دست بستہ کھڑی رہنے والی کوئی وفادار رعایا نہیں ہوں۔ میرے آنسو اب تمہاری جاگیر نہیں رہے۔ اور میرا دل اب تمہارا مسکن و آستانہ نہیں رہا۔

اب تم یہاں نہیں رہ سکتیں !

یہاں تک پہنچنے کے لیے میں نے ایک طویل اور کٹھن مسافت طے کی ہے۔ کبھی راستے میں ایسے تپتے صحرا آئے جہاں مجھے محض پانی کی ایک بوند درکار تھی جو تم نہ دے سکیں۔ کبھی ایسے خوفناک طوفان آئے جہاں مجھے اپنی راہ کی رہنمائی کے لیے بس روشنی کی ایک مدہم سی کرن چاہیے تھی۔ اور میں بار بار تم سے وہی مانگتی رہی جو تمہارے بس میں تھا ہی نہیں۔ کیونکہ تمہارے پاس تو محض خود نمائی، تفاخر اور دھوکے کا سامان (متاعِ غرور) ہی تو تھا۔ اور یوں میں بار بار خود کو تشنہ لب صحراؤں میں بے آب، اور تاریکیوں میں بے نور پاتی رہی۔ لیکن اب میں تمہاری غلام نہیں رہی ! کیونکہ ایک مردِ کامل (محمد مصطفیٰ ﷺ) تشریف لائے تاکہ مجھے اس دلدل سے رہائی بخشیں۔ ایک ایسے ہادیِ برحق جو مجھے بندوں کی بندگی سے آزاد کر کے، بندوں کے رب کی غلامی و بندگی کی معراج تک لے آئے !

topqna.com

میں سوگوار ہوں

I Grieve

میں نے اپنا سر اٹھایا

ایک بار پھر،

صرف یہ دیکھنے کے لیے

کہ سورج ڈوب چکا تھا،

درخت محوِ خواب ہو چکے تھے،

اور وہ سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے...

میں سوگوار ہوں۔

وہ آسمان جو کبھی بالکل شفاف تھا

اب دھند کی چادر میں لپٹا ہے۔

مجھے اپنا راستہ اب سجھائی نہیں دیتا۔

کوشش بھی کیوں کروں... جب چار سو بس یاسیت کا دھندلکا ہے؟

میں سوگوار ہوں۔

آج میں ماتم کناں ہوں

اس پر جو کھو چکا ہے۔

میرے بھولے بسرے لوگ،

جو بہار کی رت میں بھی
برف کے کسی بت کے آگے گھٹنے ٹیکے بیٹھے ہیں...

میں سوگوار ہوں۔

وہ بھول چکے ہیں اس دعا کو
اور اس ذات کو جس کو انہیں پکارنا چاہیے تھا۔
روحِ حقیقی کی جگہ
بے جان رسوم اور کھوکھلی علامتوں نے لے لی ہے۔
ان کے دل... تھک چکے ہیں،
بیزار اور نڈھال ہو چکے ہیں...

میں سوگوار ہوں۔

ہم ایسی قوم ہیں
جو شکست خوردہ تو ہوئی... مگر کبھی مسخر نہیں ہوئی۔
اور کسی نہ کسی طرح
میں اپنے لہو کی حرارت کو لوٹتے ہوئے محسوس کرتی ہوں۔
میں کھڑی ہوں گی!
میں جدوجہد کروں گی!
اور اپنے غم کی وسعتوں کے پار،
میں دیکھوں گی...
کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں تم کبھی غلام نہیں بنا سکتے۔

ایک ایسی وفاداری... جسے کبھی خریدا نہیں جا سکتا۔

کیونکہ زمین پر تو قبضہ کیا جا سکتا ہے...

مگر روح کو کبھی قید نہیں کیا جا سکتا !

اپنے آنسوؤں کے پار

میں یہ راز پا لوں گی...

آج میرے لوگ رو رہے ہیں،

مگر کل... موت خود فنا ہو جائے گی،

جب ان کے یہی آنسو ایک ایسی سرزمین کو جنم دیں گے

جہاں... "نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے"۔ (القرآن، ۲:۲۶۲)

topqna.com

بس چند احساسات و خیالات

Just My Thoughts

آج دل پر ایک عجیب سا ملال چھایا ہے۔ یہ وہ اداسی نہیں جو آپ کو اندر سے ویران، تنہا، یا تشنہ لب چھوڑ جاتی ہے۔ یہ ایک پرسکون اور ٹھہری ہوئی اداسی ہے؛ وہ اداسی جو فہم و شعور کی ایک خاص منزل اور رضا و تسلیم کے مقام سے جنم لیتی ہے۔

آج میں نے ایک تصویر دیکھی، اور جب بھی میری نظر اس پر پڑی، میری آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ وہ ساحلِ سمندر پر غروبِ آفتاب کا ایک دلکش منظر تھا۔ بے حد سحر انگیز! اور اس کے اوپر یہ آیت لکھی تھی:

'رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ' (اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد اور رائیگاں پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے!)۔

اور اصل بات بس یہی تو ہے۔ یہ سب کچھ—یہ اداسی، یہ حادثات، یہ مسکراہٹیں، یہ سکون، یہ درد، یہ محبت، یہ محرومیاں، اور یہ قربانیاں: ان میں سے کچھ بھی رائیگاں نہیں۔ کچھ بھی بے مقصد نہیں۔ یہ کوئی غلطی نہیں، نہ کوئی بھول چوک ہے، اور نہ ہی محض حوادث کا کوئی بے سمت بہاؤ!

میں نے اس تصویر کو دیکھا اور اچانک میرا وجود ایک گہری گمشدہ یاد (nostalgia) کے احساس سے بھر گیا۔ ایک ایسے زمانے کی یاد، جس کی بظاہر میرے حافظے میں کوئی تصویر محفوظ نہیں۔

"اور (یاد کیجیے) جب آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا اور خود ان کو ان کی جانوں پر گواہ بنایا کہ: 'کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟' سب نے کہا: 'کیوں نہیں! ہم گواہی دیتے ہیں'—کہیں قیامت کے دن تم یہ نہ کہو کہ: 'ہم تو اس بات سے بالکل بے خبر تھے'۔" (القرآن، ۷:۱۷۲)

مجھ پر کسی اپنے کو یاد کرنے اور اس کی کمی شدت سے محسوس کرنے کا غلبہ چھا گیا۔ اس ذاتِ پاک کی یاد... اس کے قرب کی تڑپ... ایک ایسے زمانے کی یاد جو بیت چکا ہے یا جو آنے والا ہے۔ ایک ایسا لمحہ جس کا وقوع پذیر ہونا اس قدر یقینی ہے گویا وہ پہلے ہی گزر چکا ہو۔ اسی لیے تو جب اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں آخرت کا تذکرہ فرماتا ہے، تو اکثر صیغۂ ماضی استعمال کرتا ہے۔

جب آپ کو کسی شاہکار فن پارے سے محبت ہو جائے، تو آپ اس کے مصور سے ملنے کے لیے بے چین و بے تاب ہو جاتے ہیں۔ میں بحر الکاہل کے غروبِ آفتاب، سمندر پر طلوع ہوتے چودھویں کے چاند، ہوائی جہاز کی کھڑکی سے نظر آتے بادلوں کے غول، رالی (Raleigh) کے خزاں رسیدہ جنگلوں، اور موسم کی پہلی برف باری کی نگارگاہوں کی ایک ادنیٰ طالبہ ہوں۔

اور میں اس کائنات کے مصورِ اعظم سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہوں۔

"اس روز بہت سے چہرے شاداب و تر و تازہ ہوں گے، اپنے رب کی طرف تک رہے ہوں گے!"
(القرآن، ۷۵:۲۲-۲۳)

topqna.com

محبت کا ایک عکس

A Reflection on Love

یہ ساری محبت... اس کا ہر ٹکڑا، ہر ذرہ... دنیا کی تمام تر محبتوں کا ہر ہر انگ !

وہ محبت جس سے شعرا نظمیں تخلیق کرتے ہیں۔

سحر طاری کر دینے والے ناولوں کی محبت۔

گیتوں میں گونجتی محبت۔

وہ محبت جسے انہوں نے فلم کے پردے پر قید کرنے کی کوشش کی۔

ماں کی اپنے بچے سے، اور بیٹی کی اپنے باپ سے محبت۔

وہ محبت جو بندھنوں سے آزاد کر دیتی ہے۔

وہ محبت جو غلام بنا لیتی ہے۔

وہ محبت جسے تم جیت لیتے ہو۔

وہ محبت جسے تم ہار جاتے ہو۔

وہ محبت جس کے پیچھے تم دوڑتے ہو۔

وہ محبت جس کے سہارے تم جیتے ہو۔

وہ محبت جس کے لیے تم جانتے ہو کہ تم جان بھی دے سکتے ہو۔

وہ محبت جو انسانوں کا خون بہا دیتی ہے۔

وہ محبت جس کی خاطر تلواریں میانوں سے نکل کر قتل و غارت کرتی رہی ہیں۔

پریوں کی کہانیوں اور الم ناک داستانوں کی محبت...

یہ سب کچھ محض ایک عکس ہے !

ایک بازگشت ہے... صرف اور صرف ایک ہی سرچشمے کی !

اس ایک واحد محبت کی، جسے تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتی ہوں؛ کیونکہ ہم اس محبت کو اس وقت بھی جانتے تھے جب ہم نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔ ہم سے محبت اس وقت کی گئی جب ہم محبت کرنے کے قابل بھی نہ تھے۔ تمہیں اس وقت عطا کیا گیا جب تم کچھ دینے یا عطا کے مفہوم سے بھی ناواقف تھے۔

یہ وہ محبت ہے جسے پہچاننے کے لیے تمہارا دل تراشا گیا تھا۔

یہ وہ محبت ہے جو ہر محبت کو تخلیق کرتی ہے اور سنبھالتی ہے۔

یہ وہ محبت ہے جو سب سے پہلے بھی موجود تھی—اور اس وقت بھی باقی رہے گی جب سب کچھ فنا ہو جائے گا۔

یہ وہی محبت ہے جو ازل میں بھی تھی... اور اس وقت بھی جاوداں رہے گی جب تمام بازگشتیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں گی !

topqna.com

آج میں نے امن کے لیے دعا کی

I Prayed for Peace Today

آج میں نے خود کو دل کے چین اور سلامتی کی دعا مانگتے پایا۔

میں ہزار بار ہوش و جنوں کی سرحدوں سے گزری ہوں،

مگر میں جانتی ہوں کہ تو نے میری پکار سن لی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ میں اس کمرے میں تنہا نہیں تھی،

خوف کے خوف سے کانپتی ہوئی،

اس دل دہلا دینے والی تنہائی میں۔

میں نے اپنے ہاتھوں کے بل، اپنے گھٹنوں کے بل تجھے پکارا،

اپنے چہرے کو زمین پر خاک آلود کرتے ہوئے۔

اگر اس سے بھی نیچے جھکنا ممکن ہوتا، تو خدا کی قسم میں اس سے بھی نیچے جھک جاتی!

کیونکہ یہی تو ہے بے بسی و لاچاری... اپنی خالص ترین صورت میں...

وہ بے بسی جو جانتی ہے کہ کچھ بھی، نہ کوئی سوکھا پتا، نہ کوئی آنسو، اور نہ کوئی مسکراہٹ

اس کی مرضی کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔

آج میں نے ایک سبق سیکھا ہے۔

ایک بار پھر۔

کہ یہ دنیا ہے۔ دنیا! یہ راحت کی جگہ نہیں، محض ایک سراب اور جھوٹی چمک دمک ہے۔

وہ جگہ جہاں سردی اور بھوک کو سہنا ہی پڑتا ہے۔

وہ جگہ جہاں تشویش اور خوف کا ڈسنا طے ہے۔

وہ جگہ جہاں فضا سرد ہو جاتی ہے،

کبھی کبھی اتنی سرد، بے رحم حد تک سرد۔

وہ جگہ جہاں تمہیں ان لوگوں کو الوداع کہنا پڑتا ہے جن سے تم محبت کرتے ہو۔

جہاں تم دل نہیں لگا سکتے، کیونکہ اگر تم دل لگا بھی لو، تو یہ وابستگی انہیں روک نہیں سکتی؛

یہ صرف اس وقت روح کو زخم دیتی ہے جب وہ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

وہ جگہ جہاں خوشی اور غم محض اداکار ہیں،

جو کسی ڈرامے میں اپنے اپنے بول بولنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں...

اور اسٹیج پر اپنی جگہ پانے کے لیے ایک دوسرے سے مسابقت کر رہے ہیں۔

وہ جگہ جہاں کششِ ثقل تمہیں زمین پر پٹخ دیتی ہے اور تمہاری کمزوری تمہیں لہولہان کر دیتی ہے۔

وہ جگہ جہاں غم موجود ہے، کیونکہ اس کا ہونا مقدر ہے۔

اور آنسو اس لیے بہتے ہیں تاکہ تمہیں اس مقام کی یاد دلائیں جہاں آنسو نہیں ہوتے۔

جہاں آنسوؤں کا وجود ہی نہیں۔

اور کیا اصل حقیقت یہی نہیں؟ کیا بالآخر جنت ہی وہ اصل مقام نہیں؟

وہ مقام جسے اللہ تعالیٰ نے بار بار، بار بار ان دو انداز میں بیان فرمایا ہے:

"نہ ان پر کوئی خوف ہوگا... اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

لیکن میں تو ابھی یہیں ہوں، ہے نا؟

میرے جسم پر موجود وہ نشان مجھے یہی یاد دلاتا ہے۔

میرے بازو کے جلنے کے اس داغ نے ایک ایسا نشان چھوڑا ہے جس سے مجھے پیار ہے۔

مجھے اس نشان سے اس لیے پیار ہے کیونکہ وہ مجھے یاد دلاتا ہے کہ میں کس قدر کمزور ہوں۔

کتنی مجبور انسان ہوں !

یہ کہ میں جل سکتی ہوں، میرا خون بہہ سکتا ہے، میں ٹوٹ سکتی ہوں، مجھ پر زخموں کے داغ سج سکتے ہیں۔

ہاں ! میں یہیں ہوں۔ یہیں میں گرتی ہوں۔ یہیں میں روتی ہوں۔

مگر یہیں، بالکل اسی طرح، تو نے اس تنہا کمرے کو اپنی رحمت سے بھر دیا،

اور مجھے عاجزی و انکسار کے اس مقام تک اٹھا لیا،

اور میری بے چارگی اور تیری بارگاہ میں میری تڑپتی ہوئی محتاجی کا شعور مجھ پر آشکار کر دیا۔

اور پھر تو نے سب کچھ سنبھال لیا۔

یقیناً تو نے ہی سنبھالا !

کیوں نہیں؟

بالکل ویسے ہی جیسے تو نے یونس، اور موسیٰ، اور ان کی والدہ کے معاملات کو سنبھال لیا تھا۔

تو ہی تو امن والوں کا اصل امن ہے !

اور توانا لوگوں کی اصل قوت !

جھوٹ کے اس تند و تیز طوفان میں سچائی کا مینارِ نور !

چنانچہ، آج میں نے خود کو دلی چین اور سلامتی کی دعا مانگتے پایا۔

زندگی کی کشمکش پر

On The Struggle of Life

آج مجھے تیرا خیال آیا

آج میں نے تجھے یاد کیا اور تیرے وہ کلمات یاد آئے جو تو نے مجھ سے فرمائے تھے،

سب سے کامل اور خوبصورت انداز میں۔

تو نے میرے دھڑکتے دل کو قرار بخشا،

اور میری سانسوں کو ہموار کر دیا۔

تو نے مجھ سے وہ الفاظ کہے اور میں اب بھی انہیں اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہوں،

وہ مجھے سنبھالتے ہیں، مجھے سرشار کرتے ہیں، میری ساری تکان مٹا دیتے ہیں؛

کیونکہ درد سے بڑھ کر، میں تھکن سے چور ہوں۔

مجھے لگتا ہے جیسے میں نے اس داستان کو ہزار برس تک جیا ہے،

اور اب میں سونے کے لیے تیار ہوں۔

میں اب سب کچھ چھوڑ دینے کے لیے تیار ہوں۔

میں تیار ہوں کہ اب یہ کہانی اپنے اختتام کو پہنچے۔

میں تیری بخشی ہوئی سلامتی اور سکون کو محسوس کرنے کے لیے تیار ہوں،

اور تیری اس آواز کو سننے کے لیے

جو مجھ سے کہہ دے کہ تیرا سفر تمام ہوا، تو جیت گئی، تو منزل پر پہنچ گئی !

مگر میں جانتی ہوں، میں اس مقام کو خوب جانتی ہوں،

میں یہاں پہلے بھی آچکی ہوں۔

میں اب سونے جا رہی ہوں،

میں سونے لگی ہوں...

خدارا کچھ مت پوچھو،

خدارا مجھ سے کچھ مت کہو،

بس مجھے سونے دو...

بس مجھے اپنے لبوں پر تیرے ہی ان کلمات کے ساتھ سونے دو:

'اے انسان! بیشک تو اپنے رب کی طرف (پہنچنے تک) مشقت پر مشقت جھیلتا ہوا کھنچا چلا جا رہا ہے...

بالآخر تو اس سے مل کر رہے گا!' (القرآن، ٨٤:٦)

topqna.com

سکوت

Stillness

صبحِ کاذب و صادق کی پو پھوٹتے وقت سورج کتنا حسین دکھائی دیتا ہے۔ اس کی کرنیں درختوں پر کچھ ایسا سحر طاری کر دیتی ہیں جو دن کے کسی اور پہر نظر نہیں آتا۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب اندر سے بس ایک ہی چیز کے آرزو مند ہیں: ایک خاموش سکون۔

شاید اس سکون کا محض ایک ہی لمحہ مل جائے، کہ ہم اپنی آنکھیں موند لیں اور بالکل پرسکون ہو جائیں۔ محض ایک سیکنڈ کے لیے ہی سہی، کہ دل کسی بات پر پریشان نہ ہو، کسی دکھ پر ملول نہ ہو۔ اس چیز کی طلب دل سے مٹ جائے جو ہمارے پاس نہیں ہے—یا جو ہمیں مل نہیں سکتی۔ بس اس لمحے میں موجود رہیں، مطمئن، پرسکون، ساکت۔ اپنے باطن کی گہرائیوں میں خاموش۔ شاید دن کے اس پہر میں سب سے دلکش بات یہی ہے: یہ گہرا سکوت!

اور یہ امید کہ شاید... شاید آج کا یہ دن کچھ مختلف ہوگا۔

topqna.com

اپنی موت سے پہلے مر جاؤ

Die Before Your Death

مجھ سے کہو کہ میں خود کو بھلا سکتی ہوں،

مجھ سے کہو کہ میں تیری بارگاہِ قدس میں خود کو فنا کر سکتی ہوں،

حقیقی بندگی و تسلیم کے اس وجد آفریں لمحے میں !

مجھ سے کہو کہ میں سدا یونہی شکستہ دل رہ سکتی ہوں:

تیرے اندر،

تیرے لیے،

تیرے ہی ساتھ !

مجھ سے کہو کہ میں ہمیشہ یہیں قیام پذیر رہ سکتی ہوں،

یہیں رہتے ہوئے بھی، سب سے دور اور بے نیاز !

کیا نبیِ کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا تھا: "اپنی موت سے پہلے مر جاؤ"؟

پہلے پہل میں نے سوچا کہ شاید یہ محض ایک یاد دہانی تھی

کہ ہم تیری ملاقات کے دن کو یاد رکھیں۔

لیکن پھر میں نے سوچا کہ کاش ! میں اپنی موت سے پہلے ہی مر سکوں:

ایک ایسی روح پا لوں جو اب اس فانی زندگی میں قید نہ رہے—اگرچہ اس کے خاکی بدن کو یہیں رہنا ہے۔

ایک ایسا دل جو دنیا کی بیڑیوں سے آزاد ہو چکا ہو—اگرچہ قدموں کو اس کی گلیوں میں چلنا ہی ہے۔

ایک ایسا نفس جو اپنے رب کی رضا پر کامل سکون اور اطمینان میں ہو—اگرچہ یہ بکھرتا ہوا مٹی کا خول ابھی باقی ہے۔

ایک ایسی روح جو وہاں پہنچ چکی ہو—اس سے پہلے کہ وہ حقیقتاً وہاں پہنچے۔

ایک ایسی روح جو ہر تعلق سے بے نیاز اور آزاد ہو چکی ہو۔

ایک "نفسِ مطمئنہ"—اپنے سچے ترین، عمیق ترین، اور حقیقی ترین مفہوم میں! (القرآن، ۸۹:۲۷)

کیونکہ جیسا کہ اس جلیل القدر عالم (ابن تیمیہؒ) نے فرمایا تھا: "جو شخص اس دنیا کی جنت (قربِ الٰہی و اطمینانِ قلب) میں داخل نہیں ہوا، وہ آخرت کی جنت میں بھی داخل نہیں ہوگا۔"

topqna.com

اے میرے رب! مجھے بچا لے

Save me

تیری بے پایاں جود و سخا کے سوا میرے پاس امید کا کوئی سہارا نہیں—
کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ میں اپنے ہاتھوں میں شکستہ ریزے تھامے تیرے در پر سوالی کھڑی ہوں... اور پھر بھی تو اپنا دروازہ کھول دیتا ہے !

مجھے اس تند و تیز طوفان سے بچا لے ! میں تیرے تمام بندوں میں سب سے زیادہ بے بس و لاچار ہوں۔ میں ایک گھنے جنگل کے بیچ راستہ تلاش کرتی ہوئی بھٹک رہی ہوں۔ مگر سارے درخت ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں، اور ہر ڈگر پلٹ کر وہیں لے آتی ہے جہاں سے سفر شروع ہوا تھا۔
اس جنگل سے نکلنے کی راہ کوئی نہیں پا سکتا—سوائے اس کے جسے تو خود نجات بخش دے۔
مجھے بچا لے—کیونکہ سچ مچ، حقیقت میں، میں خود کو تنہا نہیں بچا سکتی !

topqna.com

میرا دل ایک کھلی کتاب ہے

My Heart is an Open Book

میرا دل ایک کھلی کتاب ہے،

جس کے اوراق میری ہی داستانِ حیات نے تار تار کر دیے ہیں۔

ان سے کہہ دو کہ تم نے سبق سیکھ لیا ہے۔

تم یہ سبق ہر اس بار سیکھو گی،

جب تم کسی ادھوری اور نامکمل چیز میں اپنی تکمیل تلاش کرو گی۔

تم نے تنکوں کے بنے گھروندے میں پناہ مانگی تھی،

پھر جب تیز آندھی اور طوفان آیا،

تو تم بالکل بے یار و مددگار اور تنہا رہ گئیں۔

بے آسرا و بے نقاب!

تم نے برسوں نگلنے کی کوشش کی...

مگر وہ تو محض ہوا تھی۔

اور تم حیران ہوتی رہیں کہ اس نے تمہیں اندر سے خالی اور پیاسا کیوں چھوڑ دیا۔

انہوں نے تمہیں فریب بھری کہانیاں سنائیں

اور تم نے ان پر یقین کر لیا...

پھر تم دانتوں کی پری (Tooth Fairy) کے انتظار میں بیٹھی رہیں

کہ وہ آکر تمہارے خوابوں کی تعبیر بدل دے گی۔

اور اس کے باوجود تم کچھ بھی لٹانے کے لیے تیار تھیں

تاکہ اس جھوٹی کہانی کو سچ کر دکھاؤ۔

چھوڑ دو اسے ! دامن چھڑا لو !

ایک اس سے کہیں بہتر داستاں موجود ہے،

جو محض کوئی فسانہ نہیں،

بلکہ عینِ حقیقت ہے۔

ایک ایسی داستاں جس کا ہیرو کبھی مرتا نہیں،

نہ اس کا خون بہتا ہے، اور نہ وہ روتا ہے۔

اس حقیقی نسخے کو تلاش کرو !

اسے حفظ کر لو،

اسے اپنے دل کی تختی پر ثبت کر لو،

اور پھر...

اسے زمانے کے پڑھنے کے لیے پیش کر دو۔

کیونکہ تمہارا دل ایک کھلی کتاب ہے !

topqra.com

خنجر کا وار

The Stab

خنجر کے اس گہرے وار پر غمگین نہ ہو،

اس کا مقصد تو محض تمہیں آزاد کرنا ہے۔

ان زنجیروں سے جو تمہیں مٹی سے باندھے رکھتی ہیں،

اور ان بیڑیوں سے جو تمہیں انسانوں کے سایوں کا اسیر بنائے رکھتی ہیں۔

پانی کا سراب پیاس نہیں بجھا سکتا،

مگر تشنہ لب مسافر کو کتنا دلکش دکھائی دیتا ہے !

مجھے ڈر لگتا ہے... اس بات سے کہ شاید میں کبھی اس کے سوا کسی دوسری زندگی کو نہ جان سکوں،

ایک مختلف زندگی... بہت ہی مختلف !

اگر میں سب کچھ چھوڑ دوں، تو کیا تو مجھے بلندیوں پر اٹھا لے گا؟

غم، تڑپ، اور محرومی سے بھی بلند...

ہر اس چیز سے بالا تر جسے میں نے اب تک جانا ہے۔

مجھے بلندیوں پر لے چل ! مجھے اس خاک کے بندھنوں سے آزاد کر دے !

جیسے کوئی ویکسین (تریاق) انسان کو وقتی طور پر بیمار کرتی ہے تاکہ اسے مزید توانا بنا سکے،

یہ خنجر کا وار تو عارضی ہے... مگر اس سے ملنے والی آزادی، ابدی اور جاوداں ہے !

گوشۂ تنہائی / چراغ دان

Niche

میری ہڈیاں پگھل جانا چاہتی ہیں،
میرے پٹھے شل ہو کر ڈھے جانا چاہتے ہیں،
میرا بدن تھم جانا چاہتا ہے...
چلنے سے،
کشمکش سے،
لڑنے سے،
سانس کے لیے،
زندگی کے لیے!

میرے تخیل نے میرے لیے ایک تصویر بنائی تھی،
مگر اب وہ سیاہ و سفید بن کر رہ گئی ہے۔
درخت جھکے ہوئے ہیں، تھکے ہارے، سمٹے ہوئے۔
میرا دل بھی بالکل ویسا ہی ہے،
مگر پھر بھی، میری سوچیں بولتی جا رہی ہیں،
چلتی جا رہی ہیں،
کشمکش کرتی جا رہی ہیں،

topqna.com

لڑتی جا رہی ہیں،

سانس کے لیے،

زندگی کے لیے!

اتنی واضح تصویر کو کوئی کیسے مٹا سکتا ہے؟

جو اتنی سچی اور حقیقی تھی؟

مجھے بتاؤ کہ میں خود کو اس منظر سے کیسے مٹاؤں،

اور اپنے ان تھکے ہوئے قدموں کو کیسے چین بخشوں؟

میں دیکھ رہی ہوں

کہ میں لڑکھڑا رہی ہوں،

چل نہیں پا رہی۔

اب میں ٹھوکریں کھا رہی ہوں،

بول نہیں پا رہی۔

میرے سینے میں ایک ایسا درد پل رہا ہے،

جو خاموشی، رنج اور بے چینی سے پیدا ہوا ہے۔

میرے سوا بھلا کون ہے جو اس کا دعویٰ کرے؟

میرے سوا کون ہے جو اسے کوئی نام دے سکے؟

مجھے اپنی اس بے حسی پر ملال ہے،

صبحِ دم اپنی اس بے دلی اور نقاہت پر۔

میں اب جنگلوں میں چکر کاٹ رہی ہوں،

اپنے اس گوشۂ نور (چراغ دان) کو تلاش کرنے کی دھن میں۔

کیا مجھ پر کوئی الہام اترا ہے؟

یہ کس کی صدا ہے جو میں سن رہی ہوں؟

میری اپنی آواز تو بڑی تیز اور کان کے پردے پھاڑ دینے والی ہے۔

میرے سوا بھلا اور کون میرا نام جان سکتا ہے؟

یہ تو محض اس کی عنایت و کرم ہے

کہ دل بول اٹھتا ہے،

اس وقت بھی جب ذہن اور بدن

سن ہو چکے ہوں،

اور محض گھسٹ رہے ہوں۔

اے میرے رب! تشریف لا،

اگر صرف میری سوچوں کو خاموش کرنے کے لیے ہی سہی!

میں جنگلوں کے گرد پرواز کر رہی ہوں،

اپنے پروں کے سہارے،

اب بھی اپنے اس گوشۂ نور (چراغ دان) کی تلاش میں۔

اب میں مزید

نہیں چل رہی،

نہ کشمکش کر رہی ہوں،

نہ لڑ رہی ہوں۔

میں نے اپنی سانس جیت لی ہے،

میں نے اپنی زندگی پا لی ہے!

topqna.com

بس چلتے رہو

Keep Walking

ہر نیا دن مجھے ہماری ملاقات کے اور قریب لے آتا ہے۔

مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں ہزار برسوں سے تیری جانب

اس راہ پر گامزن ہوں...

اور پھر بھی میں ابھی وہاں نہیں پہنچی۔

اتنی قریب، اور پھر بھی ابھی اتنی دور!

مگر میں چلتی جا رہی ہوں،

ان آنسوؤں کے باوجود،

تند ہواؤں کے طوفان کے باوجود،

چھلے ہوئے گھٹنوں اور ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے باوجود،

ان نیل کے داغوں اور گہرے زخموں کے باوجود جنہوں نے مل کر اس دل کو آج یہ صورت بخشی ہے،

میں چلتی جا رہی ہوں...

تیری ہی سمت!

بس ایک ہی سمت ہے،

صرف ایک ہی رخ:

تیری ہی جانب!

تجھ ہی سے، تجھ ہی تک !

میرے پاس اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

کچھ بھی نہیں !

اور یہی میری فقیری اور ناداری ہے۔

میں چلتی جا رہی ہوں،

کیونکہ ہر سورج کے ڈوبنے کے پیچھے ایک طلوع پنہاں ہے،

ہر طوفان کے پیچھے ایک ملجا و پناہ گاہ ہے،

ہر بار گرنے کے بعد ایک بار پھر سنبھل کر اٹھ کھڑا ہونا ہے،

اور ہر بہتے آنسو کے پیچھے نگاہوں کی ایک پاکیزگی اور تطہیر ہے۔

اور جس جس جگہ تمہیں کبھی خنجر گھونپا گیا تھا، وہاں ایک شفا ہے،

اور وہاں پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط جلد کی تخلیق ہے !

میں چلتی جا رہی ہوں،

کیونکہ واللہ ! تیری رحمت کے سوا میرے پاس کوئی آسرا نہیں۔

میرے پاس تیرے وعدے کے سوا کچھ نہیں،

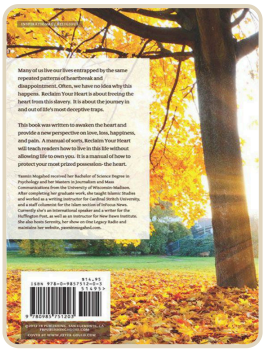
تیرے ان کلمات کے سوا،

تیرے اس سچے وعدے کے سوا:

کہ:

’اے انسان ! بیشک تو اپنے رب کی طرف (پہنچنے تک) مشقت پر مشقت جھیلتا ہوا کھنچا چلا جا رہا ہے...
بالآخر تو اس سے مل کر رہے گا !‘ (القرآن، ۸۴:٦)

topqna.com



ہم میں سے بے شمار لوگ اپنی زندگیاں ٹوٹے دلوں اور مسلسل مایوسیوں کے ایک ہی جیسے دائروں میں قید ہو کر گزار دیتے ہیں۔ اکثر ہمیں اس بات کا ادراک تک نہیں ہوتا کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ 'اپنے دل کی بازیابی' (Reclaim Your Heart) دل کو اسی غلامی سے رہائی دلانے کا نام ہے۔ یہ کتاب زندگی کے فریب ترین جالوں میں الجھنے اور پھر ان سے بحفاظت نکل آنے کے سفر کی داستان ہے۔ یہ کتاب دل کو بیدار کرنے اور محبت، محرومی، خوشی اور رنج و الم کے بارے میں ایک نیا زاویۂ نگاہ بخشنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ ایک جامع رہنما کتاب کی صورت، 'اپنے دل کی بازیابی' قارئین کو یہ سکھائے گی کہ اس فانی دنیا میں اس طرح کیسے جیا جائے کہ یہ دنیا آپ کی مالک نہ بن بیٹھے۔ یہ ایک ایسا دستور العمل ہے جو آپ کو بتاتا ہے کہ اپنے سب سے قیمتی اثاثے—یعنی اپنے دل—کی حفاظت کیسے کی جائے۔

مصنفہ یاسمین مجاہد کا تعارف:

یاسمین مجاہد نے یونیورسٹی آف وسکونسن-میڈیسن سے نفسیات (سائیکالوجی) میں بیچلرز اور صحافت و ابلاغِ عامہ میں ماسٹرز کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے کے بعد، انہوں نے اسلامیات کی تدریس کی، کارڈینل اسٹرِچ یونیورسٹی میں تحریر و نگارش کی انسٹرکٹر رہیں، اور 'ان فوکس نیوز' کے اسلام سیکشن میں باقاعدہ کالم نگار کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ موجودہ دور میں وہ ایک معروف بین الاقوامی مقررہ، ہفنگٹن پوسٹ کی مستقل مصنفہ، اور نیو ڈان انسٹی ٹیوٹ کی معلمہ ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ون لیگیسی ریڈیو پر اپنے مقبول پروگرام 'سیرینیٹی' (سکونِ قلب) کی میزبانی بھی کرتی ہیں، اور اپنی ذاتی ویب سائٹ yasminmogahed.com چلاتی ہیں۔

Author: Yasmin Mogahed • **Translator:** Huzaifa

Watermark: **topqna.com** • ISBN: **978-0-9857512-0-3**